PDFBOOKSFREE.PK

| | | |
|---|---|---|
| 7 | دشمن کی فتح | منزہ سہام |
| 9 | احوال | ناصر رضا |
| 29 | وہ درخشاں ستارہ | راجہ محمود |
| 42 | زرد پتوں کا بن | یوسف خان |
| 59 | جنونِ محبت | لائبہ مدثر شیخ |
| 74 | شہید کی ڈائری | منزہ سہام |
| 76 | حی علی الفلاح | قربان علی ایری |
| 79 | وہ اجنبی ساتھی | علی صبا |
| 83 | میں ثابت قدم رہی | شکیلہ انجم طارق |
| 87 | یقینِ کامل | فیضان حسین عثمانی |
| 90 | دیارِ سنگ | میجر (ر) امتیاز |
| 97 | اے جذبہءِ دل | صدف آصف |
| 109 | راہِ الفت | مون شاہ |
| 116 | نایاب انسان | وفا صدام حسین غازی |
| 121 | اَن کہی داستان | احمر منصور |
| 133 | لاجو دیدی | ایڈیسن ادریس مسیح |
| 140 | ہوس کے پجاری | الماس فاطمہ عابدی |
| 144 | یہ جھروکا نہ کھولیں | خلیل جبار |
| 153 | وہ عجیب قینچی | ندا ہاشمی |
| 156 | یہ گھر ہمارا ہے | فوزیہ |
| 160 | بس ایک عقیدہ | مسز ثمینہ محمد سلیم |
| 163 | خواب جو بکھر گئے | ارم زہرا |
| 173 | اک ذرا سی بھول | اقبال زمان |
| 176 | سیلانی ہے فطرت ہماری | محمد فہیم |
| 181 | زندگی لکھ رہا ہوں | انور فرہاد |
| 191 | مسئلہ یہ ہے | ادارہ |
| 198 | میری ڈائری سے | قارئین |
| 205 | خیال آرائی | قارئین |
| 209 | کتاب تبصرہ | عکاشہ سحر |
| 213 | پسند اپنی اپنی | قارئین |
| 216 | جن آنکھوں میں | فاطمہ بلگرامی |
| 232 | گھائل آتما | حنیف سحر |
| 248 | تاشون | شازلی سعید مغل |
| 258 | بازگشت | سہام مرزا |


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# دشمن کی فتح

36 فٹ لمبی وہیل کراچی کے سات مچھیروں نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر زندہ حالت میں پکڑ لی پھر اس قوی الجثہ جانور کو نیزے مارتے، بھالے گھساتے ساحل پر لے آئے اور اس پر بھی بس نہیں کیا، اس مردہ مچھلی پر 20 روپے ٹکٹ بھی لگا دیا۔ مجھے یہ خبر پڑھ کر دکھ ہوا۔ آخر ہم لوگ تماشہ بنانے میں اس قدر ماہر کیوں ہو گئے ہیں؟..... کہیں اس لیے تو خود تماشہ نہیں بن گئے؟..... بے ضرر، معصوم، قدرت کا حسین شاہکار اپنی دنیا میں مگن تھا، جاندار تھا۔ ہم نے اُس کے گھر میں گھس کر زنجیروں سے جکڑا، نیزے گھسا گھسا کر مارا اور پھر ٹانگ دیا۔ ساری دنیا کو دکھایا کہ ہم کتنے ''بہادر'' ہیں..... ذرا سوچیے.....! ''معصوم جان کو جکڑا''..... ''مارا''..... پھر ''ٹانگ دیا۔'' ہم کس طرف جا رہے ہیں؟..... یہ لمحۂ فکریہ ہے کہ کہیں ہم اپنے دشمن جیسے تو نہیں ہو گئے؟..... کہیں وہ ہم پر مکمل طور پر حاوی تو نہیں ہو گیا؟..... آپ تو جانتے ہیں کہ ہمارا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟؟

منزہ سہام



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# احوال

## اس پرچے کا مدیر قارئین کے درمیان

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے دوست قارئین کرام! زندگی، صحت، خوشی، کامیابی اور امن کی دعاؤں کے ساتھ سلامتی بھرا اسلام آپ تک پہنچے..... گزشتہ دنوں میری ملاقات اپنے ایک بزرگ دوست آغا صاحب سے ان کے گھر میں ہوئی..... زندگی کی ستر سے زیادہ خزاں اور بہاریں دیکھنے والے آغا جی نے ایک عرصہ ہوا اپنے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا ہے کہ..... گھر سے باہر موجود زندگی کے مناظر ان کی نظر پر بار ہونے لگے تھے..... بقول آغا صاحب ہم نے ''برائی کو برائی کہنا اور سمجھنا چھوڑ دیا ہے..... سو ہم تباہ اور برباد ہو رہے ہیں'' آغا جی کی اسی فکر کے حوالے سے بڑی محسن بھوپالی مرحوم کی یہ سوچ لایغیّرُ ما..... آپ کی بصارتوں کے رزق کی صورت پیش ہے..... (اور ہاں! اس ماہ چند ناگزیر وجوہات کے باعث آپ کے خطوط کے جوابات شامل ''احوال'' نہیں ہو سکے..... اس کے لیے دلی معذرت قبول کیجیے گا!)

**لایغیّرُ ما.....**

برائی سے نفرت ہی کرتا تھا پہلے
کہ اپنے بزرگوں سے میں نے یہی کچھ سنا تھا
پھر اک وقت آیا..... کہ اوروں کی خاطر،
بُری چیز کو بھی بُری چیز کہتے ہوئے
میں جھجکنے لگا!

اب بُرائی کو اچھا سمجھنے لگا ہوں
یہی ''ارتقا'' کی وہ دلدل ہے جس سے بچانا
کسی کے بھی بس میں نہیں ہے
اگر میں نہ چاہوں!

✉ ہمارے ادارے کی دیرینہ دوست اور سابقہ ایڈیٹر! فریدہ مسرور صاحبہ کراچی سے۔ ''ناصر بھائی السلام علیکم! خوش رہیے اور خوشیاں بانٹیے! ''سچی کہانیاں'' کے لیے میرا خط دیکھ کر آپ حیران تو ہو رہے ہوں گے لیکن گمان غالب یہی ہے کہ اس حیرت پر خوشی زیادہ غالب ہو رہی ہو گی۔ صورت حال یہ ہے کہ آپ کی بزم میں شامل ہونے کا ارادہ تو اکثر ہوتا رہا مگر شاید ہونے کا لمحہ آیا نہیں تھا، سو ٹلتا رہا..... مگر اب اس مہمیز کا نام بھی سن لیجیے جس نے مجھ سے یہ خط لکھوایا ہے۔ ہوا یوں کہ پچھلے تقریباً ایک سال سے میں سچی کہانیاں کا مطالعہ نہیں کر پائی تھی۔ اس کی وجوہات میں یقیناً گردش دوراں زیادہ کارفرما رہی ہے جس سے آپ بھی واقف ہو گئے ہیں۔ خیر..... اب جو دسمبر، جنوری، فروری کے شمارے ایک ساتھ دیکھے ہیں تو مجھے بہت زیادہ حیرت اور خوشی نے گھیر لیا ہے کہانیوں کا معیار پہلے سے بہت بڑھ کر ہے۔ اگر ایک طرف ایڈیسن ادریس اور صبیحہ شاہ جیسے زبردست رائٹرز کی تحریریں اس میگزین کو مزید خوب صورتی سے ہمکنار کر رہی ہیں تو دوسری طرف سلسلے وار ناول بھی سچی کہانیاں کو بام عروج تک پہنچانے کا سبب بن رہے ہیں اور آئندہ بھی بنتے رہیں گے۔ سونے پہ سہاگہ راجا محمود صاحب کا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# زبیر عباسی!

## ریت کا رزق ہوئے!!

یہ دل..... میرا دل!..... ایک بار پھر گہرے ملال سے اَٹا ہوا ہے کہ..... میرے ایک اور ہم پیشہ عزیز دوست، پیارے ساتھی زبیر عباسی نے زندگی سے منہ موڑ کر، موت سے حقیقی اور دائمی رشتہ جوڑ لیا ہے..... بھائی زبیر عباسی سے میرا تعلق بہت پرانا ہے..... یہ میری خوش نصیبی رہی ہے کہ..... مجھے اپنے اس موجودہ ادارے میں ان کے ساتھ بھی کام کرنے کا موقع ملا..... بھائی زبیر عباسی صرف ایک اچھے صحافی، کہانی کار، مترجم اور اعلیٰ ڈرامہ نویس ہی نہیں تھے..... ایک نہایت ہی ذہین اور سلجھے مزاج کے نفیس انسان بھی تھے..... ان کا تعلق ایک معروف علمی اور فنون لطیفہ سے وابستہ خاندان سے تھا..... یہی وجہ ہے کہ..... معروف ادیب و ڈراما نگار سیما غزل اور معروف و معتبر شاعرہ حجاب عباسی جیسی بہنیں، ناہید عباسی (معروف ہومیو ڈاکٹر) جیسی بیگم، شمعون عباسی، جویریا عباسی اور آج کی نوجوان نسل سے وابستہ معروف ہدایت کار اسامہ وغیرہ سوگواروں میں شامل ہیں۔

بیماری کے دوران جب میری بھائی زبیر عباسی سے آخری ملاقات ہوئی تھی اور میں نے حال پوچھا تھا..... تو وہ زندگی سے آباد ایک مسکراہٹ کے ساتھ بولے تھے.....

''میرا حال تو اچھا ہے۔ بس زندگی بے حال ہے''

اور پھر یوں ہوا کہ..... بھائی زبیر عباسی کی زندگی واقعی ''بے حال'' ہو کر ماضی کے مزار میں جا سوئی..... اور میں اب اس مزار پر کھڑا سوچ رہا ہوں!

ہاتھ سینے پہ رکھے دیکھ رہا ہوں چپ چاپ
ریت کا رزق ہوئے جاتے ہیں پیارے اپنے

ن۔ر



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قلم ہے جو سلیم ناصر، وحید مراد، پروین شاکر اور اشفاق احمد جیسی عظیم شخصیات کے بارے میں لاثانی تحریریں لکھ رہا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ اس ضمن میں راجا محمود صاحب کے ساتھ آپ بھی ستائش کے مستحق ہیں، کیونکہ بہ حیثیت سابق ایڈیٹر میں یہ بات بخوبی جانتی ہوں کہ اول تو ایسی شاندار تحریر لکھوانا اور پھر ان کو مزید نکھارنا سنوارنا، ایک ایسے جوہری کا کام ہوتا ہے جسے پرچوں کی دنیا میں ایڈیٹر کہا جاتا ہے اور کون نہیں جانتا کہ جب تک جوہری کی عرق ریزی شامل نہ ہو بیش قیمت ہیرے بھی لاکرز میں پڑے رہتے ہیں۔ برتنے کے کام نہیں آسکتے۔ سو میری طرف سے بہت بہت مبارک باد آپ کو اور آپ کی پوری ٹیم کو..... ایک بار پھر سلام اور سب کو دعا۔"

✉ عبدالعزیز جی آچکوال سے۔ "ناصر بھائی آداب کیسے ہیں آپ ناصر بھائی! سچ بتاؤں تو میں تھک گیا ہوں، ہار گیا ہوں، ٹوٹ گیا ہوں، کیا بتاؤں 2011ء جاتے جاتے دکھی کر گیا ایسی صعوبتیں جھیلی ہیں، جن کا کبھی تصور نہ کیا تھا۔ خیال آتا ہے تو آنکھیں نم اور دل اداسی کے سمندر میں ڈوبنے لگتا ہے۔ اس دنیا سے "جی" ڈر گیا ہے۔ اس ڈائن نے دل پر ایسے چرکے لگائے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے سینے میں دل نہیں صدمے دھڑکتے ہیں۔ کاش دنیا میں کوئی غم ناپنے والا آلہ ہوتا تو یقیناً آج ہم غم کی سلطنت کے راج کمار ہوتے۔ ٹھیک ایک سال بعد سچی کہانیاں کے در پر دستک دی ہے۔ آپ نے حکم کیا ہم چلے آئے۔ آپ سے کشیدہ خاطر نہ تھا، نہ ہوں اور نہ کبھی ہوں گا۔ ہاں چند دوستوں نے بہت دل دکھایا حالانکہ وہ جانتے تھے کہ مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔ پھر نہ جانے کیوں.....؟ شاید میرے اسی اصول نے مجھے دنیا میں تنہا کر دیا ہے۔ ناصر بھائی آپ تو جانتے ہیں کہ منافق لوگ مجھے سخت ناپسند ہیں۔ میں اس جنس سے ایسے دور بھاگتا ہوں جیسے تیر سے کاگا۔ پھر نہ جانے کیوں خیر.....؟ تازہ پرچہ یکم جنوری کی صبح کو خریدا۔ سرورق کی ماڈل کی تعریف کرتے ہوئے اب تو ڈر لگتا ہے۔ چند دوستو نے میرے بارے میں غلط رائے قائم کر لی تھی جیسے میں منٹو کے رومانی افسانے کا بے کسوت کردار ہوں۔ کاش میری ذات پر انگلی اٹھانے سے قبل وہ سوچ لیتے کہ تین انگلیوں کا رخ ان کی اپنی طرف بھی ہے۔ ماڈل کو دیکھ کر بھائی موسیٰ رضا یاد آگئے وہ ملیں تو انہیں میرا سلام کہیے گا۔ اداریے کا جواب نہیں۔ ویلڈن بہن منزہ! "زندہ کہانی" کا کیا کہنا۔ راجہ محمود صاحب بڑے اچھے لکھاری ہیں۔ سلام کہیے گا۔ کاشی چوہان! وہ چھبیلا سا لڑکا دیکھ کر مجھے اپنی جوانی کا دور یاد آجاتا ہے۔ سنا ہے ان کی شاعری پر کتاب چھپی ہے۔ یار ایک ہمیں بھی بھیج دو، عنایت ہوگی۔ وحید انکل کی شمارے میں موجودگی ایک سند کا درجہ رکھتی ہے۔ کسی بھی محفل سخن میں بڑے بزرگوں کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے کیونکہ ان کی ہر اچھی بات عمر اور تجربے کے حوالے سے دوسروں کے لیے سبق ہوتی ہے۔ "سچی کہانیاں" میں بہت سے نئے چہرے شامل ہوئے، ماشاء اللہ گلشن کا کاروبار جاری ہے۔ سب نئے دوستوں کو خوش آمدید۔ پرانے دوست بہت کم دکھائی دیئے کہاں چلے گئے؟ آؤ بھئی کیا پتا کب کس موڑ پر زندگی کی شام ہو جائے۔ نیک تمناؤں کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ نامہ بند کروں چلتے چلتے ایک خوب صورت شعر

سانس بھی لوں تو ڈر لگتا ہے
یہ گھر تاش کا گھر لگتا ہے

✉ شگفتہ شفیق کراچی سے۔ "محترم ناصر رضا بھائی السلام علیکم! بہت ساری معذرت کہ یہ میرا خط اس قدر لیٹ ہے پر کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا کہ کچھ بھی نہیں کرنے کو دل نہیں چاہتا..... تو آج کل وہی عالم ہمارے دل پر


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی طاری ہے۔ پر آپ کی محبت مجبور کر رہی ہے کہ چاہے دیر سے ہی سہی پر خط ضرور لکھوں۔ امید ہے کہ آپ اور ''سچی کہانیاں'' کے تمام اسٹاف ممبرز بخیریت ہوں گے۔ منزہ اور رخسانہ بھابی یقیناً بہت مصروف ہوں گی۔ اخبار کے سلسلے میں..... ان دونوں کو بہت پرخلوص سلام۔ بہت سارے پیارے پیارے بہن بھائیوں نے ہمارا ''کراچی سے کینیڈا تک'' سفرنامہ بہت پسند کیا ہے جس کے لیے سچے دل سے نازیہ بتول رضا، سدرہ انور علی، فرحت جمال، ممتاز احمد، سیدہ افشاں سحر اور مہک شیخ کے شکر گزار ہیں۔ اس بار ''روحانی مسیحا'' بے حد پسند آیا۔ مینا تاج کی کہانی ''ایزی چیئر'' دلچسپ رہی۔ ثمرین ادریس کی دردناک کہانی ''زندگی ہے بے وفا'' بڑی دل کو لگی۔ ''کالوں کا دیس'' فوزیہ شاہین نے خوب لکھا۔ محمد فہیم صاحب کا ''زندگی لکھ رہا ہوں میں'' بھی بے حد پسند آیا۔ ''ناشون'' کی انفرادیت برقرار ہے۔ سو پسند آرہی ہے۔ ناصر بھائی! ''سچی کہانیاں'' کی دردناک کہانیاں دل کھول کے ڈپریسڈ کرتی ہیں لیکن کیا کریں کہ آج کل معاشرے کی یہ ہی حقیقت ہے۔ شاید ان کہانیوں کے چھپنے سے ہی کوئی راہ راست پر آجائے پڑھ کے..... ابھی نہ جانے کیوں دل بہت اداس سے اگلی بار انشاء اللہ اچھا والا خط لکھوں گی اب اجازت اللہ حافظ۔''

✉ غزالہ شاہین عبدالقیوم کراچی سے۔ ''محترم ناصر رضا السلام علیکم! امید ہے آپ تمام اسٹاف سمیت بخیر و عافیت ہوں گے۔ فروری 2012ء کا ''سچی کہانیاں'' اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ سرورق پر مسکراتی پرکشش ماڈل نے دل موہ لیا۔ اداریہ میں منزہ سہام نے ''پہچان'' کے عنوان سے سوچ کی راہیں کھول دیں۔ منزہ سہام ہمیں ''فلک ٹائمز'' کا بھی شدت سے انتظار ہے۔ ''احوال'' میں اشعر جواد صاحب کی خوب صورت نظم ''زنداں'' پڑھی جس کا ہر ہر لفظ دل کی گہرائیوں کو چھو گیا۔ راجہ محمود صاحب نے ''روحانی مسیحا'' کے عنوان سے اشفاق احمد کی زندگی کا احوال پیش کیا جو بے حد پسند آیا۔ راجہ محمود صاحب بہت شکریہ ان تمام معلومات کو ہم پہنچانے کا۔ واقعی اشفاق احمد ایک عظیم شخصیت تھے۔ ''ایک تھی راج کماری'' کہانیوں میں ایک اور خوب صورت سوچ کی کہانی رہی، مینا تاج کی ''ایزی چیئر'' اپنی انفرادیت کی وجہ سے اچھی لگی۔ منزہ سہام مرزا کی تحریر ''شہید کی ڈائری'' لہو گرماتی اور جوش و جذبے سے معمور ایک منفرد تحریر تھی۔ آصفہ اقبال بلوچ کی ''میں خود غرض ہوں'' اپنے انداز بیان کی وجہ سے اچھی لگی۔ نوشین غلام کی ''محبت کا اندھا پن'' ایک لازوال محبت کی داستان تھی۔ سادہ انداز میں پیش کی گئی کہانی دل کے تاروں کو چھو گئی۔ سیمیں غزالہ نہاں کی کہانی ''سوچ جب بدل گئی'' خواتین کی مخصوص روایتی سوچ کی عکاسی کرتی ایک بہترین کہانی تھی۔ کاش ہم توہمات کے اثرات سے نکل سکیں۔ ''کارخانہ عبرت'' مکافات عمل کے تناظر میں لکھی گئی ایک عبرت ناک انجام کی تحریر تھی۔ عبداللہ شاہد کی ''پہنچی وہیں پہ خاک'' بدترین کردار رکھنے والی عورت کی بپتا تھی جو عورت کے نام پر ایک داغ ہوتی ہیں۔ عبداللہ شاہد نے کہانی میں خوب صورت جملوں کا استعمال کر کے اسے نکھار دیا۔ ممتاز احمد نے موبائل کہانی خوب لکھی۔ درحقیقت موجودہ دور میں موبائل کے غلط استعمال نے نوجوانوں کو عقل سے کورا کر دیا ہے لیکن جو بروقت سنبھل گیا سمجھو وہی بچ گیا۔ پراسرار کہانیوں میں شیما قیوم کی کہانی اچھی لگی۔ شیخ معظم الٰہی کی کہانی بھی بہتر تھی۔ ارم زہرا ہر ماہ انتہائی دل دہلانے والی کہانیاں لکھ کر دل و دماغ کو خوف زدہ کر دیتی ہیں۔ پلیز ارم..... اب کوئی ہلکی پھلکی کہانی لائیے۔ محمد فہیم صاحب کی ''زندگی لکھ رہا ہوں میں'' سادہ طرز تحریر لیے خوب صورت احوال زندگی تھا۔ پسند آیا۔ سلسلے وار ناول ''ناشون'' کا جواب نہیں۔ ''گھائل آتما'' خوب صورتی سے اختتام کی طرف گامزن ہے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## دکھ کی خبر

گزشتہ دنوں ہمارے ادارے کی دیرینہ دوست معروف لکھاری سنبل صاحبہ کی والدہ محترمہ رضائے الٰہی سے رزق خاک ہوئیں۔ ادارہ سنبل صاحبہ اور دیگر لواحقین کے غم میں برابر کا شریک ہے اور مرحومہ کی مغفرت اور درجات میں بلندی کے لیے دعا گو بھی ہے۔

اور فاطمہ بلگرامی کے سلسلے کا آغاز اچھا ہے۔ تمام سلسلے، غزلیں اور نظمیں خواب رہیں۔ پچھلے ماہ بھی خط لکھا تھا مگر کیا کیجیے اس محکمہ ڈاک کا کہ خط آپ کو ملا نہیں۔ بہر حال امید ہے یہ لیٹر شاملِ بزم ہوگا۔

✉ لیلیٰ مروا اقبال سیالکوٹ سے۔ ایڈیٹر انکل السلام علیکم! میں آپ کی محفل میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں۔ سچی کہانیاں کا سرورق بہت دلکش تھا۔ زندگی ہے بے وفا، سوچ جب بدل گئی، موبائل کہانی اور سلسلے وار کہانیاں بہت زبردست رہیں۔ میں آپ کے پرچے کے لیے ایک موبائل کہانی بھیج رہی ہوں۔ پلیز اسے سچی کہانیاں میں ضرور جگہ دیجیے گا۔''

✉ ممتاز احمد سرگودھا سے۔ ''محترم ناصر رضا السلام علیکم! خدائے برحق سے امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے اور میرے خوب صورت رفیق اور محبوب رسالے ''سچی کہانیاں'' کی ترقی و سربلندی کے لیے مصروف کار ہوں گے۔ فروری 2012ء کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ سرورق کی انتہائی خوب صورت ماڈل انوشے کی تصویر کے ساتھ اشفاق احمد صاحب کی تصویر دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ ''احوال'' میں اپنا خط اور کہانی دیکھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی اور دل سے آپ کے لیے ڈھیروں دعائیں نکلیں۔ ایک اور نئی کہانی اور ''خیال آرائی'' کی تحریر کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں اور حسب سابق پذیرائی کا متمنی ہوں۔ اب بات ہو جائے شمارے کی۔ ''احوال'' میں سب لکھاریوں کے تبصرے بہت ہی عمدہ اور زبردست تھے۔ بالخصوص شگفتہ شفیق، اشعر جواد، سدرہ انور علی، ارشد بخاری، روبینہ شاہین اور جعفر خان جمالی کے تبصرے شاندار تھے۔ راجہ محمود نے ''روحانی مسیحا'' میں بابا جی اشفاق احمد کی زندگی کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کو بہت ہی خوب صورت انداز میں اجاگر کیا ہے۔ اشفاق احمد ایک بہت بڑے صوفی بزرگ اللہ لوک انسان اور علم و حکمت کا ایک بہتا دریا تھے۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ نسرین نکہت سبزواری کی ''ایک تھی راج کماری'' بہت ہی عمدہ اور لازوال کہانی تھی بہت پسند آئی۔ مینا تاج کی ''ایزی چیئر'' بہت شاندار کہانی تھی دولت اور عہدے سارے حسب نسب اور خاندانی شجروں کو ڈھانپ دیتی ہے۔ شہید کی ڈائری بہت پسند آئی۔ آصفہ اقبال بلوچ اور نوشین غلام حسین کی کہانیاں اچھی تھیں۔ سیمیں غزالہ نہاں کی ''سوچ جب بدل گئی'' اور ثمرین ادریس کی ''زندگی ہے بے وفا'' پر اثر کہانیاں تھیں۔ ڈاکٹر عدنان مسعود کی ''کارخانہ عبرت'' ایک مکافات عمل کی جیتی جاگتی کہانی تھی اور بے اختیار یہ مصرعہ لبوں پر آ گیا۔ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے۔ ارما اعوان کی ''یہ کیسا سمجھوتہ'' پڑھ کر دل لرز اٹھا کہ حوا کی بیٹی کی اتنی تذلیل؟ اللہ ہدایت دے ایسے درندوں کو۔ شیما قیوم کی ''لہو پکارے گا'' ایک عبرتناک اور قدرت کے انصاف پر مبنی زبردست کہانی تھی۔ محمد صدیق احمد کی ''پراسرار بھول بھلیاں'' اور شیخ معظم الٰہی کی ''جسے اللہ رکھے'' بہت ہی حیرت انگیز کہانی تھیں۔ ارم زہرا کی ''انسان نما شیطان'' دل کو ہلا دینے والی عبرت انگیز کہانی تھی۔ قابل صد احترام محمد فہیم صاحب کی سوانح حیات ''زندگی لکھ رہا ہوں میں'' بہت ہی خوب صورت اور زبردست تھی پڑھ کر مزہ آیا اور دل بہت خوش ہوا۔ محمد فہیم صاحب جیسے لوگ تو زندگی کا حسن ہیں۔ شاعری بہت عمدہ تھی دعا ہے کہ اللہ کریم ان کو اپنی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حفظ وامان میں رکھے، آمین۔ ''خیال آرائی'' میں تمام لکھنے والوں کے خیالات بہت پسند آئے۔ بالخصوص سدرہ انور علی نے وینا ملک کا کچھ چھوٹا بہت خوب لکھا۔ ویل ڈن سدرہ!..... ''ناشون'' اور ''گھائل آتما'' کا جواب نہیں..... آخر میں آپ کے لیے۔ سچی کہانیاں کی پوری ٹیم اور تمام قارئین کرام کے لیے بہت سی نیک خواہشات اور ڈھیروں دلی دعائیں، اب اجازت۔''

✉ سدرہ انور علی جھنگ صدر سے۔ ''قابل احترام انکل، السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ آپ سب بالکل خیریت سے ہوں گے۔ سرورق پر ماڈل انوشے نے ستارے کو ایک چاند لگا دیا۔ منزہ سہام کا اداریہ ''پہچان'' معاشرے کا حقیقی آئینہ ہے۔ ''احوال'' میں تمام قارئین کے خطوط بہت اچھے لگے۔ ''زندہ کہانی'' میں ''روحانی مسیحا'' کی داستان بہت دلچسپ لگی۔ نسرین نگہت سبزواری کی کہانی ''ایک تھی راج کماری'' دل کو دکھی کر گئی۔ مینا تاج کی ''ایزی چیئر'' بہت پسند آئی۔ منزہ سہام کی ''شہید کی ڈائری'' دل کو غمگین کر گئی۔ آصفہ اقبال بلوچ کی تحریر ''میں خود غرض ہوں'' یہ نہایت ہی منفرد کہانی تھی۔ نوشین غلام حسین کی کہانی ''محبت کا اندھا بن'' پسند آئی۔ سیمیں غزالہ نہاں کی کہانی ''سوچ جب بدل گئی'' شاہدہ بیگم تو نیک شگون اور بدشگونی کی قائل ہو گئیں لیکن میں نہیں ہوئی، کیونکہ میرا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا، ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ ثمرین ادریس کی تحریر ''زندگی ہے بے وفا'' بہت پسند آئی۔ ڈاکٹر عدنان مسعود کی تحریر ''کارخانہ عبرت'' نے ثابت کیا کہ انسان جو کرتا ہے وہ بھرتا ضرور ہے۔ عبداللہ شاہد کی کہانی ''پہنچی وہیں پہ خاک'' کوثر کا کردار بالکل پسند نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ ایسی عورتوں کو زندہ درگور کرے۔ ارما اعوان کی کہانی ''یہ کیسا سمجھوتہ'' اور احمر منصور کی کہانی ''اَن کہی داستان'' بہت اچھی لگیں۔ ''موبائل کہانیاں'' میں ممتاز سندھو کی کہانی ''اس دور کے دھوکے'' سبق آموز رہی۔ واقعی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں موبائل کو بہت غلط انداز میں استعمال کر رہے ہیں۔ اللہ سب کو ہدایت دے، آمین۔ ''پراسرار کہانی'' میں شمیما عبدالقیوم کی کہانی ''لہو پکارے گا'' بھی سبق آموز ہے۔ فیصل کا انجام اچھا لگا۔ محمد صدیق کی ''پراسرار بھول بھلیاں'' اور شیخ معظم الٰہی کی ''جسے اللہ رکھے'' اچھی لگیں۔ ''میرے شہر کی کہانی'' میں ارم زہرا کی تحریر ''انسان نما شیطان'' تڑپا گئی۔ سفر کہانی میں ''کالوں کا دیس'' بہت دلچسپ لگا۔ ''زندگی لکھ رہا ہوں'' میں انکل محمد فہیم کے بارے میں پڑھا، اچھا لگا۔ ''پسند اپنی اپنی'' میں تمام اشعار پسند آئے۔ ''خیال آرائی'' میں جعفر خان جمالی اور ثانیہ بھٹی کے خیال پسند آئے۔ فاطمہ بلگرامی کے ناول ''جن آنکھوں میں خواب بسے تھے'' کی دوسری قسط بہت دلچسپ تھی۔ شازلی مغل کی ''ناشون'' کا جواب نہیں۔ رانیہ کو نئی زندگی ملی، بہت خوشی ہوئی۔ ''گھائل آتما'' اچھی جا رہی ہے۔ ''تذکرہ اور تبصرہ'' میں عکاشہ ایمان کا تبصرہ لاجواب تھا۔ آپ کی ڈائری میں سب کے انتخابات پسند آئے۔ ''بازگشت'' میں انکل سہام مرزا کا سوال حقیقت سے بہت قریب تر ہے۔ اب اجازت..... اگر زندگی رہی تو اگلے ماہ حاضری ہوگی، تب تک اللہ نگہبان۔''

✉ وفا صدام حسین غازی، تیونس حیدرآباد سے۔ ''محترم ناصر رضا السلام علیکم! فروری کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ سرورق پر ماڈل کافی جچ رہی تھی اور ساتھ ہی بابا جی اشفاق احمد کی تصویر بھی اچھی تھی۔ منزہ سہام کا اداریہ ''پہچان'' اچھا لگا۔ ''احوال'' میں ساتھیوں کے خط پڑھے۔ جب اپنا خط پڑھا تو یقین ہی نہیں آیا کہ اگلے ماہ میری کہانی چھپے گی، آپ کا شکریہ محترم۔ ''زندہ کہانی'' میں راجہ محمود کے قلم سے ''روحانی مسیحا'' پڑھ کر معلومات میں بہت اضافہ ہوا۔ خصوصی کہانیوں میں نسرین نگہت سبزواری کے قلم سے ''ایک تھی راج کماری'' اچھی روداد



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ بینا تاج کے قلم سے ''ایزی چیئر'' بڑی دکھ بھری روداد تھی۔ شہید کی کہانی میں۔ منزہ باجی کے قلم سے ''شہید کی ڈائری'' اچھا سلسلہ ہے۔ پڑھ کر اچھا لگا۔ آپ بیتی میں آصفہ اقبال بلوچ کے قلم سے۔ ''میں خود غرض ہوں'' پڑھ کر حیرت ہوئی۔ اچھی روداد تھی۔ نوشین غلام حسین کے قلم سے ''محبت کا اندھا پن'' دکھ بھری کہانی تھی۔ جگ بیتی میں سیمیں غزالہ نہاں کے قلم سے ''سوچ جب بدل گئی'' سبق آموز کہانی تھی۔ ثمرین ادریس کے قلم سے ''زندگی ہے بے وفا'' اچھی روداد تھی۔ ڈاکٹر عدنان مسعود کے قلم سے ''کارخانہ عبرت'' حیرت بھری روداد تھی۔ جیتی جاگتی تحریر میں عبداللہ شاہد کے قلم سے ''پہنچی وہیں پہ خاک'' حیرت بھری روداد تھی۔ ارما عوان کے قلم سے ''یہ کیسا سمجھوتا'' دکھ بھری داستان تھی۔ احمر منصور کے قلم سے ''ان کہی سی داستان'' بڑی دکھ بھری حقیقت تھی۔ موبائل کہانیاں میں ممتاز احمد کے قلم سے ''اس دور کے دھوکے'' سبق آموز کہانی تھی۔ پراسرار کہانیاں میں شیما قیوم کے قلم سے ''لہو پکارے گا'' بہت دلچسپ کہانی تھی۔ محمد صدیق احمد کے قلم سے ''وہ پراسرار بھول بھلیاں'' حیرت انگیز کہانی تھی۔ شیخ معظم الٰہی کے قلم سے ''جسے اللہ رکھے'' اچھی حیرت بھری کہانی تھی۔ میرے شہر کی کہانی میں ارم زہرا کے قلم سے ''انسان نما شیطان'' دکھ بھری روداد تھی۔ سفر کہانی میں فوزیہ شاہین کے قلم سے ''کالوں کا دیس'' بہت دلچسپ سفر نامہ تھا۔ میری کہانی میری زبانی میں محمد فہیم کے قلم سے انہی کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا۔ ''آپ کی ڈائری'' بھی بہت اچھی سجی ہوئی تھی۔ ''خیال آرائی'' بھی اچھی لگی۔ تبصرہ اور تذکرہ میں عکاشہ سحر کے قلم سے حسین اختر کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا۔ ''پسند اپنی اپنی'' میں امجد اسلام امجد کا شعر، مرسلہ رائمہ مجید ٹنڈو آدم، اچھا لگا۔ محترم ابھی اتنا ہی پڑھ پایا ہوں۔ سلسلے وار ناول ''گھائل آتما'' اور ''تاشون'' کا معیار قائم ہے اور اب اجازت۔''

✉ ام عادل کراچی سے۔ ''اچھے بھیا ناصر رضا السلام علیکم! امید ہے آپ اور آپ کی ٹیم اللہ کے خاص فضل وکرم سے عافیت کے ساتھ اپنی شبانہ روز سرگرمیوں میں مصروف عمل ہوں گے۔ آپ کی فروری کی کاوش میرے ہاتھ میں ہے۔ ٹائٹل پر نگاہ پڑی جو یکسانیت لیے ہوئے تھا مگر کونے میں چسپاں اپنے پسندیدہ رائٹر اور شخصیت اشفاق احمد ان کی تصویر دیکھ کر فوراً سب سے پہلے اشفاق احمد صاحب سے متعلق اپنی معلومات میں اضافے کا فیصلہ کیا۔ راجہ محمود صاحب ہر دلعزیز شخصیات سے متعلق اتنی مکمل اور مفید معلومات بہم پہنچانے پر شکریے کے مستحق ہیں۔ پڑھی جانے والی تحاریر میں بینا تاج کی ''ایزی چیئر'' بہت بہت پسند آئی۔ بینا صاحبہ کی تحریر میں ایک ٹھہراؤ اور تسلسل چھایا جاتا ہے جو انہیں دوسروں سے منفرد کرتا ہے۔ ''شہید کی ڈائری'' بھی اچھا سلسلہ ہے۔ آصفہ بلوچ کی ''میں خود غرض ہوں'' پُرآسائش اور سہل پسند طبیعت کی عکاسی کرتی ہے۔ ''سوچ جب بدل گئی'' نیک شگون اور بدشگون پر لکھی گئی کہانی ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ بحیثیت مسلمان ہمیں ان خرافات پر دھیان نہیں دینا چاہیے بلکہ اپنی تقدیر پر کامل یقین ہونا ضروری ہے۔ ارے واہ عبداللہ شاہد صاحب نمبر لے گئے کوثر نامی خاتون پر کس قدر پراثر اور خوب صورت کہانی لکھی ہے۔ کوثر جیسی بدکردار عورت کا انجام نہایت خوب صورت ہوا جو نسلی بدکردار ہوں انہیں کوئی راہ راست پر نہیں لاسکتا۔ اف ارما عوان ''یہ کیسا سمجھوتہ'' کہاں سے معاشرے کا اتنا گھناؤنا روپ ڈھونڈ کر لائی ہیں۔ سچ انہی بداعمالیوں کی وجہ سے ہم روبہ زوال ہیں۔ احمر منصور صاحب نے معاشرے کے جس طبقے سے متعلق معلومات کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ خوب ہے۔ ویلڈن منصور صاحب اپنی کاوش جاری رکھیے۔ آپ کی اس کاوش کے عوض ہم قارئین کو اس مظلوم طبقے سے متعلق بہت اہم معلومات مل رہی ہیں۔ موبائل کہانی


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو ہمیشہ نمبرون اور عبرت ناک ہوتی ہے اگر کوئی سبق حاصل کرلے تو۔ شیما قیوم کی "لہو پکارے گا" انسان کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خود غرضی اور مطلب برداری سے پُر کہانی تھی۔ ایسے لوگ نہ دنیا میں سکون پاتے ہیں اور نہ آخرت میں ان کا کوئی ٹھکانا نہ ہوگا۔ ارم زہرا کی "انسان نما شیطان" کچھ عرصہ قبل ٹی وی کے ہر چینل پر آنے والی کہانی تھی مگر ان کی تحریر سے کہانی کے اصل حقائق سے آشنائی ملتی ہے۔ آپ کی ڈائری میں چاشنی کچھ کم سے کم ہوتی جارہی ہے۔ "خیال آرائی" سب کی بہت پسند آئی۔ کچھ اشعار بہت پسند آئے۔ "ناشون" بہت دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ خط اب طوالت پکڑ گیا ہے لہٰذا آپ سب کو اور قارئین کو نیک تمناؤں کے ساتھ خدا حافظ۔"

✉ شاہد فراز حب چوکی سے۔ "محترم انکل ناصر رضا السلام علیکم! "سچی کہانیاں" شمارہ فروری ملا۔ "احوال" میں دوستوں کے خوبصورت نامے پڑھتے ہوئے "روحانی مسیحا" تک پہنچے۔ پروین شاکر کے بعد اشفاق احمد کے بارے میں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ راجہ صاحب، زور قلم اور زیادہ۔ نسرین نگہت کی تحریر "ایک تھی راج کماری" منزہ آپی کے قلم سے "شہید کی ڈائری" اچھا سلسلہ ہے۔ جاری رہنا چاہیے۔ "ناشون" اور "گھائل آتما" اچھی جارہی ہیں۔ ارم زہرا کی تحریر "انسان نما شیطان" ایک سبق آموز کہانی تھی۔ محمد صدیق "پراسرا بھول بھلیاں" لے کر آئے۔ حیدر آباد کی گلیوں کی کیا بات ہیں بقول کامی شاہ

میں یہاں خود کو ڈھونڈنے نکلا
وہ محلہ وہی گلی ہو تم

سفر کہانی میں فوزیہ شاہین کی "کالوں کا دیس" دلچسپ رہی۔ "میری کہانی میری زبانی" انکل فہیم کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ انکل جی اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ ورق ورق مہکتی شاعری میں زاہد جے پوری، دستگیر شہزاد، محمد صفدر، نازیہ بتول نزہت فاروقی، وحید دانش کے خیالات دل کو بھائے۔ جعفر خان جمالی، شاہد بھٹی، سدرہ انور علی کی خیال آرائی پسند آئی۔ عکاشہ جی بہت خوب صورت مضامین متعارف کرا رہی ہیں۔ عکاشہ جی اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے اور آخر میں بھائی اشعر جواد، کاشی چوہان، وفا صدام حسین، محترمہ شگفتہ شفیق، رابیل آپی، صفیہ سجل آپی کو خلوص بھرا اسلام۔"

✉ محمد اسماعیل بروہی شہر دوڑ سے۔ "بھائی ناصر رضا السلام علیکم! ہم "سچی کہانیاں" میں پورے نو ماہ ماہ غیر حاضری کے بعد حاضر ہیں۔ کچھ مسائل اور مصروفیات تھیں۔ "سرورق" پر ماڈل انوشے کا اسٹائل بہت اچھا لگا۔ منزہ آپا کا اداریہ "پہچان" دل سے پڑھا۔ اشفاق احمد کے بارے میں "روحانی مسیحا" پڑھی اور معلومات میں اضافہ ہوا۔ شکریہ راجہ محمود بھائی۔ "ایک تھی راج کماری" نسرین نگہت کی کہانی بہترین رہی۔ "ایزی چیئر" مینا تاج کی کہانی بے حد پسند آئی۔ "میں خود غرض ہوں" آصفہ اقبال بلوچ کی تحریر مختلف تھی۔ "محبت کا اندھا پن" نوشین غلام حسین نے بھی اچھی کہانی لکھی۔ عبداللہ شاہد کے قلم سے "پہنچی وہیں پہ خاک" زبردست رہی۔ "انسان نما شیطان" شہر کراچی سے جنم لینے والی کہانی ارم زہرا نے خوب لکھی۔ "زندگی لکھ رہا ہوں" پیارے انکل محمد فہیم کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا۔ "جن آنکھوں میں خواب" فاطمہ بلگرامی کی کہانی اچھی رہی۔ "ناشون" یہ سلسلہ زبردست جارہا ہے۔ "گھائل آتما" یہ سلسلہ بھی اچھا ہے۔ "پسند اپنی اپنی" اور آپ کی ڈائری کا جواب نہیں اور اب "سچی کہانیاں" کے تمام رائٹرز اور قارئین کے لیے ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ اجازت۔"

✉ رضوانہ کوثر لاہور سے۔ "ناصر ویر السلام علیکم! کیسے ہیں آپ سب! اللہ آپ سب کو اپنی امان میں


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رکھے۔ خوب صورت سرورق کے ساتھ فروری کا شمارہ بہت اچھا لگا۔ ''احوال'' کی ابتداء اشعر جواد کی ''زنداں'' سے ہوئی جس کے ہر لفظ نے دل پر گہرا اثر کیا۔ تمام کہانیاں، شاعری اور تمام سلسلے خوب رہے۔ نئے پرانے سب ساتھی اچھا لکھ رہے ہیں۔ ''خیال آرائی'' میں سب نے بہتر مگر جعفر خان جمالی، ثانیہ بھٹی، سدرہ انور اور فیضان حسین عثمانی نے بہترین لکھا۔ ''تبصرہ اور تذکرہ'' عکاشہ سحر بہت خوب صورتی اور ذمے داری سے نبھا رہی ہیں۔ نوجوان شاعر کاشی چوہان ''اور تم...... کہاں ہو تم؟'' ''شہید کی ڈائری'' بہترین سلسلہ ہے۔ صوفی منش اشفاق احمد کے بارے میں پڑھنا بہت اچھا لگا۔ میں نے 25 سال جس اسکول میں پڑھایا ہے اس کی بنیاد اردو ڈائجسٹ کے بانی نے ہی رکھی تھی اور وہ سمن آباد ''ڈونگی گراؤنڈ'' پہ ہی تھا مین روڈ پر۔ یہ سب عظیم لوگ ہیں جو یہاں سے جا کر بھی دلوں میں بستے ہیں۔ اشفاق احمد اور بانو آپا دونوں ہی دلوں پہ راج کرنے والے لوگ ہیں اور پیاری شگفتہ شفیق آپ کے سفرنامہ کینیڈا نے ہمارے بھی عیش کرا دیئے۔ دونوں اقساط نے بہت مزہ دیا اور لگا کہ ہم ہر لحہ آپ کے ساتھ رہے ہیں۔ تصویر میں بھی جچ آپ رہی ہیں اور فخر ہمیں ہو رہا ہے۔ اپنی پیاری مسکراتی دوست کی پذیرائی پر۔ خوش رہو اور اسی طرح خوشیاں بانٹتی رہو۔ اس ماہ محمد فہیم کی زبانی ان کے حالات زندگی پڑھے جو انہوں نے بڑی خوب صورتی سے عیاں کیے۔ واقعی ان کی تالج اور سیاحت وسیع ہے۔ اللہ میرے اس بھائی کو صحت سکون سے رکھے۔ اسی طرح فیضان عثمانی کے بارے میں پڑھ کر بھی اچھا لگا تھا۔ ان سے اور تعلیم کے شعبے سے منسلک ہر شخص سے یہ استدعا ہے کہ بچے ہمارا مستقبل ہیں۔ خدارا اپنے کام کو بہت دیانتداری سے انجام دیں۔ کیونکہ اکثر (سب نہیں) لوگوں نے اسکولوں کو بزنس بنا لیا ہے۔ یہ بڑا اہم فریضہ اور مقدس شعبہ ہے۔ فوزیہ شاہین کا سفرنامہ ''کالوں کا دیس'' بھی کافی دلچسپ اور معلوماتی رہا۔ ڈائری میں عمران ہارون چھوٹانی کا انتخاب اچھا لگا۔ ''احوال'' میں جعفر خان جمالی کا خصوصی خط واقعی تحفہء خاص رہا۔ تحسین جونیجو اللہ آپ کی بہن کی آئندہ زندگی خوشی اور سکون سے بھر دے، اس کی شادی بہت بہت مبارک ہو اور ناصر بھائی آپ کی صحت کے لیے بھی دلی دعائیں ہیں۔ ادارے اور شمارے سے منسلک ہر شخص کے لیے پرخلوص دعائیں۔ اس کے ساتھ اللہ حافظ

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

✉ صائمہ سحر کراچی سے۔ ''محترم ناصر انکل آداب! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ خلاف توقع فروری کا شمارہ بہت جلد مل گیا۔ اس لیے دل باغ باغ ہو گیا۔ منزہ آنٹی کا ''اداریہ'' پڑھ کر احساس ہوا کہ ہم تو خود اپنی ہی پہچان کھوتے جا رہے ہیں۔ کسی دوسرے کی پہچان کس طرح کریں۔ ''احوال'' میں تمام خطوط بہترین تھے۔ بلاشبہ جعفر خان جمالی کا خط بہت خاص تھا۔ راجہ محمود نے اشفاق احمد کے بارے میں جو بھی لکھا اس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں کیونکہ اشفاق احمد واقعی ایک روحانی مسیحا تھے۔ تمام کہانیاں بہترین تھیں ''میری کہانی میری زبانی'' میں محمد فہیم انکل کے بارے میں پڑھا۔ بہت اچھا لگا کیونکہ لفظوں کو انمول کر دینا فہیم انکل کا ہی خاصہ ہے۔ ''خیال آرائی'' سب کی ہی اچھی تھی اور ہاں انکل جی! میں بھی اشعر جواد جی۔ سے متفق ہوں کہ آپ اپنی کہانی لکھیں تاکہ ہمیں آپ کے بارے میں پتا چل سکے۔ تمام سلسلے وار کہانیاں بہترین جا رہی ہیں انکل جی 16 اپریل کو میری سالگرہ ہے اس لیے تمام لوگوں سے التماس ہے کہ مجھے وش کر دینا۔ اب اجازت لیکن اس دعا کے ساتھ کہ ہمارا وطن عزیز اور خاص طور پر کراچی میں امن و امان قائم رہے اور لاہور میں پراسرار بیماری کا خاتمہ



# UTOPIA خواب نگر

| | |
|---|---|
| Oh, Lords` of Earth, Oh, gods` of Earth | اے حاکمانِ ارضی، دنیا کے ناخداؤ |
| We, the living creatures, | ہم زندگی کی حامل مخلوق ہیں خدا کی |
| Pretty gifts of natures | فطرت کا ہم یقیناً اک تحفۂ حسیں ہیں |
| Innocent children, smiling tots, | معصوم ہم ہیں بچے، لب پر ہے مسکراہٹ |
| crawling on knees, Laying in cots, | ہم ننھے منے پیارے گھٹنوں کے بل ہیں چلتے |
| Praying for the peace day and night | پنگھوڑے میں ہیں لیٹے کرتے ہیں التجائیں |
| To The God having Almight, | امن و سکون کی ہر دم خلاق دو جہاں سے |
| crying for attention | جو ہے قوی و قادر، ہم طالب توجہ |
| We beg affection, | ہم مانگتے ہیں الفت، ہم چاند، ہم ستارے |
| We are moons, we are stars | |
| We want world free from wars, | ہم چاہتے ہیں دنیا امن و سکوں سے پُر ہو |
| | شعلے نہ ہوں جہاں میں جنگ اور عصبیت کے |
| We are shoots, we are flowers | ہم پھول، کونپلیں ہیں، کرتے ہیں ہم گزارش |
| | بارود و اسلحہ کے انبار مت لگائیں |
| No ammunitions, | |
| build peace towers | مینار امن ہر جا تعمیر کرتے جائیں |
| | ہم خواب، ہم امیدیں، بے شک ہمارا حق ہے |
| We are dreams, we are hopes, | |
| We must inherit, better living scopes | ورثے میں پائیں ہم سب بہتر حیاتِ دنیا |

صادق شمیم چوہدری



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو آمین۔"

✉ شازیہ عرشی جیکب آباد سے۔ "ناصر بھائی السلام علیکم کے بعد 13 اکتوبر 2011ء کو اللہ کے فضل و کرم سے اس بڑے دربار کی حاضری کا سندیسہ ملا۔ عشق و محبت، عقیدت و بندگی کے اس سفر میں قلب ایک خاص قسم کے ایک انوکھے سرور و فرحت سے لبریز رہا جس نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ یہ پُر بہار منزلیں کیسے طے ہوئیں، اس کا احوال لکھ ڈالا ہے۔ لکھنے میں ضرور خامیاں ہوں گی اور اگر قابل قبول ہے تو اپنے رسالے میں تھوڑی سی جگہ دے دیجیے گا۔ آپ کا "سچی کہانیاں" میں کافی عرصے سے پڑھتی ہوں۔ اب پہلی بار آپ کی بزم میں دستک دے رہی ہوں۔ امید ہے کہ مایوسی نہ ہوگی۔"

✉ سنبل کراچی سے۔ "پیارے ناصر بھائی السلام علیکم! خدا آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ ہمارے لیے صبر و سکون کی دعا کیجیے گا۔ وہ چراغ بجھ گیا جس کے گرد ہمارے ہاتھ بصورت دعا اٹھے ہوئے تھے۔ میری امی کا 12 جنوری 2012ء بروز جمعرات انتقال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ہمارے پیچھے دعا مانگنے والے ہاتھ گر گئے۔ ابھی تو باپ کی شفقت سے محروم ہوئے ڈھائی سال ہی ہوا تھا کہ اس نے ممتا بھی واپس لے لی۔ اس کا مال تھا اس نے لے لیا۔ اس کی رضا۔ میری سب سے چھوٹی بہن ابھی زیر تعلیم ہے اسے میں ساتھ لے آئی ہوں۔ میرے لیے دعا کیجیے گا کہ خدا تعالیٰ مجھے اس ذمہ داری سے عہدہ برآں ہونے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ میری آپ سب سے گزارش ہے کہ میری امی اور ابو کے لیے تین بار درود شریف پڑھ کر انہیں ایصال ثواب کریں جزاک اللہ۔"

✉ فرحت جمال کراچی سے۔ "ناصر بھائی السلام علیکم! صدا شاد و آباد رہیے۔ خوب صورت تحریروں اور سلسلوں سے مزین "سچی کہانیاں" خدا کرے فلک پر چاند تاروں کی طرح چمکتا دمکتا رہے، آمین۔ راجہ محمود کا مضمون "روحانی مسیحا" بہت شاندار رہا۔ مینا تاج کی کہانی "ایزی چیئر" بہترین لگی۔ منزہ سہام کی "شہید کی ڈائری" خوب صورت تحریر تھی۔ آصفہ اقبال کی کہانی "میں خود غرض ہوں" اچھی تھی۔ نوشین اقبال کی "محبت کا اندھا پن" ایک حساس کہانی لگی۔ ثمرین ادریس "زندگی ہے بے وفا" خوب کہانی تھی۔ یہ سب نصیبوں کے کھیل ہیں۔ ڈاکٹر عدنان کی کہانی "کارخانہ عبرت" مکافات عمل پر اچھی تھی۔ عبداللہ شاہد کی کہانی "پہنچی وہیں پہ خاک" بہت زبردست لگی۔ "یہ کیسا سمجھوتہ" ارما اعوان کی کہانی بہت اچھی تھی۔ بس اللہ رحم کرے۔ "ان کہی سی داستان" احمر منصور کی کہانی حساس موضوں پر زبردست تھی۔ ممتاز احمد کی کہانی "اس دور کے دھوکے" خوب تھی۔ شیما قیوم کی کہانی "لہو پکارے گا" ٹھیک ٹھاک لگی۔ محمد صدیق کی کہانی دلچسپ لگی۔ شیخ معظم کی کہانی "جسے اللہ رکھے" واقعی جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے اچھی تھی۔ ارم زہرا کی کہانی "انسان نما شیطان" کافی لرزہ خیز لگی۔ محمد فہیم "زندگی لکھ رہا ہوں" بہت خوب صورتی سے آپ نے حالات زندگی کو تحریر کیا۔ "گھائل آتما" اور "تاشون" کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں اتنا ہی کہوں گی۔ بہت شاندار جا رہے ہیں۔ سلسلے سب ہی لاجواب ہیں۔ شاعری ہمیشہ کی طرح سپر ہٹ رہی۔ اجازت دیں اس دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت کا راستہ دکھائے، آمین۔"

✉ مور شاہد وفا، کراچی سے۔ "انکل ناصر رضا السلام علیکم! "سچی کہانیاں" شمارہ فروری ملا۔ "احوال" پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ میرا خط احوال میں شائع کرتے ہیں۔ آنٹی منزہ سہام کے قلم سے "شہید کی ڈائری" پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ واقعی ہمارے فوجی جوانوں نے اپنے وطن پاکستان



کے لیے بہت عظیم قربانیاں دی ہیں۔ آصفہ اقبال کے قلم سے "میں خود غرض ہوں" پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ دولت ہی سب کچھ ہے، نہیں تو اپنے بھی پرائے بن جاتے ہیں۔ نوشین غلام حسین کے قلم سے "محبت کا اندھا پن" پڑھ کر بہت دکھ ہوا کہ دو محبت کرنے والوں کے درمیان غلط فہمی حائل کر دی گئی جس نے ایک کو دوسرے کی نظر میں بے وفا بنا دیا۔ ثمرین ادریس کے قلم سے "زندگی ہے بے وفا" پڑھ کر دکھ ہوا۔ ارما اعوان کے قلم سے "یہ کیسا سمجھوتہ" پڑھ کر دل کانپ اٹھا۔ ممتاز احمد کے قلم سے "اس دور کے دھوکے" پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ آج ہم کہاں کھڑے ہیں۔ شیما قیوم کے قلم سے "لہو پکارے گا" پڑھ کر دکھ ہوا کہ چند روپے کے لیے فیصل اپنی محبت کا قاتل بن گیا۔ شیخ معظم الٰہی کے قلم سے "جسے اللہ رکھے" مختصر تحریر پڑھ کر خوشی ہوئی کہ ہمارے اعمال برے ہیں پھر بھی اللہ ہمارے ساتھ ساتھ ہے۔ ارم زہرہ کے قلم سے "انسان نما شیطان" پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اپنے والدین کو دھوکا دینے والی اولاد کسی بھی نہیں ہو سکتی۔ فاطمہ بلگرامی کے قلم سے نیا سلسلہ "جن آنکھوں میں خواب بسے تھے" پسند آیا۔ حنیف سحر کے سلسلے "گھائل آتما" اور "تاشون" کا جواب نہیں۔ آخر میں سچی کہانیاں کے تمام اسٹاف اور لکھاریوں اور قارئین سے میری التجا ہے کہ سب دل سے دعا کریں کہ میں اچھی سے اچھی کہانیاں لکھ سکوں۔"

✉ کرن شبیر کراچی سے۔ "محترم ناصر رضا انکل السلام علیکم! بہت عرصے بعد "احوال" کی محفل میں آئی ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ "سچی کہانیاں" سے میرا تعلق ختم ہو گیا تھا۔ یہ تعلق تو انشاء اللہ تعالیٰ جڑا رہے گا۔ شمارہ فروری کا ٹائٹل سوسوتھا۔ "احوال" کی محفل سے ہوتے ہوئے راجہ محمود کی "ایک روحانی مسیحا" پڑھ کر ایک مقبول ادیب کے بارے میں بہت کچھ پڑھنے کو ملا۔ نسرین جی کی کہانی واقعی بہت خوب صورت سبق اپنے اندر سموئے ہوئے تھی۔ شیما قیوم کی کہانی بہت دردناک انجام لیے ہوئے تھی۔ "پہنچی وہیں پہ خاک" بہت ہی زبردست کہانی ہے۔ "ان کہی سی داستان" یہ تحریر اس شمارے کی جان تھی۔ اس موضوع پر احمر منصور کی اگلی تحاریر پڑھنے کے لیے بھی بے صبری سے انتظار کر رہی ہوں۔ ارم زہرا ہمیشہ نہایت دلخراش حقیقتوں سے روشناس کراتی ہیں۔ فوزیہ شاہین کا سفر نامہ پسند آیا۔ عکاشہ کے تبصرے مجھے بہت پسند ہیں اور اب بات ہو جائے میگزین کی جان ستاروں کی شان شازلی کی "تاشون" کی جس کی ہر قسط کچھ نیا پن لیے ہوئے ہوتی ہے۔ نت نئے اسرار و رموز بتاتے ہوئے۔ ایسا عمدہ ناول لکھنے پر شازلی کو بہت مبارک باد! "گھائل آتما" اچھی جا رہی ہے۔ فاطمہ جی نے بھی اپنے قلم کا اچھا جادو چلایا ہے۔ غرض یہ کہ اس ماہ کا میگزین اول تا آخر چھا گیا۔ میری تمام تر اچھی، پکی، سچی اور نیک دعائیں آپ کے اور تمام اسٹاف کے لیے جو اتنی محنت کرتے ہیں۔ اگلے ماہ تک کے لیے اللہ حافظ۔"

✉ سہیل خان کورنگی کراچی سے۔ "جناب ناصر بھائی السلام علیکم! بعد سلام کہ عرض یہ ہے کہ ایک دو مہینے کی غیر حاضری کے بعد دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا 15 سالہ بچہ معذور اور نارمل ہے وہ نہ چلتا نہ پھرتا نہ بولتا نہ سنتا ہے۔ اس کی رات دن کی ذمہ داری مجھے نبھانی پڑتی ہے۔ کیونکہ میرے علاوہ گھر میں کوئی آدمی نہیں ہے جو اس کو اٹھائے بٹھائے۔ چار بیٹیاں ہیں جو کہ بچے سے بڑی ہیں۔ اس وجہ سے بہت سے کاموں میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ دعا کریں کہ اللہ مجھے صحت اور ہمت دے کہ بچے کی خدمت کر سکوں۔ میں نے ستمبر 2011ء میں ایک بیٹی کے نام سے کچھ لکھا تھا جو کہ آپ نے "سچی کہانیاں" میں چھاپ کر میری حوصلہ افزائی فرمائی تھی۔ اب میرا فرض بنتا ہے کہ جب بیٹی کے لیے کچھ لکھا ہے تو اپنی ماں کے لیے بھی کچھ لکھوں۔ سو میں نے اپنے دل کی آواز لکھ دی ہے اور امید ہے یہاں بھی آپ میرا مان رکھیں گے کیونکہ مجھے لکھنے کا حوصلہ آپ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے ڈائجسٹ نے دیا ہے اور آپ نے ہمت دی کہ اپنے الفاظوں کو آپ کے ذریعے لوگوں تک پہنچاؤں۔ اسے چھاپ کر مجھ پر ایک اور عنایت کر دیں کہ میں اپنی ماں کو دکھاؤں کہ ماں میں نے بھی تمہارے لیے کچھ لکھا ہے، شکریہ۔ اللہ آپ کو آپ کی پوری ٹیم کو صحت اور تندرستی دے اور آپ کا شمارہ دن رات ترقی کریں، آمین۔

## اس ماہ کا خاص خط

✉ محترم بھائی ناصر رضا

السلام علیکم!

میرا قلمی رشتہ آپ کے ادارے سے کتنا دیرینہ ہے، یہ تو آپ جانتے ہی ہیں..... اور یہ بھی مانتے ہی ہوں کہ..... ''دوشیزہ'' سے میرا عشق بہت پرانا ہے..... اور پھر ''سچی کہانیاں'' سے جو تعلق خاص جوڑا ہے وہ بھی بڑا معتبر اور سچا ہے..... آپ کے ادارے سے میرا تعلق جڑنے کی وجہ مرحوم اسلم صدیقی انکل تھے۔ جو تادم آخر تک آپ کے ادارے میں سرکولیشن منیجر کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ''دوشیزہ'' اور ''سچی کہانیاں'' میں ہر ماہ پڑھتا ہوں اور اس پر آپ سے ہر ماہ سیر حاصل ''ٹیلی فونک'' تبصرہ بھی ہوتا ہے..... لیکن ''احوال'' میں خط کی برسوں سے نوبت نہیں آئی..... ''سچی کہانیاں'' شمارہ فروری پڑھتے ہوئے بس اچانک ہی اسلم انکل کی یاد نے چٹکی لی تھی اور پھر یادوں کا سلسلہ دراز ہوتا ہی چلا گیا..... سہام انکل، دانش دیروی انکل، شمیم نوید، ابن حسن عثمان آبادی، حاجی عدیل، زبیر عباسی اور..... بقول غالب!

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

''احوال'' میں میری آمد کا مقصد ان بچھڑے ہوئے پیاروں کو یاد کرنا، ان کے لیے مغفرت کے دعاؤں کے پھول کھلانا ہے..... جو ادارہ ماہنامہ ''دوشیزہ'' اور ''سچی کہانیاں'' کا ''کل'' تھے..... اور ساتھ ہی..... رخسانہ آنٹی، منزہ سہام، دانیال، زین کے علاوہ تمام اسٹاف کو سلام کے ساتھ سلامتی اور کامیابی کی دعا بھی دینی ہے..... جو ''آج'' کا استعارہ ہیں.....

احقر
بابر محبوب۔ کراچی

☆ بھائی جیسے دوست بابر محبوب! ''احوال'' کے لیے تحریر کردہ تمہارا یہ نامہ اور ''خیال'' بہت کمال ہے۔ سو دل کی آنکھ سے بار بار پڑھا..... خصوصاً غالب کا شعر..... تمہاری ''سوچ'' کے حوالے سے اپنے اندر بہت گہرائی اور گیرائی لیے ہوئے ہے..... سو میں اپنا جواب بھی محسن بھوپالی کے اس شعر پر تمام کرتا ہوں

کیا نشر میں رکھا ہے جو مدح ثناء حسن
اب کام کی باتیں بھی اشعار سے ملتی ہیں

اور اب اجازت
پھر ملیں گے گر خدا لایا
ناصر رضا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سرگودھا روڈ پر واقع وہ ایک گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول تھا، چک نمبر2، رام دیوالی جیسے پسماندہ علاقے کے اس اسکول میں اس روز خاصی گہما گہمی تھی۔ اسکول کی بچیوں کے چہرے خوشی سے سرشار تھے۔ اسکول انتظامیہ بھی حرکت میں آئی ہوئی تھی۔ انتظامات کا جائزہ لیا جارہا تھا۔ استانیاں بھی مسرور نظر آرہی تھیں۔ بچیاں اسکول کے اس حصے کی طرف پُراشتیاق نظروں سے دیکھ رہی تھیں جس کا افتتاح ہونے والا تھا۔ دراصل اس چھوٹے سے اسکول میں



ارفع کریم کمپیوٹر پر کام میں منہمک

کمپیوٹر لیب قائم ہوئی تھی اور بچیاں ان کمپیوٹرز کو قریب سے دیکھنے انہیں چھونے کے لیے شدید بے چین تھیں۔ ان کی بے چینی فطری تھی کہ ان غریب گھرانوں کی بچیوں نے کمپیوٹر کا نام تو سنا تھا مگر کبھی دیکھا نہیں تھا اور آج ان کے سرکاری اسکول میں کمپیوٹر کا شعبہ بن گیا تھا' تاہم بچوں کو اس شعبے میں جانے کی اجازت نہیں کیونکہ ابھی اس کا افتتاح ہونا باقی تھا۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور کچھ لڑکیاں اچک اچک کر اس کمرے کی کھڑکیوں سے اندر دیکھنے کی کوشش کررہی تھیں جسے کمپیوٹر لیب کا نام دیا گیا تھا۔ کچھ بچیاں اپنی ایک استانی کے گرد گھیرا ڈالے کھڑیں اسکول میں قائم ہونے والی اس کمپیوٹر لیب پر سوال بھی کررہی تھیں۔

''مس! یہ کمپیوٹر لیب حکومت نے بنائی ہے؟'' چھٹی جماعت کی ایک بچی نے پوچھا تھا۔

''نہیں بیٹا، یہ حکومت نے نہیں بنوائی ہے؟'' استانی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ہائیں، حکومت نے نہیں بنوائی تو پھر کس نے بنوائی ہے؟ ہمارا اسکول تو سرکاری ہے؟'' ایک اور بچی نے حیرت سے کہا۔

''ہاں بیٹا! ہمارا اسکول سرکاری ہے لیکن یہ لیب ایسی بچی نے بنوائی ہے جو آپ ہی کی طرح اسکول جاتی ہے۔'' استانی نے گویا انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

''کیا!!'' کئی بچیوں کی حیرت انگیز آوازیں بیک وقت ابھریں۔

''مس! وہ بچی کون ہے......؟ کہاں پڑھتی ہے......؟ کیا کرتی ہے؟'' آٹھویں جماعت کی ایک ہونہار طالبہ نے بے چینی سے کئی سوال کردیے۔

''ارے، ارے......صبر کرو، بس تھوڑی دیر میں وہ بچی آنے والی ہے پھر خود ہی اپنے بارے میں سب بتادے گی۔ ویسے اتنا جان لو کہ وہ پوری دنیا میں مشہور ہے کیونکہ وہ دنیا کی سب سے کم عمر مائیکرو سافٹ سرٹیفائیڈ پروفیشنل بن گئی ہے۔'' استانی نے گویا انکشاف کیا تھا۔

''مم......مائیکروسافٹ......یہ کیا ہوتا ہے؟'' ایک بچی نے معصومیت سے پوچھا تھا۔ جن بچوں کو کمپیوٹر کی الف ب بھی نہ آتی ہو اب انہیں کیسے سمجھایا جاتا کہ مائیکروسافٹ کس بلا کا نام ہے۔

''بھئی! اتنا سمجھ لو' یہ ایک قسم کا کمپیوٹر کورس ہوتا ہے۔'' استانی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد دانشمندانہ انداز میں معقول جواب دیا تھا کیونکہ سرکاری اسکول میں پڑھانے والی وہ استانی بھی کمپیوٹر کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی۔

اب بچیوں کو کمپیوٹر دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس بچی سے بھی ملنے کا اشتیاق ہوگیا تھا جس نے ان کے اسکول کو کمپیوٹر جیسی جدید نعمت سے آراستہ کیا تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ بچی اسکول میں داخل ہوئی تو تمام ہی طالبات اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ وہ ان ہی کی ہم عمر تھی بلکہ اکثر سے چھوٹی بھی تھی۔ بڑے بڑے اساتذہ کے جلو میں وہ



دو جینئس: ارفع کریم اور بل گیٹس

بہت اعتماد سے قدم اٹھاتی ہوئی لیب کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اسے لیب کا افتتاح کرنا تھا۔ لیب کے دروازے پر ''کریم کمپیوٹر لیب'' کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔ بعد میں بچیوں کو پتہ چلا کہ اس بچی نے لیب کو اپنے دادا کے نام سے منسوب کیا تھا۔ فیتہ کٹنے کے بعد جب بچیاں لیب میں داخل ہوئیں تو جدید کمپیوٹرز کو دیکھ کر ششدر رہ گئیں۔ وہ کبھی کسی کمپیوٹر کو چھو کر دیکھتیں تو کبھی ٹیچرز کی نظر بچا کر اشتیاق سے کی پیڈ کے بٹنوں کو دبا کر خوش ہوتیں۔ غربت میں جینے والی ان بچیوں کے لیے یہ کمپیوٹر کسی انوکھی چیز سے کم نہیں تھے۔ ان بچیوں کی حیرت اس وقت اور بھی سوا ہوگئی جب انہوں نے اس بچی کو ایک کمپیوٹر کو مہارت سے چلاتے ہوئے دیکھا۔ اس کی انگلیاں اس طرح کی پیڈ پر تھرک رہی تھیں جیسے یہ انگلیاں بنی ہی اس کام کے لیے ہوں۔ اتنی چھوٹی سی عمر اور یہ مہارت بچیوں کے ساتھ ساتھ ٹیچرز بھی پرشوق نگاہوں سے اس منظر میں گم تھیں۔

سب کو حیرت میں مبتلا کرنے والی یہ بچی ارفع کریم تھی جس نے اپنے آبائی گاؤں کے ایک سرکاری اسکول میں کمپیوٹر لیب بنوا کر ان نادار بچوں کی پہنچ تک کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے ثمرات پہنچانے کی کوشش کی تھی جو اس جدید اور اہم ترین ضرورت سے اتنے ہی دور تھے جتنے دور تیسری دنیا کے عوام بنیادی ضرورتوں سے ہیں۔

2 فروری 1995ء کو فیصل آباد کے ایک گاؤں رام دیوالی میں کشادہ پیشانی اور روشن آنکھوں والی ایک بچی کی پیدائش ہوئی تو کسے معلوم تھا کہ اس بچی کا سرمایۂ حیات اتنا مختصر ہوگا کہ وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے سے پہلے ہی موت کی آغوش میں جا سوئے گی





Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور یہ بھی کسی کے گمان میں نہیں تھا کہ اپنی مختصر ترین زندگی میں وہ ایسا کارنامہ انجام دے جائے گی کہ ایک عالم ورطۂ حیرت سے گنگ رہ جائے گا۔ وہ والدین کی پہلی اولاد تھی لہٰذا ان کا خوش ہونا فطری امر تھا لیکن دادی کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ وہ اپنی پوتی کو دیکھ دیکھ کر نہال ہوئے جارہی تھیں پھر جوں جوں دن گزرتے گئے' دادی اور پوتی کی محبت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بچی کا نام ارفع رکھا گیا تھا۔ اب یہ نام گھر میں جس نے بھی تجویز کیا ہوگا' وہ شاید نہیں جانتا تھا کہ اس نام کے اثرات بچی کی زندگی پر کتنے گہرے پڑیں گے۔ ارفع کا مطلب نہایت بلند ہے اور وہ اپنے نام کی طرح عزت، شہرت اور ذہانت کی ان بلندیوں پر پہنچی تھی جس کا ارمان لیے بے شمار انسان زندگی کے اسٹیج سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

ارفع کا زیادہ وقت دادو کی آغوش میں گزرتا تھا۔ یوں اس کی ابتدائی تربیت میں دادو کا نمایاں دخل رہا۔ دادی کی گود میں ارفع کے شب و روز گزرنے لگے۔ ابھی وہ چھوٹی تھی کہ گھر والے اس میں خصوصی باتیں نوٹ کرنے لگے مثلاً سال بھر کی ارفع کی آنکھوں میں خاص چمک نظر آتی تھی اور جب اس نے بولنا سیکھا تو جو بھی بات سنتی تھی' اسے دہراتی تھی۔ اس کی یہ حیرت انگیز صلاحیت گھر والوں کے لیے اچنبھے سے کم نہیں تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا' یہ بچی غیر معمولی ذہانت کی مالک ہے۔ دادی نے اپنی پوتی کی ذہانت بھانپتے ہی اسے کلمے سکھانے شروع کردیے تھے۔ ارفع کے والد امجد کریم رندھاوا فوج میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر تھے اور ان دنوں اقوام متحدہ کی امن فورس میں اپنی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ چنانچہ گھر سے دور رہنا ان کی مجبوری تھی وہ جب بھی چھٹی پر گھر آتے تھے' انہیں اپنی بیٹی کے متعلق عجیب و غریب اور نت نئی باتیں سننے کو ملتی تھیں۔ اس بار جب وہ گھر آئے تو ان کی اماں نے ارفع کو گود میں دیتے ہوئے کہا تھا۔

''اے بیٹا! دیکھ تو سہی' ہماری بچی کتنی ہوشیار ہے۔'' اس وقت ارفع تقریباً دو برس کی ہو چکی تھی اور اپنی توتلی زبان سے پٹر پٹر بولنے لگی تھی۔

''چندا! ابو کو کلمہ سناؤ۔'' دادی کا کہنا تھا کہ ننھی ارفع نے ایک کلمہ نہیں بلکہ فرفر تمام کلمے سنا دیے یہی نہیں بلکہ اپنی توتلی اور میٹھی زبان سے وہ قرآنی دعائیں بھی سنا دیں جو دادی نے اپنی گود میں ہمکتی پوتی کو سکھائی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر کریم صاحب کے چہرے پر خوشگوار حیرت در آئی تھی۔ انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ بھلا دو ڈھائی سال کی بچی اور یادداشت کا یہ عالم۔ باپ نے یہ بھی مشاہدہ کیا کہ ان کی باکمال بچی جس آواز کو سن لیتی تھی' اس کی نقل کر لیتی تھی۔ ماں باپ کو اس بات کا ادراک تو ہو چکا تھا کہ ان کی بیٹی کوئی عام سی بچی نہیں بلکہ غیر معمولی ذہانت کی مالک ہے اور اس کی ذہانت کے پیشِ نظر اسے بھرپور توجہ کی ضرورت تھی اسی لیے کریم صاحب کی وہ رات سوچ و بچار کرتے ہوئے آنکھوں میں کٹی تھی۔ ان کی سوچوں کا محور اپنی ذہین بچی کا مستقبل تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ وقت اپنی بیٹی کے قریب رہیں تاکہ زندگی اور تعلیمی سفر میں اس کی رہنمائی کر سکیں۔ ارفع وہ ہیرا تھی جو کان سے برآمد تو ہو گئی تھی لیکن اگر اس کی تراش خراش میں ذرا بھی چوک ہو گئی تو وہ ہمیشہ بے وقعت پتھر ہی رہے گی۔ یہ فکر کریم صاحب پر حاوی تھی۔ ان کے خاندان میں تعلیم کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ ان کے والد نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی جس کا زندہ ثبوت وہ خود تھے کہ اعلیٰ تعلیم کے بعد فوج کے اعلیٰ عہدے پر ملک و قوم کی خدمت کر رہے تھے۔



اب وہ اپنی اولاد کو بھی شاہراہِ علم پر سرپٹ دوڑتا دیکھنا چاہتے تھے اور قدرت نے تو انہیں ارفع کی صورت ذہانت سے مالا مال بیٹی بھی عطا کر دی تھی۔ چنانچہ اب انہیں ایک ذمہ دار باپ کی حیثیت سے اپنے فرائض کو ادا کرنا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنی نوکری کی مجبوری کے باعث زیادہ تر گھر سے دور رہنے پر مجبور تھے۔ ایسے میں بچی کو مناسب وقت دینا قریب قریب ناممکن ہی تھا۔ وہ جتنے دن گھر میں رہے' اسی

مائیکروسافٹ ہیڈ کوارٹر کے دورے کے موقع پر ارفع کریم، بل گیٹس سے ملاقات کے دوران

کشمکش و پیچ میں مبتلا رہے مگر ان کی سمجھ میں اس مسئلے کا کوئی حل نہیں آیا چنانچہ وہ اسی پریشانی کے ساتھ دوبارہ ڈیوٹی پر چلے گئے۔

ارفع ابھی ڈھائی سال کی تھی کہ اس نے اسکول جانے کی ضد شروع کر دی۔ اسکول جانے کا شوق اسے ان بچوں کو دیکھ کر ہوا تھا جو صبح ہی صبح اجلی اسکول یونیفارم میں ملبوس شانے پر بیگ لٹکائے اسکول جا رہے ہوتے تھے۔ ارفع روز صبح ان بچوں کو اسکول کو جاتا اور دوپہر میں واپس آتا دیکھتی تھی۔ اسے اسکول جاتے یہ بچے اتنے اچھے لگتے تھے کہ ایک دن وہ اسکول جانے کا اصرار کرنے لگی۔ اس کی انوکھی فرمائش پر مما حیران بھی تھیں اور پریشان بھی۔ اتنی چھوٹی بچی کا اسکول جانے کی ضد کرنا حیرت ہی کی بات تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ اسکول میں تین سال سے کم عمر بچوں کا داخلہ نہیں ہوتا تھا لہٰذا مما نے کسی نہ کسی طرح اسے بہلا لیا مگر اگلی صبح جب اس نے اسکول جاتے بچوں کو دیکھا تو پھر بکھر گئی۔ اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ میں اسکول جاؤں گی۔ مما نے اسے کل کی طرح پھر بہلانے پھسلانے کی کوشش کی مگر آج وہ اتنی بضد تھی کہ کسی طرح مان کر ہی نہیں دے رہی تھی۔ آخر اس کی دادو کو یہ کہہ کر اسے چپ کرانا پڑا کہ پپا گھر آئیں گے تو ان کے ساتھ اسکول چلی جانا۔ اس طرح کچھ دن سکون سے گزر گئے۔ اس کے اسکول جانے کی ضد کی اطلاع اس کے ابو کو بھی کر دی گئی تھی۔ چند دن بعد کریم صاحب کی آمد ہوئی تو ارفع کا انتظار جیسے ختم ہو گیا۔ صبح ہوتے ہی اس نے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بابا کو جگا دیا تھا۔

''بابا.....! اسکول.....'' اس کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔

''اچھا بیٹا.....! چلتے ہیں لیکن تمہارے پاس تو اسکول بیگ ہی نہیں ہے۔ اس کے بغیر کیسے جاؤ گی؟'' بابا کی بات پر ننھی ارفع نے منہ بنالیا۔ ''چلو ایسا کرتے ہیں' پہلے بیگ لاتے ہیں۔'' بابا اسے لے کر گاڑی میں بازار چلے گئے۔ دو گھنٹے بعد جب دونوں باپ بیٹی کی واپسی ہوئی تو ارفع کے شانے پر اسکول بیگ لٹک رہا تھا۔ بالکل ایسا ہی اسکول بیگ جیسا وہ اسکول جانے والے بچوں کے کندھے پر لٹکتا ہوا دیکھتی تھی۔ بیگ پا کر وہ بہت خوش تھی۔ اب اسے شدت سے صبح کا انتظار تھا جبکہ ماں باپ سوچ رہے تھے۔ صبح کیا بہانہ کر کے اسے بہلایا جائے۔ صبح ہوئی تو ارفع نے جیسے اسکول جانے کا شور مچا دیا تھا۔ وہ بہت جلدی اٹھ کر تیار ہو گئی تھی اور امی ابو پریشان تھے اب کیا کیا جائے۔

''اوہو بیٹا! آج تو گاڑی خراب ہے؟'' بابا کو نیا بہانہ سوجھا۔ یہ سن کر ارفع مچل گئی اور اسے چپ کرانے میں کئی گھنٹے لگ گئے۔ اسی طرح روز کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اسے بہلا دیا جاتا تھا۔ مما بابا کے لیے صبح کا یہ وقت بہت ہی کٹھن ہوتا تھا۔ ارفع کی ضد سے وہ بہت پریشان تھے۔ ان کا بھی دل چاہتا تھا کہ اپنی ذہین بچی کو فوراً اسکول داخل کرا دیں مگر ابھی اس کے تین برس کا ہونے میں چند ماہ باقی تھے اور یہ دن دونوں کن کن کر کاٹ رہے تھے پھر جوں ہی وہ تین سال کی ہوئی' اس کے اگلے دن ہی ننھی ارفع کو داخلے کے لیے اسکول لے جایا گیا۔ وہ دن تو جیسے ارفع کے لیے حسین ترین دن تھا۔ بابا کے ساتھ گاڑی میں جاتے ہوئے وہ پھولے نہیں سما رہی تھی۔ اسکول میں جب اس کا داخلہ ہو گیا تو پرنسپل کے آفس سے نکلتے ہوئے اس کی نظر چند ایک کلاسوں پر پڑی جس میں بچے کتابیں کاپیاں کھولے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ارفع کا دل چاہا کہ وہ دوڑ کر جائے

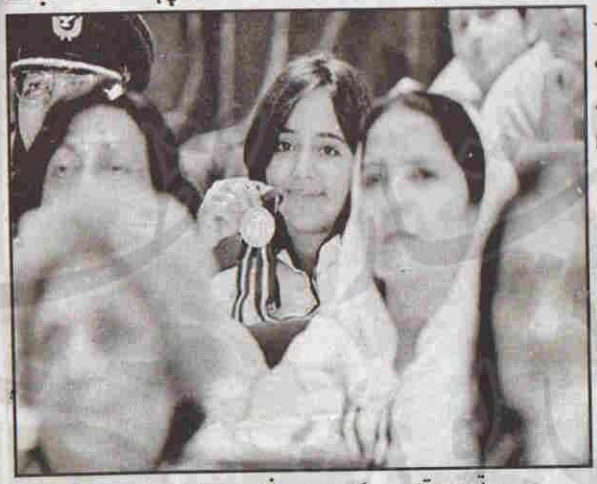

صدارتی ایوارڈ تقریب کے دوران ارفع اپنا میڈل دکھاتے ہوئے

اور ان کے ساتھ بیٹھ جائے مگر اسے ابھی ایک دن اور انتظار کرنا تھا۔

تعلیمی سلسلے کے آغاز سے ارفع کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا تھا۔ اسکول میں اس کی غیر معمولی ذہانت نے جلد ہی اساتذہ کو اپنی جانب راغب کر لیا۔ اس کے والد گاہے بگاہے اس کی اکیڈمک رپورٹ لینے اسکول جاتے تو ہر بار انہیں خوش کن باتیں پتہ لگتیں۔ اسکول والوں کے مطابق وہ اپنی عمر سے آگے کی بچی تھی۔ اسے جتنا پڑھایا سکھایا جاتا، اس سے آگے خود سیکھ جاتی تھی۔ علم کی ریس میں وہ



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سب سے آگے دوڑ رہی تھی۔ کلاس میں اول آنا تو
اس کے لیے کوئی بات ہی نہیں تھی۔ غیر نصابی
سرگرمیوں میں بھی وہ سب میں نمایاں نظر آتی تھی۔
فصاحت خوانی کے مقابلے ہوں، بحث و مباحثے کا
میدان ہو یا مختلف نوعیت کے گیمز ہوں۔ وہ ہر چیز
میں جیسے ماہر تھی۔ تعلیمی میدان میں آگے رہنے کا
مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ بس کتابی کیڑا تھی بلکہ وہ تمام
کام کرتی تھی جو اس کی عمر کے بچے کرتے ہیں' وہ
سائیکلنگ کرتی تھی' گالف کھیلتی تھی' ملی نغموں میں
حصہ لیتی تھی۔

اسکول میں اس نے کمپیوٹر دیکھا تو گھر آتے ہی
کمپیوٹر کی فرمائش کر دی اور ابو نے اسے ایک کمپیوٹر لا
کر دے دیا مگر وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ گھر
میں آنے والی یہ جدید ایجاد دنیا بھر میں ارفع کی
شہرت کا باعث بنے گی۔

اب کمپیوٹر تھا اور ارفع ہوتی تھی' اسکول ہو یا گھر'
وہ کمپیوٹر پر کسی نہ کسی کام میں مصروف ہوتی تھی۔ وہ
مشکل چار برس کی ہو گی اس عمر میں تو کمپیوٹر آن
آف کریں' یہی بہت ہوتا ہے جبکہ وہ کمپیوٹر پر گیم کھیلا
کرتی تھی اور کچھ بڑی ہوئی تو فائلیں اور فولڈرز وغیرہ
بھی بنانے لگی۔ وہ جب بھی کوئی نئی چیز سیکھتی' اپنے
ماما بابا کو ضرور دکھاتی اور وہ دونوں حیران رہ جاتے۔

پڑھائی کے دوران ہی اس میں چھپی ایک اور
حیرت انگیز صلاحیت نے سر ابھارا۔ وہ ابھی چھ برس
کی تھی کہ شاعری کرنے لگی۔ اس پر ایک خاص
کیفیت میں خیالات کی آمد ہونے لگتی تھی۔ اس کے
شعروں میں ردھم بھی ہوتا تھا اور فکر بھی۔ وہ نثری
نظمیں بھی کہتی تھی اور ایسے شعر بھی اس کے تخیل سے
پھوٹتے تھے جو عروض کی حد بندیوں اور ردیف'
قافیوں کے ضابطوں سے مزین ہوتے تھے مثلاً اس
کی زیر نظر معصوم سی نظم دیکھیے

دور کہیں تھا ایک پرندہ تنہا اور حیران
سوچ رہا تھا لوگ ہیں سب یہ کیوں اتنے نادان
جانتے ہیں آخر میں جانا ہو گا اس کے پاس
پھر بھی دل میں رکھتے ہیں یہ اس دنیا کی پیاس
یہ دنیا ہے اگلے جہاں میں جانے کی تیاری
اور بڑی جلد آئے گی سب لوگوں کی باری
سب کو اپنے رب کے سامنے دینا ہو گا حساب
یا پائے کا انسان جنت یا دیکھے گا عذاب

اسی طرح ایک نثری نظم ''سفید گلاب'' میں بھی
اس کے افکار و خیالات حیران کن ہیں۔

سفید گلاب کھڑا رہتا ہے طوفاں کے درمیاں
قیامت خیز لہروں کے درمیاں
مگر ثابت قدم رہتا ہے سفید گلاب
قیامت ارد گرد ناچتی ہے
پر وہ نہیں جھکتا
کتنا پاکیزہ ہے سفید گلاب
زمیں سے جڑا رہتا ہے تب بھی
جب سیاہ راتیں اسے ڈراتی ہیں
اے سفید گلاب تو میری آنکھوں سے دور سہی
پر میں تیری حفاظت کرنا چاہتی ہوں
مگر میرے پاس فقط لفظ ہیں
میں یہ لفظ اور شاعر کا دل تجھے بھیج رہی ہوں
تب تک قائم رہنا جب تک تجھے
دیکھنے کی اُمید باقی ہے
اے ننھے گلاب' مضبوطی سے جمے رہنا
تیرا دل تو سچائی سے معمور ہے
جب تک چاہو گے'
تم سے محوِ گفتگو رہوں گی

اس میں پلنے والے یہ فکر کی دولت سے مالا مال
خیالات یونہی نہیں پھوٹ رہے تھے بلکہ اس کا سبب
علامہ اقبالؒ کی فکر و فلسفے کا مطالعہ تھا۔ اتنی سی عمر میں


Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کا رجحان اقبالؒ کی شاعری اور ان کے مشکل فلسفے کی جانب ہو گیا تھا جو اپنی جگہ خود کسی اچنبھے سے کم نہیں تھا۔ اقبالؒ کی شاعری پر بڑے بڑے نقادوں اور اساتذہ نے کام کیا ہے اور سب ہی اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی شاعری میں پنہاں معنی در معنی کے سمندر میں غوطہ لگا کر اس میں سے فکر کے موتی کھوجنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ اس قول کے تناظر میں ایک چھ سات سالہ بچی کا اقبالؒ کی فکر و فلسفے کو سمجھ لینا کسی معجزے سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ وہ لاہور گرامر اسکول کے پیراگون کیمپس میں اے لیول کی اسٹوڈنٹ تھی یعنی ایک انگلش میڈیم اسکول کی طالبہ اس لحاظ سے تو اسے انگریزی ادب کی جانب راغب ہونا چاہیے تھا اور انگریز ادیب و شعراء اس کے فیورٹ ہونا چاہیے تھے مگر اس کا اقبالؒ کی شاعری کی طرف مائل ہونا حیران کن امر تھا۔ اس پر جب کوئی شعر یا نظم خیال کی صورت اترتی، وہ اپنے امی ابو کو ضرور سناتی تھی۔ بیٹی کی ذہانت کے قائل بابا مما دونوں اس کی شاعری پر حیران ہوا کرتے تھے۔ وہ اپنی شاعری فوراً کمپیوٹر میں محفوظ کرلیا کرتی تھی۔

جوں جوں اس کا تعلیمی سفر آگے بڑھ رہا تھا، والدین نے اس پر خصوصی توجہ دینا شروع کر دی تھی حالانکہ اس دوران ارفع کے دو چھوٹے بھائی بھی دنیا میں آ گئے تھے اور اسکول بھی جانے لگے تھے اور ماما ان میں گھر کر رہ گئی تھیں مگر اس کے باوجود انہوں نے ارفع کی طرف سے ذرا بھی توجہ نہیں ہٹائی تھی۔ وہ باقاعدگی سے اپنے تینوں بچوں کو خود اسکول چھوڑنے اور لینے جاتی تھیں۔ ان کے ہوم ورک اور دوسری چیزوں کا خیال رکھتی تھیں۔ ان کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا تھا مگر پھر بھی ارفع ان کی پہلی ترجیح رہی۔ اس کے بابا بھی چھٹی پر گھر آتے تو ارفع پر ان کی خاص نظر رہتی۔ وہ جب بھی اسے باہر لے کر جاتے مثلاً کہیں گھومانے وغیرہ یا کسی ریسٹورنٹ وغیرہ میں تو اسے مختلف چیزوں کے حوالے سے مفید معلومات دیتے رہتے تھے تاکہ ان کی ذہین بیٹی کو نصاب کے علاوہ بھی جنرل نالج حاصل ہو۔

دنیا و مافیہا سے بے نیاز ارفع..... زندگی کے آخری ایام

دن اسی طرح گزر رہے تھے۔ وہ تعلیمی مدارج طے کرتی ہوئی پانچویں کلاس میں آ گئی تھی اور ساتھ ہی کمپیوٹر میں اس کی مہارت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اسکول میں وہ اپنے ٹیچرز کے ساتھ کسی نہ کسی پراجیکٹ پر کمپیوٹر پر کام کرتی تو گھر میں بھی وہ مانیٹر کے سامنے بیٹھی کی بورڈ پر انگلیاں چلاتی یا پھر ماؤس پر ہاتھ رکھے کلک کرتی ہی نظر آتی۔ اس کی ماما اکثر ڈانٹ بھی دیا کرتیں کہ ہر وقت کمپیوٹر پر بیٹھنا اچھا نہیں ہے مگر وہ اس معاملے میں بے بس تھی۔ کمپیوٹر تو جیسے اس کا نشہ تھا، اس کا عشق تھا، اس کا وہ محبوب تھا جس سے لمحے بھر کی جدائی بھی اسے گراں گزرتی تھی۔ وہ اسکول کی چھٹیوں میں بھی اپنے اساتذہ کی زیر نگرانی صبح تا شام کمپیوٹر پر تحقیقی کام میں مصروف رہتی تھی۔ اس کی ٹیچرز اور ساتھی اسے کمپیوٹر چلاتا دیکھتے تو یہی کہتے کہ کمپیوٹر بنا ہی ارفع کی سوچ کے عین مطابق ہے۔ یہی



وہ تھی کہ کمپیوٹر سے وابستہ لوگ اس کے گرویدہ ہو گئے تھے مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ کمپیوٹر سے اس کا یہ والہانہ عشق اسے عزت و شہرت کے کس مقام پر پہنچانے والا ہے۔ اس کی ایک اور عجیب عادت تھی، ایسی عادتیں عموماً فلسفیوں یا دانشوروں میں پائی جاتی ہیں۔ رات کے وقت وہ اپنے گھر کے ٹیرس پر بیٹھی تارے دیکھا کرتی تھی۔ آسمان کی رفعتوں میں وہ کیا کھوجتی رہتی تھی، یہ تو اس نے کبھی کسی کو نہیں بتایا لیکن ان چمکتے تاروں کے حوالے سے اس نے اپنی ایک انگریزی نظم میں یوں اظہار خیال کیا ہے۔ (ترجمہ)

ایک ستارہ جل بجھتا ہے
تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے
کیونکہ ستارے لافانی ہوتے ہیں

تعلیمی منزلیں کامیابی سے سر کرتی ہوئی اب وہ پانچویں جماعت میں آ گئی تھی۔ ان ہی دنوں مائیکرو سافٹ کمپنی نے ایک مقابلے کا انعقاد کیا۔ واضح رہے کہ دنیا بھر میں کمپیوٹرز کو چلانے والے نظام ونڈوز، امریکی کمپنی مائیکروسافٹ کارپوریشن کی ایجاد ہے۔ اس کے انٹرنیٹ پر موجود نصاب کے تحت جو کوئی دنیا بھر سے اپنی اہلیت ثابت کرتا ہے اسے ''مائیکروسافٹ سرٹیفائیڈ ایپلی کیشن ڈیولپر'' کی سند عطا کی جاتی ہے یعنی مختصر الفاظ میں اسے MCP کہا جاتا ہے۔

چنانچہ جب مائیکروسافٹ کی طرف سے اس ٹیسٹ کا اعلان ہوا تو ارفع کے ٹیچرز نے اسے کہا کہ وہ اس ٹیسٹ میں حصہ لے۔ ارفع خود بھی اس مقابلے میں شامل ہو کر اپنی اہلیت ثابت کرنے کی خواہش مند تھی چنانچہ اس نے اس ٹیسٹ کی تیاری شروع کر دی۔ وہ اخلاص اور مستقل مزاجی کے ساتھ محنت کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ خدا سے اپنی کامیابی کی دعائیں بھی اس کے لبوں پر تھیں۔ دعا کرتے ہوئے اس کے ننھے لبوں پر بس یہی الفاظ ہوتے تھے۔ ''اے اللہ! اگر آپ کو میری کوئی نیکی یا کام پسند ہے تو میرے پیپرز اچھے ہو جائیں۔'' اسی طرح محنت اور دعاؤں کے ساتھ اس نے اپنے پیپرز مکمل کیے تھے۔

اس کے ٹیسٹ ختم ہو گئے تھے اور اب اسے اپنے رزلٹ کا انتظار تھا مگر اسے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ قدرت اسے کس مقام سے اسے نوازنے والی ہے۔ 13 نومبر 2004ء کو اس کے ٹیسٹ کا نتیجہ آیا تو وہ کامیاب قرار پائی تھی۔ ارفع کے لیے یہ خوشی بہت بڑی تھی مگر ابھی اسے اس سے بڑی خوش خبری ملنا تھی۔ اسے بالکل ادراک نہیں تھا کہ انجانے میں وہ کیا کارنامہ انجام دے بیٹھی ہے۔ وہ تو مائیکروسافٹ کا امتحان پاس کرنے پر ہی پھولے نہیں سما رہی تھی کہ 30 مارچ 2005ء کا سورج کچھ اس شان سے طلوع ہوا کہ آن کی آن میں ایک نو سالہ پاکستانی بچی کا دنیا بھر میں تہلکہ مچ گیا۔ اس دن مائیکروسافٹ نے ارفع کو دنیا کی کم عمر ترین مائیکروسافٹ پروفیشنل تسلیم کیا تھا۔ پوری دنیا ششدر تھی کہ ایک نو سالہ بچی نے کیسے یہ کارنامہ کر دکھایا اور وہ بھی اس ملک کی بچی نے جو شرح خواندگی کے حوالے سے شرم ناک درجے پر ہے، جہاں آئی ٹی کی تعلیم سمجھو نہ ہونے کے برابر ہے، جو ملک کرپشن، بدانتظامی اور دہشت گردی کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے، دنیا میں کہیں بھی کوئی دہشت گردی کا واقعہ ہو، تحقیق کے بغیر ہی سب کی نظریں اس ملک پر اٹھتی ہیں، جس ملک میں نہ جان محفوظ ہے تو نہ مال اور عزت کی ضمانت ہے۔ غرض ایسا ملک جس میں برائیاں بے شمار اور اچھائیاں اتنی قلیل کہ ڈھونڈے سے نہ ملیں، اس ملک کی بچی نے یہ کارنامہ انجام دے کر ایک عالم کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ دنیا اس کی ذہانت کے قصیدے پڑھ رہی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ دنیا بھر کا میڈیا اس کی جانب متوجہ ہوا تو پاکستانی حکومت بھی جیسے سوتے سے جاگ اٹھی، اسے مختلف اعزازات سے نوازا جانے لگا۔ 2 اگست 2005ء کو اسے فاطمہ جناح گولڈ میڈل دیا گیا تو 14 اگست کو سلام پاکستان ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 23 مارچ 2006ء کو اسے صدارتی اعزاز برائے حسنِ کارکردگی دیا گیا۔ وہ صدارتی ایوارڈ پانے والی سب سے کم عمر شخصیت تھی۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی' جولائی 2005ء میں مائیکروسافٹ کیمپس نے ارفع کو امریکہ کے چار روزہ دورے کی دعوت دی۔ وہ اپنے والد کریم رندھاوا کے ہمراہ امریکہ پہنچی تھی جہاں اسے مائیکروسافٹ ہیڈ کوارٹر کا دورہ کرایا گیا۔ دنیا اس روز مزید حیران رہ گئی جب 12 جولائی 2005ء کو عالمی شہرت یافتہ مائیکروسافٹ کے مالک اور سی ای او بل گیٹس نے اپنے دفتر میں ارفع سے دس منٹ ملاقات کی تھی۔ ایسا انسان جس کی زندگی کا ایک ایک سیکنڈ اہمیت کا حامل ہو' اگر وہ کسی نو سالہ بچی کو دس منٹ دے تو اس سے اس بچی کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

دنیا میں اس وقت ایک ہزار ایک سو پچیس کھرب پتی ہیں جن میں سے چار سو پچانوے کا تعلق امریکہ سے ہے۔ ان میں سے ایک بل گیٹس بھی ہے۔ کہا جاتا ہے بل گیٹس کی دولت میں ہر سیکنڈ 250 ڈالرز کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یعنی چوبیس گھنٹوں میں وہ 21.6 ملین ڈالرز کماتا ہے جو کہ ایک ارب 72 کروڑ 80 لاکھ روپے بنتے ہیں۔ گویا بل گیٹس کی دولت میں ایک ارب 73 کروڑ روپے روزانہ اضافہ ہو رہا ہے اسی لیے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے اگر اس کے ہزار ڈالر گر جائیں تو اسے وہ ہزار ڈالر اٹھانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اسے یہ رقم اٹھانے میں چار سیکنڈ لگیں گے جبکہ ان چار سیکنڈ میں اس کی دولت میں ہزار ڈالر کا ویسے ہی اضافہ ہو جائے گا۔ اس کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر وہ پوری دنیا کے لوگوں میں فی فرد 15،15 ڈالر تقسیم کرے تو اس کے باوجود اس کے پاس پانچ ملین ڈالر بچ جائیں گے۔ امریکہ اس وقت 7.3 ٹریلین ڈالرز کا مقروض ہے اور بل گیٹس تن تنہا دس سال میں امریکہ کا یہ سارا قرضہ ادا کرسکتا ہے اگر بل گیٹس کو ملک تسلیم کرلیا جائے تو وہ دنیا کا 35 واں امیر ترین ملک ہوگا اگر اس کی دولت کو ایک ایک ڈالر کے نوٹوں میں تقسیم کردیا جائے تو اس کی دولت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے 713 بوئنگ طیاروں کی ضرورت پڑے گی اگر بل گیٹس 35 برس تک اپنی دولت خرچ کرتا رہے تو اسے روزانہ 70 لاکھ ڈالر خرچ کرنا ہوں گے' تب کہیں جاکر اس کی دولت ختم ہوگی۔

بل گیٹس کے بارے میں یہ مختصر معلومات دینے کا مقصد یہ تھا کہ ایسا شخص جس کا ایک ایک سیکنڈ اتنا قیمتی ہو' وہ اگر کسی کو اپنی زندگی کے دس منٹ دے تو وہ شخصیت اس کی نظر میں کتنی اہمیت کی حامل ہوگی۔ بل گیٹس نے ارفع سے ملاقات کے بعد ارفع کو پاکستان کا دوسرا روپ قرار دیا تھا یعنی پاکستان کا ایک روپ تو وہ ہے جو پوری دنیا کے سامنے ہے اور جس پر ہم سب بحیثیت پاکستانی شرمندہ ہوتے رہتے ہیں جبکہ ارفع کی شکل میں پاکستان کا وہ روپ دنیا کے سامنے آیا جس پر ہر پاکستانی کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔

اس دورے میں امریکی میڈیا نے ارفع کے انٹرویوز بھی کیے جس سے ملک کے فخر میں اضافہ ہوا۔ امریکہ سے واپسی پر پاکستانی میڈیا نے بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ ہر روز اس کے انٹرویوز چینلز پر نشر ہونے لگے۔ پرنٹ میڈیا میں اس پر فیچرز لکھے جانے لگے یوں محض نو سال کی عمر میں وہ ملک



تھا۔ وہ اسی طرح اپنی کلاس میں دوستوں کے ساتھ گھل مل کر رہتی تھی' شرارتیں کرتی تھی۔ اسے دیکھ کر قطعی نہیں لگتا تھا یہ وہ بچی ہے جس نے دنیا میں دھوم مچا رکھی ہے۔ اس حوالے سے خود ارفع کا کہنا تھا کہ اس کے بابا اور مما نے اسے یہی سکھایا ہے کہ آپ جتنا منکسر المزاج ہوں گے' اتنی ہی دنیا میں کامیابیاں حاصل کریں گے۔

ارفع کی زندگی میں ایک تبدیلی یہ بھی آگئی تھی کہ اب وہ اسکول جانے کے ساتھ ساتھ آفس بھی جانے لگی تھی۔ یہ اس کے انکل کا آفس تھا۔ انہوں نے اپنی بھانجی کی کمپیوٹر میں دلچسپی دیکھتے ہوئے اسے اپنے آفس آنے کی باقاعدہ اجازت دیتی تھی جہاں وہ کمپیوٹر کلاسز میں لیکچر دیتی تھی۔ گویا وہ کم عمر ترین کمپیوٹر ٹیچر بھی بن گئی تھی۔

ارفع کو علم سے عشق تھا۔ وہ کہتی تھی۔ ''ہمارا ملک اس لیے پیچھے ہے کہ ہم نے تعلیم کو اہمیت نہیں دی۔ ہماری تاریخ میں صرف سرسید احمد خانؒ نے تعلیم پر کام کیا ہے۔ انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی قائم کی اگر

قومی پرچم میں لپٹا ارفع کا جسدِ خاکی آخری آرام گاہ کی طرف گامزن، وزیراعلیٰ پنجاب نمایاں ہیں

طرف اس کی مما نے بھی اپنی پرسنل لائف کو اہمیت دینے کی بجائے زندگی اپنے تینوں بچوں کے نام کر دی۔ مما کو صرف ارفع کی پڑھائی کی فکر ہوتی تھی اسی لیے انہوں نے کسی بھی قسم کا کوئی سماجی کلب جوائن نہیں کیا تھا یعنی والدین نے بچوں کی تعلیم کو اپنی ذاتی زندگی پر پہلے سے زیادہ ترجیح دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

ارفع ایک سلیبریٹی بن چکی تھی۔ ایک عالم میں اس کی ذہانت کے چرچے ہو رہے تھے مگر اتنی عزت ملنے کے باوجود اس میں ذرہ برابر بھی غرور نہیں آیا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا تو آج ہم ترقی یافتہ قوموں کی صف میں کھڑے ہوتے۔"

پاکستان میں آئی ٹی کی تعلیم کو عام کرنے کے لیے اس کے ذہن میں ایک زبردست آئیڈیا تھا۔ وہ بھارت کی سلی کون ویلی کی طرز پر ایک ڈجی کون ویلی بنانا چاہتی تھی جہاں پاکستان کے ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے نادار بچے نہ صرف آئی ٹی کی مفت تعلیم حاصل کرسکیں بلکہ انہیں مفت تمام طبی' تعلیمی اور رہائشی سہولتیں فراہم ہوں۔

وہ کتابوں کی شوقین تھی۔ زیادہ تر انگلش کتابیں پڑھتی تھی۔ کارٹون فلمیں بھی شوق سے دیکھتی تھی۔ کھانے میں اسے آلو اور چپس بے حد مرغوب تھے۔ وہ کہتی تھی کہ بچوں کو اپنی یادداشت کو ضائع نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ڈاکٹرز کے مطابق بڑے جو چیز ایک ہفتے میں سیکھتے ہیں' بچے اسے دس منٹ میں سیکھ لیتے ہیں اس لیے بچوں کو زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنا چاہیے۔

وہ دنیا کی کم عمر ترین MCP تو بن گئی تھی۔ اب اس کی تمنا تھی کہ وہ MCSC کا کورس مکمل کرکے ایک اور ورلڈ ریکارڈ قائم کرے۔ یہی نہیں' اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ اس کے چھوٹے بھائی بھی ایسا ہی ریکارڈ بنائیں تاکہ اس کا اور بھائیوں کا ریکارڈ کوئی نہ توڑ سکے۔ مستقبل میں وہ ہارڈورڈ یا ایم آئی ٹی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش مند تھی۔ اس کے علاوہ بھی اس کے نادر ذہن میں جانے کیسے کیسے کارہانے نمایاں انجام دینے کے منصوبے پل رہے تھے' کون کون سی آروزئیں اس کے ننھے سے دل میں کروٹیں لے رہی تھیں۔ آئی ٹی کی تعلیم کو گھر گھر پہنچانے کا خواب وہ جاگتی آنکھوں سے دیکھا کرتی تھی مگر اس کے تمام منصوبے، ساری آروزئیں اور سب ہی خواب تشنہ رہ گئے۔ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کی روشن زندگی کا دیا یوں بجھ جائے گا۔

22 دسمبر 2011ء کی ایک شب اچانک اس نے ماما سے کہا کہ اسے چکر آرہے ہیں۔ ماما نے سمجھایا کہ زیادہ پڑھنے اور کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے رہنے کی وجہ سے اسے ایسا محسوس ہورہا ہے۔ ممانے اسے کچھ دیر آرام کا مشورہ دیا جس سے طبیعت قدرے سنبھل گئی مگر یہ افاقہ کچھ دیر کا ہی ثابت ہوا اور اس کی طبیعت پھر سے بگڑنے لگی۔ اسے مرگی کا دورہ پڑا۔ وہ تمام رات اسی کیفیت میں مبتلا رہی۔ صبح تک جب اس کی حالت میں بہتری نہ آئی تو اسے ملٹری کمبائنڈ اسپتال میں داخل کرادیا گیا جہاں اسے دل کا دورہ بھی پڑا پھر وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اس نے اپنی ہنستی مسکراتی زندگی سے ناطہ توڑ لیا تھا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے آخری الفاظ تھے۔

"بابا.....! اب میں ٹھیک ہوں۔" اس نے یہ جملہ کہا اور کومے میں چلی گئی بلکہ کمپیوٹر کی زبان میں کہیں تو اس کی زندگی کا کمپیوٹر خود بہ خود shut down ہونا شروع ہوگیا تھا۔ اس کی بیماری کی خبر امریکہ میں موجود بل گیٹس کو ہوئی تو اس نے دنیا کے بہترین اسپتال میں بہترین علاج کی پیشکش کی لیکن ارفع کی نازک حالت کے پیش نظر اسے کسی اور جگہ منتقل کرنا ممکن نہیں تھا۔ ارفع جتنے دن موت سے لڑتی رہی' پوری قوم اس کے لیے سراپا دعا بن گئی۔ ایک روز اس کے ہاتھوں میں جنبش ہوئی تو دعا کرنے والوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ڈاکٹرز نے بھی اس کی حالت میں بہتری کی امید دلائی۔ اسے انتہائی نگہداشت میں رکھا گیا تھا اور مختلف نوعیت کی نلکیاں اس کے جسم پر لگی ہوئی تھیں جن کے ذریعے



اس کی زندگی کے چراغ کو بجھنے سے بچانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ اس کی چلتی سانسوں سے ہی اس میں زندگی کا احساس نمایاں تھا اور ڈاکٹرز سانس کے اس تسلسل کو قائم رکھنے کی کوشش کررہے تھے مگر یہ تمام کوششیں اس دن بے کار ہوگئیں جب 14 جنوری 2012ء کی ایک صبح ارفع کی سانسوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور وہ کومے کی حالت میں ہی اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ یوں 22 دسمبر کو اس کی زندگی کے کمپیوٹر کا جو shut down شروع ہوا تھا' وہ 26 روز بعد 14 جنوری کو مکمل ہوگیا۔

ارفع کی لائف ہارڈ ڈسک میں جانے ایسا کون سا وائرس آگیا تھا جس نے آن کی آن میں سانسوں کی window کرپٹ کرکے اس کی حیات کے سسٹم کو collapse کردیا۔ اس نے 16 سال کی مختصر زندگی پائی مگر وہ اس ستارے کی طرح جی جو بہت تیزی سے چمکا اور ٹوٹ کے بکھر گیا۔

ارفع کے لیے لفظ ذہین بہت چھوٹا لگتا ہے۔ اس کے لیے کوئی ایسا لفظ ہونا چاہیے جو اس کی ذہانت کی بھرپور تعریف کرسکے۔ ایک فارسی کہاوت ہے۔

بندگی بہ عقل است نہ بہ سال

یعنی دانائی' عقل سے ہوتی ہے' عمر سے نہیں۔

اس کہاوت کا مطلب سمجھنے کے لیے ارفع کی زندگی بہترین مثال ہے۔

ارفع کی وفات پر بل گیٹس کو شدید دھچکہ لگا تھا اور اس نے اپنے صدمے کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

"آج پاکستانیوں کی طرح میرے لیے بھی سیاہ دن ہے کہ آج مجھ سے میری شہزادی بچھڑ گئی اور پاکستانیوں سے ایک ذہین پاکستانی گم ہوگئی۔ میری شہزادی.....! میں تمہیں بھی نہیں بھول پاؤں گا۔ تم ہمیشہ میرے دل میں زندہ رہو گی۔"

ارفع کی نماز جنازہ لاہور کے کیولری گراؤنڈ میں ادا کی گئی جس میں وزیراعلیٰ پنجاب کے علاوہ ملک کی نامور شخصیات نے شرکت کی اور پھر ارفع اپنے گاؤں کے سفر پر روانہ ہوگئی۔ وہی گاؤں جہاں اس نے پہلی بار اپنی روشن آنکھیں کھولی تھیں۔ اس نے یہ سفر اس انداز میں کیا کہ سینکڑوں سوگوار اس کے ساتھ تھے اور اس کا جسدِ خاکی قومی پرچم میں لپٹا ہوا تھا اور بالآخر وہ اپنے گاؤں کی مٹی اوڑھ کر ہمیشہ کے لیے سوگئی۔ ایک روشن ستارا ٹوٹ کر گرا اور تہہ خاک چلا گیا۔

مجھے زندگی کی دعا نہ دے
میری زندگی سے بنی نہیں
کوئی زندگی پہ کرے یقیں
مجھے زندگی پہ یقیں نہیں

پاکستان پوسٹ کی جانب سے جاری کیا گیا
ارفع کریم کا یادگاری ڈاک ٹکٹ

ارفع عبدالکریم بظاہر آج ہم میں نہیں مگر وہ ہم میں ہے اور ہم میں رہے گی۔ اس نے ہمیں ایک سمت دی۔ اس نے اتنی سی عمر میں ہمیں ایک نام دیا لوگ اپنی زندگی آہستہ آہستہ سلگتے ہوئے بتاتے ہیں اس نے ایک بھڑکتے ہوئے شعلے کی طرح زندگی گزاری ہے۔

☆☆☆



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یوسف خان

# زرد پتوں کا بن

گل کا خیال

اعتراف اپنے گناہوں کا ہی کرلے کوئی
ظرف اتنا تو کسی شخص میں پایا ہی نہیں

**اس حیا باختہ کا ماجرا جس میں ایک پاکیزہ روح بسی ہوئی تھی**

لی مارکیٹ کیفے خیر آباد میں دوستوں کے سات بیٹھا چائے کے کپ پر طوفان اٹھا رہا تھا کہ شاہد نے ایوننگ اسپیشل آگے بڑھا کر ساری بات کا مزہ کرکرا کر کے رکھ دیا۔ میں نے اخبار پرے ہٹاتے ہوئے خشمگیں نگاہوں سے شاہد کی طرف دیکھا جس کے لبوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے بڑی ڈھٹائی سے اخبار کا سرورق پھر میرے آگے پھیلا دیا۔ دوسرے دوست بھی شاہد کی اس نامعقول حرکت پر ناگواری محسوس کرر ہے تھے۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اچٹتی ہوئی نگاہ اخبار پر ڈالی۔ چار نوخیز دوشیزاؤں کی تصویریں نمایاں تھیں جنہوں نے چادروں سے آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ خبر کچھ یوں تھی کہ ڈیفنس کے بنگلے پر پولیس کا چھاپہ، چار کال گرلز اور دو معزز عیاش گرفتار جبکہ دو فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک کال گرل فائزہ کی اسی شام کسی بااثر شخصیت نے تھانے ہی سے ضمانت بھی کرالی۔ میں ایسی خبروں سے ویسے ہی الرجک تھا، اوپر سے اچھی خاصی معقول گپ شپ میں شاہد کی بے جا مداخلت نے مزید سیخ پا کر کے رکھ دیا۔ میں اچھا خاصا سعادت حسن منٹو کے شاہکار افسانوں پر نقد و نظر کی بقراطیت جھاڑ رہا تھا۔ اب تو میں ہتھے سے اکھڑ گیا اور شاہد پر برس پڑا۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے؟"

شاہد بدستور بے ہودگی کا مظاہرہ کررہا تھا۔ دوسرے دوست بھی حیران تھے کہ آج اسے کیا ہو گیا ہے؟ اس نے سہ بارہ اخبار میرے سامنے میز پر بچھا دیا اور ایک خوبرو فاحشہ کی تصویر پر انگلی جما کر مخاطب ہوا۔

"اسے جانتے ہو؟"

اب تو میرے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔ کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور شاہد پر دھاڑا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تم نے بے شرمی کی انتہا کردی ہے۔ مجھ سے پوچھتے ہو کہ اسے جانتے ہو؟ آخر تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟"

میرے اس غیر متوقع ردعمل سے شاہد اور دوسرے دوست گھبرا گئے اور کیفے میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں نے بھی ہماری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ شاہد بری طرح جھینپ سا گیا اور میرے دونوں کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر بڑی لجاجت کے ساتھ مجھے کرسی پر بٹھانے کے لیے زور لگانے لگا اور کہنے لگا۔

"یار پلیز، کول ڈاؤن، بیٹھو تو سہی، تم نے تو یونہی بات کا بتنگڑ بنالیا۔ لوگ کیا سوچیں گے۔ بیٹھو، بیٹھو، میں تمہیں اصل حقیقت بتاتا ہوں، دراصل مجھے پہلے ہی وضاحت کے ساتھ بات کردینی چاہیے تھی۔ سوری یار، میرا طریقہ کار واقعی بڑا بھونڈا تھا۔ اب بیٹھ بھی جاؤ۔"

دوسرے دوستوں نے بھی موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے مجھ سے بیٹھ جانے کی درخواست کی اور میں بادل ناخواستہ بیٹھ گیا لیکن مارے طیش کے اب بھی میرا جسم کانپ رہا تھا۔ شاہد نے پانی کا گلاس بھر کر میرے آگے کیا اور ویٹر کو مزید چائے کا آرڈر بھی دے دیا۔ میں نے کپکپاتے ہاتھوں سے گلاس اٹھایا۔ دو تین گھونٹ لیے اور گلاس رکھ دیا۔ ناراضگی کے مارے میں شاہد کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اتنے میں چائے آگئی۔ اشرف نے چائے بنائی اور ایک کپ میری طرف سرکا دیا۔ دوسرے لوگ بھی اپنی گپوں میں مصروف ہو گئے جبکہ ہماری میز پر گمبھیر خاموشی طاری تھی۔ آخرکار شاہد نے میز پر رکھے ہوئے میرے ہاتھوں پر بڑی نرمی سے ہاتھ رکھے اور میرے ہاتھوں کو سہلاتے ہوئے کہنے لگا۔

"دیکھو مسٹر جذباتی، اب پوری بات سننے سے پہلے کوئی گڑبڑ نہ کرنا ورنہ میں اٹھ کر چلا جاؤں گا۔"



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسرے دوستوں نے بھی لقمہ دیا۔

''پوری بات تو سن لو آخر قصہ کیا ہے؟ کچھ تو ہے جو شاہد اس قدر بے تاب ہو رہا ہے۔''

دراصل ان کے ذہنوں میں بھی تجسس امڈ آیا تھا اور وہ خود بھی معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے بے تاب ہو چکے تھے۔ میں نے بھی ہونہہ کہہ کر اسے بولنے کی اجازت دے دی۔

شاہد نے پھر اس خوبرو حسینہ کی تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے ہیجانہ لہجے میں کہا۔

''کیا واقعی تم اسے نہیں جانتے؟''

اس سوال پر میں پھر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا لیکن اس بار کمالِ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں۔''

درحقیقت اب خود میں بھی حقیقتِ حال جاننے کے لیے مضطرب ہو چکا تھا۔ شاہد نے سوالیہ انداز میں ہاتھ کو گھماتے ہوئے خودکلامی کے سے انداز میں کہا۔

''حیرت ہے۔''

اس بار شعیب نے شاہد کی گدی پر ہلکی سی چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔

''شاہد، کچھ بکو گے بھی یا پہیلیاں ہی بجھواتے رہو گے؟ شرلاک ہومز کی اولاد، یہ سسپنس ختم کرو اور جو کچھ بتانا ہے، بلاتاخیر بتاؤ ورنہ اپنی دکان آگے بڑھاؤ۔ آگے ہی اچھی خاصی ادبی نشست کا تم ناس مار چکے ہو۔''

''بتاتا ہوں یار، بتاتا ہوں، ذرا دم تو لو چھری تلے.....''

یہ کہہ کر جو شاہد نے اس نازنین کا کچا چٹھہ کھولنا شروع کیا، اس کا احوال بیان کرنا شروع کیا تو میں دم بخود رہ گیا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ دیگر دوستوں کو تو دلچسپی کا ایک سامان ہاتھ آ گیا تھا، وہ بڑے مزے سے ہمہ تن گوش تھے اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے بظاہر شاہد کو تکتے ہوئے دور، بہت دور، پتہ نہیں کہاں پہنچ چکا تھا؟ شاہد تو اپنی چٹخارے دار کہانی کب کی ختم کر چکا تھا لیکن میں ابھی تک گم صم بے یقینی کے عالم میں اسے تکے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ شعیب اور اشرف نے بیک وقت مجھے جھنجھوڑا تو میں سر جھٹک کر خیالوں کی دنیا سے باہر آیا۔ شاہد نے بڑے فاتحانہ انداز میں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پھر سوال داغ دیا۔

''کیوں، اب بتاؤ، اسے جانتے ہو کہ نہیں؟''

میں پژمردہ سا ہو کر بولا۔ ''بہت اچھی طرح لیکن شاہد، ایک بات یاد رکھنا، اگر یہ اس گھرانے سے نہ ہوئی تو میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔''

شاہد بڑے یقین کے ساتھ بولا۔ ''مسٹر جذباتی، خوب اچھی طرح چھان بین کر لو۔ اگر یہ وہ نہ نکلی تو جو چور کی سزا، وہ میری۔''

اس بات پر میں نے ویٹر کو آواز دی، بل چکایا اور یوں ہماری محفل برخاست ہو گئی۔ اشرف اور شعیب بائیک پر نکل گئے۔ شاہد قریب ہی بھیم پورہ میں رہائش پذیر تھا۔ وہ خراماں خراماں پیدل چل پڑا اور میں دل میں عجیب سی پھانس لیے بوجھل قدموں کے ساتھ بغدادی جانے والی ویگن میں بیٹھ گیا کیونکہ میری رہائش وہیں تھی۔ میرے دماغ میں حیرت اور تاسف کے ایسے جھکڑ چل رہے تھے کہ مجھے کچھ پتہ نہ چلا کب میں نے کنڈکٹر کو کرایہ دیا، کب میرا اسٹاپ آیا، کب میں اترا اور کب گھر تک پہنچا؟

بغدادی لیاری کی ایک قدیم بستی ہے جہاں شاہ والی اللہ روڈ کی ایک جانب بلوچوں، کچھیوں، میمنوں، سندھیوں، پنجابیوں اور پٹھانوں کی ملی جلی آبادی ہے اور یہیں ایک کشادہ گلی میں 80 مربع گز کے دو منزلہ



مکان میں والدین کے ساتھ میری رہائش ہے۔ اس گلی سے پشت کی جانب دو گلیاں چھوڑ کر ایک وسیع و عریض کمیونٹی ہال کے بالکل سامنے ایک کال گرل کا گھر تھا جس کی تصویر آج اخبار میں ایک ایسی چونکا دینے والی بھیانک خبر کے ساتھ چھپی تھی جس نے میرے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ میں گھر پہنچ کر بھی گومگو کی کیفیت میں تھا۔ والدین یا بہن بھائیوں کے ساتھ اس بات کا تذکرہ کرنے کی جسارت تو سچی بات ہے، مجھ میں بالکل نہیں تھی۔ اس رات کھانا بھی کچھ اس بے دلی اور غائب دماغی کے ساتھ کھایا کہ گھر والوں نے بھی میری اس سراسیمگی کا نوٹس لیا۔ میں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنایا اور خلافِ معمول اوپری منزل میں اپنے کمرے میں جا گھسا۔ بستر پر گرتے ہی دماغ کی اسکرین پر گویا فلم چل پڑی۔

فائزہ کا تعلق ایک نہایت ہی شریف اور باپردہ فیملی سے تھا۔ مزید یہ کہ اسی گلی میں ان کی اپنی برادری کے آٹھ دس گھرانے اور بھی آباد تھے۔ فائزہ کی عمر یہی کوئی بائیس یا پچیس برس کی ہوگی۔ اتفاق سے میں اور فائزہ پرائمری تک ایک ہی اسکول میں زیرِ تعلیم رہے۔ چھٹی جماعت میں وہ گرلز اسکول میں داخل ہو گئی اور مجھے والد نے کھارادر کے ایک معروف اسکول میں بھیج دیا تھا۔ ایک ہی محلے کی پیدائش، پرائمری تک ایک ہی اسکول میں پڑھائی اور خاندانوں کے معمول کے تعلقات کے علاوہ میری یا فائزہ کی ایک دوسرے سے کسی قسم کی کوئی جذباتی وابستگی بھی نہ تھی۔ ویسے بھی سنِ بلوغت کو پہنچتے ہی پردے کی پابندی کے باعث فائزہ نے آٹھویں کلاس ہی سے برقع اوڑھنا شروع کر دیا تھا۔ فائزہ کے والد محلے میں حبیب سیٹھ کے نام سے مشہور تھے۔ وہ بڑے بااخلاق، ملنسار مگر خاموش طبع کے شریف انسان تھے۔ جامع کلاتھ میں ان کی کپڑے کی بڑی دکان تھی جو خوب چلتی تھی۔ گھرانہ خوشحال تھا، رہن سہن اور بود و باش خوب تھا۔ اکثر تہواروں یعنی عید، بقرعید، شبِ برأت کے موقعوں پر فائزہ کی والدہ خود کبھی مٹھائی، کبھی کھیر، کبھی سویاں اڑوس پڑوس میں دے کر آتیں جن میں ایک ہمارا گھر بھی شامل تھا۔ فائزہ کی والدہ کی عمر تو چالیس کے لگ بھگ تھی لیکن اچھی صحت، کھلتا رنگ، خوب صورت نقوش اور سبھاؤ کے باعث فائزہ کی بڑی بہن دکھائی دیتی تھی۔ فائزہ کے نین نقش بھی ماں پر ہی گئے تھے۔ بدقسمتی سے کوئی سات سال قبل فائزہ کے والد حبیب سیٹھ کو دکان پر ہی دل کا دورہ پڑا۔ قریبی دکانداروں اور نوکروں نے فوراً قریبی اسپتال پہنچایا مگر دل کا دورہ شدید تھا، گھر اطلاع پہنچنے سے پہلے ہی وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اچانک ان کی میت گھر پہنچی تو ایک کہرام بپا ہو گیا۔ ہنستے بستے گھر پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ قسمت کی ستم ظریفی تو یہ تھی کہ حبیب سیٹھ کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ فائزہ اس وقت میٹرک میں تھی اور سب سے بڑی تھی۔ عدیلہ، فائزہ سے دو سال چھوٹی اور نوشابہ، عدیلہ سے تین سال چھوٹی تھی۔ بیٹا نعمان سب سے چھوٹا تھا اور ابھی اس کی عمر صرف پانچ سال تھی۔

یہ پہلا اور آخری حادثہ تھا جو اس گھرانے کے حوالے سے میری یادداشت میں محفوظ تھا کیونکہ حبیب سیٹھ کی وفات کے بعد فائزہ کا گھرانہ بھی اپنی چہار دیواری میں سمٹ چکا تھا۔ اِدھر اُدھر سے اتنا ضرور پتہ چلا تھا کہ کپڑے کا اچھا خاصہ کاروبار نوکروں کے ہاتھوں تباہ ہو گیا۔ دکان اونے پونے بک گئی۔ فائزہ اور اس کی بہنوں کا تعلیمی سلسلہ بھی موقوف ہو گیا اور اس کی والدہ نے بھی اڑوس پڑوس میں آنا جانا ترک کر دیا۔ میں بھی میٹرک کا امتحان



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاس کر کے کالج کی مصروفیات میں ایسا الجھا کہ اس طرف کبھی دھیان ہی نہ گیا نہ کبھی اپنے گھر میں اس گھرانے کے حوالے سے کوئی چونکا دینے والی بات سنی۔ محلے میں ویسے ہی میرا اٹھنا بیٹھنا ذرا کم ہی تھا اور پھر اس گھرانے کے بارے میں چہ میگوئیاں ہوتی بھی کیوں؟ تینوں بہنیں اور ماں اب بھی باقاعدہ پردے کی پابند تھیں۔ کوئی مشکوک آمد و رفت دیکھنے میں نہیں آئی جو وہ موضوع بنتے۔ مکان کے سامنے کے حصے میں انہوں نے دو چھوٹی چھوٹی دکانیں نکال کر کرائے پر دے دی تھیں اور پھر ان کی رہائش بھی تو اپنی برادری ہی کے لوگوں کے درمیان تھی۔ وہ بھی یقیناً گاہے بہ گاہے ان کی کچھ مالی مدد کر ہی رہے ہوں گے۔ بستر میں دائیں بائیں کروٹیں بدلتے' تکیہ اوپر نیچے کرتے اسی ادھیڑ بن میں نہ جانے کب تک اپنے آپ سے ہی سوال و جواب کا کھیل کھیلتا رہا مگر کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر رہا اور نہ جانے کب نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

صبح میں عموماً دیر سے ہی اٹھنے کا عادی تھا کیونکہ اخبار کی ملازمت تھی اور دفتر شام چار بجے ہی پہنچنا ہوتا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب آنکھ کھلی۔ کسمساتے ہوئے اٹھا' شاور لیا اور ناشتے کے لیے نیچے اترا تو گھر میں جیسے کچہری لگی ہوئی تھی۔ چھوٹا بھائی کمال' والدہ اور بہنوں کے درمیان بیٹھا کسی واقعے پر پرجوش تبصرے میں لگا ہوا تھا۔ والدہ بار بار کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ' توبہ' قیامت کی نشانیاں ہیں بیٹا' اللہ! تو سب پر کرم کی نظر رکھنا' دہرائے جا رہی تھیں۔ میں حیران پریشان ان کے قریب پہنچا تو بغیر پوچھے بات سمجھ میں آ گئی۔ کمال کے ہاتھ میں وہی اخبار میرا منہ چڑا رہا تھا۔ میں نے غصے میں کمال کے ہاتھ سے اس بے دردی سے اخبار پر جھپٹا مارا کہ اس کے چیتھڑے اڑ گئے اور میرے ہاتھ میں فائزہ ہی کی تصویر والا ٹکڑا آ گیا جسے دیکھ کر ایک بار پھر میں سناٹے میں آ گیا۔ نہ جانے کیوں یہ لڑکی مجھے معصوم اور مظلوم دکھائی دے رہی تھی۔ خیر' میں نے جلد ہی اپنے آپ کو ہیجانی کیفیت سے باہر نکالا۔ بہنوں کو ڈانٹ کر کمرے میں بھیجا اور کمال پر برس پڑا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟ گھر میں ایسے واہیات اخبار لا کر ماں اور بہنوں کو پڑھا رہے ہو؟''

کمال تو سہم کر اٹھ گیا مگر امی فوراً بول اٹھیں۔

''ارے بیٹا! اخبار میں کام کرتے ہو اور اتنے بے خبر ہو؟ کچھ پتہ بھی ہے' وہ گلنار کی بیٹی نے کیا گل کھلائے ہیں؟''

میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''چھوڑیں امی! مجھے سب خبر ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے' اصل معاملہ کیا ہے؟ کسی کی بے بسی پر بلا تحقیق یوں رائے زنی ٹھیک نہیں ہوتی۔''

ماں پہلے سے زیادہ تیز آواز میں بولی۔

''لو' فوٹو تک تو چھپ گئے' اب اور کون سی تحقیق باقی ہے؟ یہ تم اخبار والے بھی خوب ہو' خود ہی کپڑے اتارتے ہو اور خود ہی چادر و چہار دیواری کی دہائی بھی دینے لگتے ہو؟''

میں لاجواب سا ہو کر اندر کمرے میں چل دیا۔ بہن کو ناشتہ لانے کو کہا۔ جیسے تیسے ناشتہ زہر مار کیا اور گھر سے باہر نکل آیا۔

گھر سے باہر تو نکل آیا مگر گلی میں ایک الگ ہی دنیا آباد تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا اہلِ محلہ نے آج سارے کام کاج تیاگ رکھے ہیں۔ بچے' بوڑھے' جوان جس زبان پر دیکھو' فائزہ کا کلمہ جاری تھا۔ ایک آدھ من چلوں کی ٹولی تو عوامی زبان میں اپنے بے ہودہ ارمانوں کا باقاعدہ ماتم تک کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ میں ان سب سے کنی کتراتا ہوا' بچتا بچاتا' سمٹتا سمٹاتا یوں گلی سے تیر کی طرح نکلا جیسے یہ



سارا گند مجھی پر اچھالا جا رہا ہو۔ میں خود اپنی اس کیفیت کا تجزیہ کرنے سے قاصر تھا حالانکہ فائزہ یا اس کی فیملی سے میرا کسی قسم کا جذباتی تعلق کبھی نہیں رہا پھر بھی اتنے بڑے اور گھناؤنے واقعہ کے بعد میرے دل میں اس گھرانے کے لیے ہمدردی کے جذبات نہ جانے کہاں سے امڈ آئے تھے۔ گلی سے باہر نکلتے ہی مین روڈ سے میں نے ایک آٹو رکشہ کو ہاتھ دیا اور اس سے پوچھے بغیر بیٹھ کر بدحواسی میں بول پڑا۔

''چلو۔''

رکشہ ڈرائیور مجھے عجیب نظروں سے گھورتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

''اڑے' بابا کی دھر چلو۔ جگہ و گہ کا نام تو بولو۔''

رکشہ ڈرائیور کے انداز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اپنے اوسان بحال کیے اور بولا۔ ''یار' معاف کرنا' میں ذرا پریشانی میں تھا۔ نیا آباد چلو۔''

حالانکہ نیا آباد کا علاقہ بغدادی سے پیدل کوئی سات آٹھ منٹ کی مسافت پر ہے لیکن دل و دماغ میں اٹھے طوفان نے مجھے ہوا کے گھوڑے پر بٹھا رکھا تھا۔ میں اڑ کر اپنے ایک دوست علی حیدر کے پاس پہنچنا چاہ رہا تھا جس کے پاس میری دانست میں میرے تمام سوالوں کے جواب تھے۔

رکشہ سے اتر کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا حیدر کے گھر کے سامنے پہنچا اور بیل پر انگلی رکھ دی۔ میری انگلی مستقل بیل پر جمی ہوئی تھی کہ انتہائی غصے میں بڑے زور کے ساتھ دروازہ کھلا۔ سامنے بنیان اور جانگیے میں حیدر غصے کے عالم میں سرخ سرخ آنکھیں نکالے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا غصہ کافور ہو گیا' چہرہ کھل اٹھا اور ہاتھ سے پکڑ کر مجھے اندر کھینچ لیا' گلے لگایا اور فرطِ مسرت میں کھینچتے ہوئے کہنے لگا۔

''یہ آج سورج مغرب سے تو نہیں نکل آیا؟'' پھر بڑے مضحکہ خیز انداز میں آنکھیں ملتے ہوئے بولا۔

''میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا؟ یہ سویرے سویرے جہاں پناہ کی سواری ہمارے غریب خانے پر؟''

میں نے مصنوعی غصے سے اس کا ہاتھ جھٹکا اور حکم دینے کے سے انداز میں کہا۔

''یہ حرکتیں چھوڑو' ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولو' جلدی سے باتھ لو' چینج کرو اور میرے پاس آ جاؤ' بڑا اہم اسائنمنٹ ہے۔''

علی حیدر نے بھی فرماں بردار خادم کی طرح کورنش بجالانے کے انداز میں جھک کر سینے پر ہاتھ رکھ کر ''بہتر حضور۔'' کہا اور ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر باتھ روم کی طرف دوڑ پڑا۔ علی حیدر دراصل پرکھوں کی چھوڑی ہوئی وراثت پر عیش و عشرت کی زندگی گزارنے والے عاقبت نااندیش نوجوانوں کی قبیل کا بڑا لاابالی' رنگین مزاج اور خوش طبع قسم کا انسان تھا۔ دیگر دوست تو ناؤ نوش اور راگ و رنگ کی محفلوں کے مزے لوٹنے کے لیے اکثر اس کے ہاں آتے جاتے رہتے تھے مگر میں شاذ و نادر ہی اس سے ملتا اور جب بھی ملتا' واعظ خشک کی طرح اس کی شتر بے مہار کی سی بے ڈھنگ اور بے ڈھب زندگی پر لعنت ملامت ہی کرتا رہتا اور اس کے مخدوش مستقبل سے اسے ڈراتا رہتا کو کہ وہ میرے پند و نصائح کو ایک ہی جاندار قہقہے میں اڑا دیتا مگر دیگر احباب کے مقابلے میں میرا احترام ضرور ملحوظ خاطر رکھتا اور میری آمد پر اسے واقعی بڑی خوشی ہوتی۔ حیدر کے والدین فوت ہو چکے تھے۔ بہن بھائی کوئی تھا نہیں۔ باپ کی چھوٹی موٹی جائیداد سے ہر ماہ کرائے کی معقول رقم آ جاتی تھی جو اللے تللوں میں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اڑ جاتی۔

میں علی حیدر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا بے دھیانی میں ایک دلگر قسم کے میگزین کے اوراق الٹ پلٹ رہا تھا کہ علی حیدر اپ ٹو ڈیٹ حالت میں ہاتھ میں چائے کی ٹرے لے کر داخل ہوا۔ چائے بناتے ہوئے میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھ کر کچھ فکر کے آثار اس کی پیشانی پر بھی بالآخر ابھر ہی آئے۔ سنجیدگی سے بولا۔

"آفتاب بھائی! خیریت تو ہے؟ کچھ پریشان پریشان سے دکھائی دے رہے ہو؟ گھر میں تو سب ٹھیک ہے نا؟"

میں نے چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے صوفے پر پہلو بدلا اور کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں، سب خیریت ہے۔ کل سے اس ایک تصویر نے عجیب سی الجھن میں ڈال رکھا ہے۔ سوچا، اس مسئلے کا حل تمہارے علاوہ کوئی اور نہیں نکال سکتا۔"

یہ کہہ کر میں نے اخبار کا وہ ٹکڑا اس کی طرف بڑھا دیا جو غصے میں، میں نے بھائی کے ہاتھ سے چھینا تھا اور فائزہ کی تصویر والا حصہ ہی میرے ہاتھ آ گیا تھا جسے میں گھر سے نکلتے ہوئے پھینکنے کے بجائے غیر ارادی طور پر جیب میں ڈال لیا تھا۔ حیدر نے جھٹ میرے ہاتھ سے وہ ٹکڑا لیا اور فائزہ کی تصویر کو بغور دیکھنے لگا۔ اگرچہ تصویر میں فائزہ نے آدھا چہرہ چادر سے ڈھانپ رکھا تھا مگر حیدر نے اسے پہچان لیا اور پہچانتے ہی فرط حیرت سے اچھل پڑا۔

"ارے آفتاب بھائی.....! یہ تو فائزہ کی فوٹو لگتی ہے، لگتی کیا ہے بلکہ دو سو فیصد وہی ہے، چودھویں کا چاند۔ تیرا بھائی بھی دو چار بار اس کی چاندنی میں نہا چکا ہے۔"

"اچھا، اچھا، اب اپنی یہ بکواس بند کرو اور غور سے میری بات سنو۔"

میں نے اسے تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا لیکن فائزہ میں میری دلچسپی دیکھتے ہوئے وہ حیرانی کے عالم میں بولا۔

"پر اس ماہتاب پر ہمارا سادھو کیوں لٹو ہوا جا رہا ہے؟"

میں نے گہری سنجیدگی کے ساتھ اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور فائزہ کے ماضی کی تمام روداد اختصار کے ساتھ سنا ڈالی اور اپنی دلچسپی کی وجہ بھی بتا دی۔ فائزہ سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے بھی یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ اس کے قریبی محلے اور میرے پڑوس میں رہتی ہے۔

"یار آفتاب بھائی.....! اس لڑکی کے لچھن اور پھر اپنے گھر کے معاملے میں احتیاط کا عالم کمال کا ہے۔ مجھ سے جب بھی اس کا میل ملاپ ہوا، ہمیشہ اسے بلوچ کالونی کے پل کے پاس ہی میں نے ڈراپ کیا۔ اچھا، یہ بتاؤ اب کرنا کیا ہے؟"

"یار علی.....! میں اس سے ملنا چاہتا ہوں، میرے دل میں ایک عجیب سی خلش ہے کہ اس قدر معزز، شریف اور پاکیزہ گھرانے کی لڑکی گندے جوہڑ میں کیونکر اتری؟"

"یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں باس، جب چاہو، بولو تو ابھی کنٹیکٹ کر لیتے ہیں؟"

"نہیں علی.....! تم ایسا کرو، کل شام پر رکھو۔"

"جیسے تمہاری مرضی باس، لیکن خیال کرنا، قتالۂ عالم ہے، کہیں ہمیں صراط مستقیم دکھاتے دکھاتے خود بہتی گنگا میں اشنان نہ شروع کر دو۔"

"یار، ایک تو میں تمہاری اس بک بک سے بہت بے زار ہوں۔ بہرحال تمہارا بہت بہت شکریہ۔ میرے سر سے ایک بڑا بوجھ تم نے اتار پھینکا ہے۔"

"یار، اسی لیے تو کہتا ہوں، کھوٹہ سکہ بھی کبھی کبھی کام آ ہی جاتا ہے۔ اب آئندہ مجھے کبھی نہ لتاڑنا۔



اگر میری یہ حرکتیں نہ ہوتیں تو آج بندہ پرور کہاں کہاں بھٹکتے پھرتے۔ آخر مان لیا ناں کہ آدمی ہیں ہم بھی بڑے کام کے۔"

میں نہ چاہتے ہوئے بے اختیار ہنس پڑا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ علی سے ملاقات کی جگہ اور وقت کا تعین کر کے اسے خدا حافظ کہا اور اپنے آفس کی طرف چل پڑا۔

رات کو گھر بھی دانستہ طور پر بہت ہی دیر سے پہنچا۔ گلی محلے میں سناٹا تھا اور گھر والے بھی سو چکے تھے۔ دراصل فائزہ سے ملے بغیر میں اس واقعے پر کی جانے والی ہر تنقید اور تبصرے سے بچنا چاہتا تھا۔ حسب معمول دوسرے دن تاخیر سے بیدار ہوا، نہا دھو کر ناشتہ کیا۔ کل کی برہمی کے باعث اس موضوع پر مجھ سے گھر کے کسی فرد نے بھی گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھی اور یوں میں مزید کسی ذہنی کوفت کا شکار ہوئے بغیر گھر سے نکل پڑا لیکن آج گھر سے نکلتے ہوئے میں عجیب سی کیفیت میں مبتلا تھا۔ سوالات کے تانے بانے بُنتا ٹیکسی میں بیٹھا اور حسن اسکوائر کے قریب شاہ زیب ریسٹورنٹ جا پہنچا جہاں علی حیدر نے پہلے ہی سے میرے لیے ایک سیٹ بک کرا رکھی تھی۔ شہر کی متوسط اور غریب آبادی کے سنگم پر شاہ زیب ریسٹورنٹ بھی کسی من چلے کے ذہن کی اختراع تھا کیونکہ اس قسم کی آبادیوں میں ایسے ریسٹورنٹ کا ہونا اچنبھے سے کم نہ تھا جہاں لڑکیاں ویٹرز تھیں۔ ملگجی روشنیوں میں ریسٹورنٹ کا اپر پورشن انتہائی پرسکون اور رومان پرور ہوتا ہے۔ میں تیزی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتا ہوا ریسٹورنٹ کے اپر پورشن کے ایک کارنر میں لگی ہوئی گیارہویں نمبر کی میز تک جا پہنچا۔ یہاں تک میری رہنمائی ریسٹورنٹ کی ایک دبلی پتلی تیکھے نقوش والی ویٹرس نے کمرشل مسکراہٹ کے ساتھ بڑے مہذب انداز میں کی۔ اس میز پر طے شدہ پروگرام کے مطابق دو نفیس کرسیاں آمنے سامنے لگی ہوئی تھیں۔ تیکھے نقوش والی ویٹرس نے ایک کرسی کے پیچھے کھڑے ہو کر بڑے مہذب انداز میں اسے پیچھے سرکا کر گویا مجھ سے بیٹھنے کی درخواست کی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا تو سامنے آ کر اس نے بڑے شائستہ انداز میں میرے آگے پلاسٹک کور میں ایک دیدہ زیب سی مینو بک رکھ دی۔ میں نے مینو بک ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی نہیں، میرے گیسٹ کو آنے دو۔"

اس نے او کے سر کہا اور چلی گئی۔ میں بڑی بے تابی کے ساتھ فائزہ کا انتظار کرنے لگا۔ اس پورشن میں کل چھے میزیں لگی ہوئی تھیں جو ایک دوسرے سے اس قدر فاصلے پر تھیں کہ قدرے بلند آواز میں کی گئی گفتگو بھی دوسری میز تک بمشکل ہی پہنچ پاتی۔ میرے دائیں ہاتھ کی طرف دو میزوں پر دو نوجوان جوڑے سرگوشیوں کے سے انداز میں عہد و پیماں باندھ رہے تھے۔ ریسٹورنٹ کے ہیجان خیز اور رومان پرور ماحول اور پھر فائزہ سے لڑکپن کے بعد پہلی بار ان حالات میں آمنا سامنا کرنے کے تصور نے ایئر کنڈیشنڈ روم میں بھی میری پیشانی کو عرق آلود کر دیا تھا۔ پونے پانچ بج رہے تھے اور ہماری ملاقات کا وقت پانچ بجے طے ہوا تھا۔ پندرہ منٹ، پندرہ برسوں پر محیط ہو چلے تھے حالانکہ یہی پندرہ برس پرائمری کی سنگت کے بعد آنِ واحد میں گزر چکے تھے۔ گھنٹوں انتظار کے بعد جب کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھا تو ابھی صرف پانچ منٹ ہی گزر پائے تھے۔ انتظار کے کرب کا اندازہ مجھے آج ہو رہا تھا۔ دو چار منٹ مزید انتظار کی کوفت سہنے کے بعد میں نے اسی تیکھے نقوش والی ویٹرس کو اشارہ کیا جو کم بخت دیدے مٹکا مٹکا کر مجھے ہی تکے جا رہی تھی۔ اشارہ پاتے ہی ندی کی طرح بل کھاتی لہراتی میرے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سر پر آ پہنچی۔

"یس سر......"

میں نے مختصراً کہا۔ "واش روم پلیز؟"

اس نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ ایک ادائے دلبرانہ سے میری پشت سے کچھ فاصلے پر لٹکے ایک نیلے رنگ کے دبیز پردے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ واش روم پردے کے اس طرف ہے۔ میں اٹھا اور واش روم کی طرف چل پڑا۔ بیسن کی ٹونٹی کھول کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، رومال سے منہ صاف کیا، بال سنوارے اور ہونقوں کی طرح وہیں ٹہلنا شروع کر دیا۔ جب کسی اور صاحب کے قدموں کی چاپ اس طرف آتے سنی تو ٹائی درست کرتے ہوئے مڑا۔ جیسے ہی اپنی میز کی طرف بڑھتے ہوئے سامنے نظر پڑی تو قدم جہاں تھے، وہیں رک گئے۔ بلیک جینز پر مختصر سی پھول دار شرٹ میں ملبوس ایک حسین و جمیل چہرہ ماحول سے بے خبر میز پر دھرے ایک چھوٹے سے ہینڈ بیگ پر مخروطی انگلیوں کو یوں حرکت دے رہا تھا جیسے کوئی میوزیکل انسٹرومنٹ بجا رہا ہو۔ کانوں میں چاندی کے بڑے بڑے گول سے آویزے، گلے میں پتلی سی سونے کی زنجیر، بازوؤں میں پتلی پتلی دو سونے کی چوڑیاں، شانوں پر خشک بکھرے گیسو، کہاں وہ پانچویں جماعت کی ننھی سی مگر سرخ و سپید چہرے والی معصوم فائزہ اور کہاں یہ قتالۂ عالم۔ قدرت کا حسین شاہکار میری آنکھوں کو خیرہ کیے ہوئے تھا۔ کہاں پندرہ منٹ کا انتظار، پندرہ برسوں پر محیط ہوا تھا اور کہاں یہ پانچ قدم کا فاصلہ کئی سو میلوں پر پھیلا ہوا محسوس ہونے لگا۔ تمام تر ہمت و حوصلے مجتمع کر کے پہلا قدم ہی اٹھایا تھا کہ فائزہ کی جھیل جیسی شفاف آنکھیں گھنی پلکوں کے ساتھ اٹھیں اور جیسے ہی میرے سراپے پر پڑیں، حیران و ششدر رہ گئیں۔

اچھی خاصی بوکھلاہٹ اس کے چاند چہرے پر بدلی بن کر چھا گئی۔ اس نے بیگ سنبھالا اور کھڑی ہو گئی۔ میں اس کا ارادہ بھانپ گیا اور تیزی کے ساتھ اس کے قریب پہنچا۔

"فائزہ، پلیز، مجھے غلط نہ سمجھنا، تمہیں علی کے توسط سے یہاں بلانے کا مقصد وہ ہرگز نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔ اب ریسٹورنٹ میں کوئی تماشہ نہ بنانا۔ تم صرف پانچ منٹ کے لیے بیٹھ کر میری بات سن لو۔"

وہ بادل ناخواستہ بیٹھ گئی تو میری جان میں جان آئی۔ مقابل والی کرسی پر میں نے خود کو جیسے گرا دیا اور ٹھنڈی طویل سانس لی۔ دراصل میرے گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ برقع پوش ہونے کے باعث میں نے تو فائزہ کی نوخیز جوانی کو نہیں دیکھا تھا لیکن کبھی کبھار آتے جاتے وہ تو مجھے دیکھتی رہی ہو گی اور اچھی طرح چہرہ شناسا ہو گی۔

وہ میرے سامنے بیٹھی بیگ کے ہینڈل کو غیر ارادی طور پر توڑ مروڑ رہی تھی۔ وہ خاصی متذبذب حالت میں تھی کیونکہ اس قدر غیر متوقع صورت حال کا اسے قطعاً اندازہ نہ تھا۔ میرا اعتماد بحال ہو چکا تھا۔ میں نے گمبھیر آواز کے ساتھ اس کا نام لیا۔

"فائزہ......!"

اس نے روہانسی آواز میں "ہوں۔" کہہ کر آنکھیں اوپر اٹھائیں تو ان میں آنسوؤں کی نمی نمایاں تھی۔ اس نے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"تو تم بھی......"

میں نے فوراً اس کی بات کاٹی۔

"دیکھو فائزہ، میں پہلے وضاحت کر چکا ہوں کہ میں ایسا ویسا مرد نہیں ہوں۔ ابھی میرا مقصد واضح ہو جائے گا۔ تم پہلے خود کو سنبھالو پھر بات کرتے ہیں۔"

اتنے میں وہی تیکھے نقوش والی ویٹرس آن دھمکی مگر اس وقت اس کا آنا غنیمت تھا کیونکہ بات کو آگے بڑھانے کے لیے اس کا "آرڈر سر۔" کا جملہ مجھے بڑا خوبصورت لگا۔ میں نے فوراً اسے کولڈ کافی کا آرڈر دیا۔ وہ اوکے سر، کہتی اٹھلاتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے گلا کھنکارا اور دوبارہ فائزہ کو مخاطب کیا۔

"میرا نام یاد ہے؟"

اس بار وہ زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ دبی دبی سی آواز میں بولی۔

"آفتاب!"

"تعلیمی سلسلہ کہاں تک چلا؟" میں نے ماحول سازگار پا کر بات آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

اب وہ بھی سنبھل چکی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے بکھرے گیسوؤں کو سمیٹتے ہوئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"فضول سوالوں میں اپنا اور میرا وقت ضائع کرنے کی بجائے اصل مقصد کی طرف آؤ۔"

فائزہ کا یہ دوٹوک انداز میرے لیے قطعاً غیر متوقع تھا گو کہ اس کے چہرے پر اب بھی بلا کی معصومیت تھی اور وہ معاشرے کے کیچڑ زدہ تالاب میں اترنے کے باوجود تروتازہ کنول کا پھول دکھائی دے رہی تھی البتہ لہجے کی پختگی اور بے باکانہ انداز اس کے تلخ تجربات کا عکاس تھا۔ میں ایک بار پھر نروس ہو چکا تھا مگر خدا بھلا کرے اس تیکھے نقوش والی ویٹرس کا جو بروقت کافی لے آئی۔ میں نے کافی کا ایک مگ فائزہ کے سامنے رکھا۔ اس نے شکریے کے ساتھ مگ تھاما۔ میں نے اسٹرا کے ذریعے کافی کے دو چار سپ لیے اور ایک بار پھر اپنے اوسان بحال کر کے فیصلہ کن انداز میں فائزہ سے مخاطب ہوا۔

"ٹھیک ہے فائزہ! آمدم برسر مطلب۔ تمہیں یقین ہو یا نہ ہو، میں مزید تمہیں یا خود کو کسی الجھن میں ڈالے بغیر بلا کم و کاست بتا دوں کہ اخبار میں تمہاری خبر اور فوٹو چھپنے سے قبل تمہارا یا تمہارے گھر کے کسی فرد کا خیال تو کیا، واہمہ تک میرے ذہن کے کسی گوشے میں نہ تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس خبر نما حادثے نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور خود میں بھی نہیں جانتا کہ کس جذبے کے تحت میں علی کے توسط سے تمہارے سامنے بیٹھا ہوں، بس مجھے ایک خلش بے چین کیے دیتی ہے کہ کسی طرح اس سچائی کی تہہ تک پہنچوں جس نے تم جیسی معصوم لڑکی کو چراغ خانہ سے شمعِ محفل بنا کر بیچ بازار میں لا کھڑا کیا ہے؟"

میں فرطِ جذبات میں پتہ نہیں کیا کچھ بولتا چلا گیا لیکن فائزہ بے جان مورتی کی طرح احساس سے عاری سپاٹ چہرے اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے بس مجھے تکے جا رہی تھی۔ میرے خاموش ہونے پر بڑی زہرخند مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"مسٹر آفتاب......! اپنی نام نہاد عزت دار دنیا کے خول سے باہر نکل کر دل کی آنکھوں سے دیکھو تو اس شہر کے گلی کوچے میں تمہیں کوئی نہ کوئی فائزہ زرداروں کے پہلوؤں میں پگھلتی دکھائی دے گی۔ پارلیمنٹ میں ملک و قوم سے وفاداری کا حلف اٹھانے والے وزیروں سے لے کر کوتوالی تک بے بس حوا کی بیٹیوں کے لباس تار تار دیکھو گے تو تمہارا ایمان ڈگمگا جائے گا۔ اب تو سورج ڈھلتے ہی تمہاری شریف بستیوں کے نہ جانے کتنے چاند اپنے حصے کی چاندنی خیرات کرنے نکلتے ہیں۔ ایک فائزہ کی کہانی کھوج کر تم کون سا انسانیت کے ماتھے پر جھومر سجا لو گے؟ جانتے ہو، ہماری بھول بھلیوں کا ہر راستہ تنگ گلی تک جاتا ہے۔"





Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فائزہ کی تلخ نوائی نے ہمارے سماج کی جس منافقانہ روش کو بے نقاب کیا' اس نے مجھے لرزہ براندام کر کے رکھ دیا۔ میری زبان گنگ ہوگئی۔ اب میرے پاس کہنے سننے کو کچھ نہ تھا۔ میں نگاہیں نیچی کیے گم صم ایک مجرم کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ ہمارے اردگرد کی میزیں بھر چکی تھیں' کھنکتی چوڑیاں' نقرئی آوازیں' مترنم قہقہے' بتدریج بلند ہوتے چلے جارہے تھے مگر مجھے یہ سب خاک آلودہ اور خون میں نہلائی ہوئی متعفن زدہ لاشیں لگ رہی تھیں۔ ان چاند چہروں کے روبرو بیٹھے ہوئے امیرزادے ہوس کے انگاروں میں لوٹتے ہوئے خارش زدہ کتے لگ رہے تھے۔ خود مجھے اپنے آپ سے ابکائی آنے لگی تھی۔ میں پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا' کیا کہوں؟ کیا نہ کہوں؟ چرب زبانی کا غرور خاک آلودہ ہو چلا۔ فائزہ جس کی جوانی تجربات کی بھٹی میں تپ کر کندن بن چکی تھی' میری اس کیفیت کو بھانپ گئی' یکدم کرسی سے اٹھی' ہینڈ بیگ کھولا' اس میں سے برقع نکالتے ہوئے کہنے لگی۔

''آفتاب صاحب! کل مغرب کے بعد گھر تشریف لائیے گا۔ ہماری معزز برداری اور محلے کے چند شرفاء جن میں آپ کے والدِ محترم بھی شامل ہیں' ہمارے گھر اکٹھے ہورہے ہیں کیونکہ میرا راز طشت ازبام ہونے سے ان کی ناک کٹ چکی ہے' چادر اور چہار دیواری کا تقدس مجروح ہو چکا اور شریف زادیوں کی عزت کو خطرہ درپیش ہو چلا ہے لہٰذا وہ ہم بدکرداروں کو شریفوں کا محلہ چھوڑنے پر مجبور کریں گے۔ تم بھی یہ تماشہ دیکھنے چلے آنا' شاید تمہارے سوالوں کا تشفی آمیز جواب بھی مل جائے۔'' یہ کہہ کر وہ اسی دبیز نیلے پردے کے پیچھے چلی گئی جس طرف واش روم تھا۔

میں ہکا بکا ٹک ٹک دیدم' دم نہ کشیدم کی مثال بنا بیٹھا تھا۔ چند ثانیوں میں وہ جب واپس پلٹی تو سر سے پاؤں تک برقعے میں ملبوس تھی۔ بڑے اعتماد کے ساتھ ماحول سے بے نیاز مجھ سے کچھ کہے بغیر وہ نیچے جانے والی سیڑھیوں کی جانب چل دی اور آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ دیگر جوڑے بھی حیران و ششدر مجھے گم صم اور اس کے بدلے ہوئے روپ کو دیکھ رہے تھے۔ تیکھے نقوش والی ویٹرس بھی دیدے پھاڑے اُسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی پھر میں نے خود کو سنبھالا' تیکھے نقوش والی ویٹرس کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا' کافی کا بل ادا کیا' وہ بھی کچھ استفسار کے موڈ میں تھی لیکن پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی۔ مجھ میں بھی اب لوگوں کی متجسس نگاہوں کا سامنا کرنے کی تاب نہ تھی۔ میں تیکھے نقوش والی ویٹرس کو "keep the change." (باقی پیسے رکھ لو۔) کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور کسی مدہوش شرابی کی سی چال چلتا ہوا نیچے اتر آیا۔ فائزہ جا چکی تھی۔ میں نے بھی ٹیکسی پکڑی اور دفتر کی راہ لی۔

شام کو میں خلافِ معمول دیر سے جاگا۔ امی نے ایک دوبار جگانے کی کوشش کی تھی تو میں نے کہہ دیا کہ آج آفس کی چھٹی ہے۔

مغرب کے قریب نہا دھو کر نیچے اترا۔ میز پر کھانا لگا ہوا تھا۔ بہنیں اور بھائی امی کا اشارہ پا کر باہر صحن میں چل دیئے۔ امی میرے قریب کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔ کچھ دیر توقف کے بعد بولیں۔

''بیٹا.....! آج گلناز کے گھر کچہری ہے' تمہارے ابو کو بھی بلایا ہے۔ وہ مغرب کی نماز پڑھ کر سیدھے وہیں جائیں گے۔ تم بھی ذرا چلے جانا' کہیں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔''

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''ہاں' ہاں' مجھے معلوم ہے۔''

امی حیران ہو کر بولیں۔ ''تمہیں کیسے معلوم؟



اتنی رات گئے تو تم آتے ہو اور پھر ابھی سو کر اٹھے ہو؟''

میں اس غیر متوقع استفسار پر چونک سا گیا' فوراً پانی کے گلاس کا سہارا لیا اور گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے جواب کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔ دو تین گھونٹ بھرنے کے بعد ساری بات ان کے گوش گزار کر دی۔

''امی.....! سارا محلہ ان کے معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ جب اتنی بڑی بات کھل گئی تو ان کے گھر میں کچہری کی بات کیسے ڈھکی چھپی رہ سکتی ہے؟ آپ کہتی ہیں تو چلا جاؤں گا۔''

امی نے ایک بار پھر فائزہ کا قصہ چھیڑنے کی تمہید باندھی لیکن میرا موڈ دیکھ کر چپ سادھ لی۔ کھانے کے دوران ہی مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے ہاتھ دھوئے۔ کنگھا کیا اور فائزہ کے گھر کی طرف چل دیا۔ کوئی تین منٹ میں فائزہ کا گھر سامنے تھا۔ وہاں پہنچا تو عجیب ہی منظر تھا' گھر کے سامنے بچوں' بوڑھوں اور جوانوں کا مجمع لگا ہوا تھا' فقرے کسے جارہے تھے' الٹے سیدھے تبصرے ہورہے تھے' غیرت و حمیت کے جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ میں غصے سے پیچ و تاب کھاتا ہوا خود بخود بڑبڑانے لگا۔

'لوگوں کی بھی عجیب فطرت ہے' اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھتے' دوسروں کی آنکھ کے تنکے نکالنے پر تلے رہتے ہیں۔ ایک گھر میں آگ لگی ہے اور وہ جشنِ چراغاں سمجھ کر اچھل کود میں لگے ہوئے ہیں۔ اپنے گریبانوں میں جھانکنے کی کسی کو فرصت ہی نہیں ہے۔' یہی کچھ بڑبڑاتے ہوئے میں فائزہ کے مکان کے دروازے تک آ پہنچا۔ اندر جانے کی بجائے دہلیز پر کھڑے ہو کر میں نے دو چار معقول قسم کے نوجوانوں کو بلایا اور انہیں بڑی نرمی سے سمجھایا۔ بات اُن کی سمجھ میں آ گئی۔ انہوں نے باقی ماندہ مجمع کو وہاں سے ہٹا دیا تو میں مکان میں داخل ہوا۔ جونہی اندر داخل ہوا' فائزہ کا چھوٹا بھائی نعمان آگے بڑھا اور دائیں ہاتھ کی طرف واقع ایک کشادہ کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔

''بھائی جان.....! اُس طرف چلے جائیں۔''

غالباً بائیں جانب والے کمرے کی کھڑکی سے فائزہ نے مجھے دیکھ کر نعمان کو بھیج دیا تھا۔ کمرے میں فرشی نشست پر علاقے کے معززین چوہدری خادم حسین' واجہ اللہ بخش' خان دران خان' بابا مٹھل سائیں' مرزا اشتیاق اور میرے والد شیخ محبوب حسین براجمان تھے۔ ساتواں شخص شکل سے کچھ مانوس سا لگ رہا تھا مگر ذہن پر زور دینے کے باوجود میں اسے پہچان نہ سکا۔ گلناز بیگم کی آمد پر انکشاف ہوا کہ وہ ان کے دیور مجیب ہیں جو بھائی کی وفات پر آئے تھے اور تین ماہ رہنے کے بعد چلے گئے تھے۔ انہیں خصوصی طور پر معززین نے کندھ کوٹ سے بلایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد گلناز بیگم کی برادری کے چار بزرگ بھی تشریف لے آئے اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔ اس پنچائیت کے نمائندہ افراد کو دیکھ کر ان کے انتخاب پر میں عش عش کر اٹھا۔ مختلف قومیتوں کے حوالے سے محلہ تو کیا' پورے پاکستان کی نمائندگی موجود تھی۔ میرے دل سے ایک ٹیس اٹھی اور خیال آیا کہ کاش ہماری قوم کے تمام معاملات میں اگر اسی طرح منصفانہ نمائندگی کا معیار برقرار رکھنے کی دلچسپی دکھائی جاتی تو آج یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ اس دوران میری نظریں والد محترم کی نگاہوں سے ٹکرائیں تو میں نے محسوس کیا کہ وہ میری آمد پر خوش دکھائی نہیں دے رہے۔ بہرحال اب تو میں آ ہی چکا تھا۔ بھری پنچائیت میں وہ کچھ کہنے سے قاصر تھے۔ اسی اثنا میں خان دران خان نے گلناز بیگم کے دیور مجیب کو



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مخاطب کیا۔

''مجیب بھائی! بھابھی کو بلاؤ' ہم یہاں شادی کا کھانا کھانے نہیں آیا۔''

خان صاحب کی پکار پر دیگر حاضرین نے بھی اپنے قیمتی وقت کو بچانے کے لیے ہاں میں ہاں ملانی شروع کردی۔ میں نے دیکھا' مجیب کچھ گھبرایا گھبرایا سا لگ رہا تھا اور بھابھی کو بلانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ بڑی بے دلی سے اٹھا اور دروازے کے قریب پہنچ کر وہیں سے آواز دی۔

''نعمان بیٹا! امی کو بھیجنا۔''

اور پھر آ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ پنچائیت کے ارکان میں سے کوئی داڑھی میں خلال کر رہا تھا' کوئی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا' کوئی ٹوپی سیدھی کر رہا تھا' کوئی گھٹنوں میں سر دیئے بقراط بنا بیٹھا تھا۔ آج قدرت نے انہیں کسی مجبور و بے کس کی تقدیر پر انصاف کی مہر لگانے کا موقع جو فراہم کیا تھا۔ ایسے عالم میں گلناز بیگم سفید ساٹن کی شلوار اور پیلی چکن کی پھول دار قمیص میں ملبوس سر پر سفید چادر اوڑھے گلا کھنکھارتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ ماتھے پر دکھوں اور کرب کی سلوٹوں کے باوجود چہرے سے بلا کا وقار اعتماد جھلک رہا تھا۔ وہ میرے قریب ہی کچھ فاصلہ چھوڑ کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی کیونکہ میں پنچائیت کے ارکان سے ذرا الگ تھلگ بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں جان لیوا سناٹا طاری تھا۔ خدا جانے' یہ گلناز بیگم کی شخصیت کا رعب تھا یا پھر کھوکھلے ذہنوں کی کم ہمتی کہ چوہدری' واجہ' خان' سائیں' مرزا اور شیخ سب کی کھلی بندھی ہوئی تھی۔ وقفے وقفے سے ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھتے اور کن انکھیوں میں ہی ایک دوسرے کو پہل کرنے کی دعوت دیتے لیکن بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کی جسارت کوئی نہیں کر پا رہا تھا۔ آخر کار سکوت خود گلناز بیگم ہی نے توڑا۔ وہ رندھی ہوئی مگر پراعتماد لہجے میں بولی۔

''حبیب سیٹھ کے چہلم کے بعد سات سال کا طویل وقفہ گزار کر ایک بیوہ کی چہار دیواری میں پہلی بار محلے کے عزت داروں کی آمد کو میں باعثِ مسرت کہوں یا حبیب سیٹھ کی غیرت کے جنازے کا جلوس؟''

گلناز بیگم کے طرزِ تخاطب نے حاضرین کی سٹی گم کردی' انہیں جیسے سانپ سونگھ گیا۔ گلناز بیگم کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ معززین میں سے کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ بات کیسے اور کہاں سے شروع کی جائے؟ آخر میرے والد شیخ محبوب حسین نے حوصلہ پکڑا اور قریب بیٹھی گلناز بیگم کے دیور مجیب کو کہا۔

''مجیب بیٹا' کیچڑ میں پتھر اچھالنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تمہارا اس گھر سے گہرا تعلق ہے' تم خود ہی بھابھی کو بتا دو کہ فائزہ کے دلخراش واقعہ کے بعد یہ محلہ ان کے وجود کو مزید برداشت نہیں کر سکتا۔''

ابھی میرے والد کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ خان دران صاحب کی غیرت بھی جاگ اٹھی۔

''ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' ام اور بے غیرتی برداشت نہیں کرے گا۔''

چوہدری خادم حسین نے ہانک لگائی۔

''اوئے ..... آخر ہم بھی بہو بیٹیوں والے ہیں۔''

واجہ اللہ بخش دھاڑا۔ ''اڑے' اللہ قسم' ہم کو پہلے پتہ چلتا تو ٹین پٹڑ کب کا باہر ہوتا۔''

بابا مٹھل کیسے پیچھے رہتا' اس نے بھی دہائی دی۔ ''سائیں' اب سیدھا سیدھا ان کو چلتا کرو بس۔''

مرزا اشتیاق نے کروٹ لی۔ ''میاں' شریفوں کا محلہ ہے' یہ لچھن یہاں نہیں چلیں گے۔''

اب تو گلناز بیگم کی برادری کے چاروں بزرگوں



کو بھی زبان مل گئی۔ ''ہم تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے' ہماری تو ناک کٹ گئی..... سچ پوچھو تو ہم تو ساری زندگی یہ داغ لیے پھریں گے۔''

گلناز بیگم ایک ایک تبصرہ کو کا چہرہ غور سے دیکھتی' سنتی اور اندرونی کرب چھپانے کے لیے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیتی۔ میرے والد نے مجیب کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ اسے مخاطب کیا۔

''مجیب' اس سے پہلے کہ بات بگڑ جائے یا معاملہ آگے بڑھے' تم خود ہی ہماری ترجمانی کر لو تو بہتر ہے۔''

میں نے دیکھا' مجیب کے چہرے سے ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ کپکپا رہا تھا۔ میں اس کیفیت کی وجہ خاندانی غیرت و ناموس کی بربادی سمجھا لیکن جیسے ہی مجیب نے لرزتے ہونٹوں سے ''بھابھی!'' کہا' گلناز بیگم پھٹ پڑی۔ ان کے منہ سے الفاظ نہیں بلکہ آتش فشاں کا لاوا بہہ رہا تھا۔

''چپ..... بے غیرت..... خبردار جو مجھے بھابھی کہا۔ غلیظ انسان..... کس منہ سے تو اپنا ناپاک وجود لے کر اس گھر میں داخل ہوا ہے؟'' پھر وہ پنچائیت کو مخاطب کرتے ہوئے دھاڑی۔ ''محلے کے عزت دارو.....! سنو' جسے تم اپنا ترجمان بنا کر میرے سامنے کھڑا کر رہے ہو اور جو حبیب سیٹھ کا سگا بھائی اور میرا دیور ہے' اس گھر میں بے حیائی کا پہلا بیج اس شیطان نے بویا تھا۔ بھائی کی موت پر آنے والا یہ ابلیس..... آپ سب کو پتہ ہوگا' تین ماہ اس گھر میں رہا۔ دکان کی دیکھ بھال کے بہانے سارا کاروبار تباہ کر دیا۔ اچھی خاصی دکان اونے پونے بکوائی جس میں سے بعد میں مجھے پتہ چلا تین لاکھ روپے کمیشن بھی کھا گیا۔ میری جوان بیٹیوں اور معصوم بچے کے سوتے ہوئے راتوں کے پچھلے پہر میری خواب گاہ میں گھس آتا اور ہوس ناک خواہشوں کا اظہار کرتا۔ بچوں کے جاگ جانے کے خوف سے میں اس کی منت سماجت کرتی اور اس شرمناک فعل سے باز رکھنے کی اپنی سی کوشش کرتی۔ آخر اپنی عزت بچانے اور یتیم بچوں کے سہارے کی نیت سے میں نے اس مردود کی ہوس ناکیوں کو لگام دینے کے لیے اسے شادی تک کی پیشکش کر دی۔ یہ کچھ نرم پڑ گیا لیکن اس کا شیطانی ذہن کچھ اور منصوبے بنا رہا تھا۔ معاشی طور پر تو یہ ہمیں برباد کر ہی چکا تھا' اب کنگالوں کی سرپرستی کر کے وہ کیسے یہ بوجھ اٹھانے کی حماقت کرتا؟ ایک رات اس نے میری شادی کی پیشکش پر حامی بھر لی لیکن رات بھر منت سماجت کرتا رہا۔ میں لڑتے لڑتے تھک چکی تھی اور پھر اس کمینے نے مجھے آبرو باختہ کر ہی دیا۔ صبح ہوتے ہی یہ اپنے کوٹھ چلا گیا اور پھر آج منحوس صورت لے کر تم لوگوں کے بلاوے پر مجھے یہاں سے نکالنے آیا ہے۔ منصفو..... ! بتاؤ' اس کی کمینگی کی تم نے کیا سزا تجویز کی ہے؟'' گلناز بیگم کے منہ سے کفر نکل رہا تھا اور وہ لال بھبوکا شیرنی کی طرح دھاڑ رہی تھیں۔ تمام حاضرین دم سادھے بیٹھے تھے۔ مجیب کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو چکا تھا۔ گلناز بیگم دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ بند آنکھوں سے بھی آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ میرا دماغ بھی سن ہو چکا تھا' جی میں آئی کہ اٹھ کر مجیب کا گلا دبا دوں۔ اتنے میں خان دران صاحب گرجے۔

''پکڑو سالے کو..... مارو..... پولیس کے حوالے کرو.....''

مگر کوئی ہلچل پیدا ہونے سے پہلے ہی مجیب نے چھلانگ لگائی اور یہ جا' وہ جا..... کمرے میں سکوتِ مرگ طاری تھا۔ گلناز بیگم نے خود کو سنبھالا' سانسوں کے زیر و بم کو درست کیا اور پھر تھکی تھکی آواز میں فائزہ کو آواز دی۔ ایسا لگتا تھا کہ فائزہ اسی آواز



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی منتظر تھی۔ چند ثانیوں میں وہ بھی کمرے میں تھی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ فائزہ سرتاپا برقعہ میں ملبوس تھی۔ پیشانی اور چہرہ تک ڈھانپ رکھا تھا۔ صرف اس کی شفاف بلوریں آنکھیں گھوم گھوم کر کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ فائزہ نے کھڑے کھڑے پنچائیت کو مخاطب کیا۔

''میرا نام تو کال گرل پڑ چکا ہے۔ میرے سابقہ رشتے دارو.....! اب میں آپ عزت دار ہستیوں کو کس سلسلے اور رشتے سے پکاروں کیونکہ سابقہ رشتے تو آپ کی لج پال نگاہوں میں گالی بن چکے ہوں گے۔ بہرحال میں آپ حضرات کو اسی لقب سے مخاطب کروں گی جو بزعمِ خود آپ لوگوں نے اپنے لیے تجویز کیا ہے یعنی عزت دار منصف۔ اس محلے کی آبرو باختہ بیٹی..... اوہ نہیں سوری' کال گرل آپ کے روبرو ہے۔ مجھے دیگر معززین سے کوئی گلہ نہیں مگر اپنی برادری کے اِن چار بزرگوں سے چار باتیں ضرور کروں گی۔ فضل داد' رحیم الٰہی' میر افسر اور نور محمد صاحب! آپ لوگوں کو چاچا' ماما' تایا' بابا کہنے کی جسارت کیوں نہیں کی؟ اس کی وضاحت میں پہلے کر چکی ہوں۔ آپ سب نے بڑی رنجور آوازوں میں رونا رویا ہے کہ آپ کی برادری کی ناک کٹ چکی ہے۔ آپ لوگ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ زندگی بھر یہ داغ آپ کی پیشانیوں پر کلنک کا ٹیکہ بن کر جگمگائے گا۔ بالکل درست کہا بلکہ اس پوری کارروائی میں یہی ایک سچ تھا لیکن یہ سچ بھی تمہاری نام نہاد غیرت کی راکھ سے اپنے ناموس کی حفاظت کی خودغرض خواہش بن کر ابھرا ہے۔ میرے ابو' تمہارے سگے تھے۔ ان کی زندگی میں تمہارے کتنے گھروں کی احتیاجات کی تسکین ان کی دولت سے ہوئی' مجھ سے کچھ ڈھکا چھپا نہیں' میں تنگِ خاندان ہو کر بھی اس راز کی تشہیر نہیں کروں گی۔ آپ بزرگ آج اپنے گھروں میں جا کر اپنے نوجوان لاڈلوں کے دلوں کو ٹٹولیں جو رشتے میں ہمارے بھائی تھے۔ ابا کی وفات کے بعد شروع شروع میں ہمارے گھر میں اُن کی آمد و رفت کے پس منظر میں ان کی کون کون سی نفسی و سفلی خواہشات انگڑائیاں لے رہی تھیں اور ہم نے کس جبر و کراہ کے ساتھ بڑی خوش اسلوبی اور خوش دلی سے ان کے بدطینت ارادوں کے نیزوں سے اپنی آبرو کے وجود کو چھلنی ہونے سے بچائے رکھا۔ چچا کی کارستانی تو آپ لوگوں کے گوش گزار ہو چکی ہے' دکان بک جانے کے بعد میں نے ہمت پکڑی اور معصوم بہن بھائیوں کی کفالت کا ذمہ اٹھانے کے لیے گھر سے باہر قدم نکالا۔ ابو کے ہی ایک دیرینہ دوست جس کی ریکروٹنگ ایجنسی تھی' کے دفتر میں ٹائپسٹ کی نوکری کر لی۔ ابو کا وہ دوست جو ابو کی زندگی میں جب آتا یا ہم ابو کے ساتھ ان کے گھر جاتے تو ہمارے سروں پر ہاتھ پھیرتے اور بیٹی' بیٹی کہتے جس کی زبان نہ تھکتی تھی' بڑا احسان کیا۔ اپنے آفس میں نوکری دی اور گاہے بہ گاہے گھر کی چھوٹی موٹی ضرورتوں کے لیے رقم بھی بڑی فیاضی کے ساتھ فراہم کرتے رہے لیکن گھر میں سر پر دستِ شفقت پھیرنے والے اس مربی کی نگاہیں دفتر میں میرے جسم کے ابھاروں سے اوپر نہیں جاتی تھیں۔''

پنچائیت دم سادھے بیٹھی تھی۔ ادھر فائزہ ظلم کی داستان سناتے ہوئے اپنے برقعے کے بٹن کھولتی جا رہی تھی پھر یکدم اس نے نقاب نوچ پھینکی اور ایک جھٹکے سے برقع اتار کر سامنے بیٹھے ہوئے عزت داروں کے منہ پر دے مارا۔ سب بھونچکا رہ گئے۔ فائزہ پھر مخاطب ہوئی۔

''میرے شریف محلے کے عزت دارو.....! یہ برقع میں نے شریف محلے کی پردہ داری کے لیے حرز



جاں بنا رکھا تھا۔ ایک بیوہ ماں' دو بہنوں اور ایک معصوم بھائی کے پیٹ کا دوزخ بھرنے اور ان کی آبرو کی حفاظت کے لیے جبرِ مسلسل مجھ سے جو اذیت ناک اور شرمناک مشقت کرا رہا تھا' اس کا سایہ بھی میں نے اس محلے کے نوجوانوں پر نہیں پڑنے دیا کہ یہ میرے مرحوم غیرت مند باپ کا محلہ تھا۔ یہ میری جنم بھومی تھا جہاں میں نے رشتوں کے تقدس کا سبق پڑھا تھا۔ میری معصوم نگاہوں نے شرم و حیا کا درس لیا تھا۔ میں نے یہ لاج نبھائی اور خوب نبھائی لیکن قسمت کی ستم ظریفی کو میری یہ ادا بھی نہ بھائی اور میں چاند کے گہن کی طرح طشت از بام ہو گئی۔ میرے معزز محلے دارو.....! کان کھول کر سن لو..... میری ماں' بہنیں اور بھائی اسی محلے میں' اسی گھر میں رہیں گے۔ کوئی مائی کا لال انہیں یہاں سے نہیں نکال سکتا۔ یہ چہار دیواری میرے باپ کی بخشی ہوئی ہے' وہ اسی قلعے میں محفوظ رہیں گی۔ چادر میرے سر سے اتری ہے۔ تمہاری نام نہاد عزتوں کی تسکین اور بہو بیٹیوں کی عصمتوں کی لاج کی خاطر میں یہ محلہ چھوڑ رہی ہوں لیکن ڈنکے کی چوٹ پر اپنے گھر والوں سے ملنے آتی رہوں گی۔ ان کی کفالت اور عافیت کی خیر خبر لینے اور ہاں' آپ لوگوں کی تشریف آوری کا شکریہ۔ اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔''

پنچائیت کے تمام معززین فطری بزدلی کو وجود میں سمیٹے' ایک لفظ کہے بغیر ایک ایک کر کے چل دیئے۔ میں دانستہ رکا رہا۔ جب سب لوگ چلے گئے تو ماں بیٹی ایک دوسرے کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔ رونے کی آواز سن کر نوشابہ' عدیلہ اور نعمان بھی دوڑتے ہوئے چلے آئے اور انہوں نے بھی ماں بہن سے لپٹ کر رونا شروع کر دیا۔ میں اس صورتِ حال سے حواس باختہ سا ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے ماں بیٹی کو ایک دوسرے سے

## غزل

اُس کو تو رنگ و نور کا دھارا دیا گیا
مجھ کو بس ایک چھوٹا سا تارا دیا گیا

آنکھیں بھی دیں تو تپتے ہوئے ریگزار سی
دل بھی دیا تو درد کا مارا دیا گیا

ہم سے بھی دلبری کے تو دعوے کیے گئے
اوروں کو دوسرا ہی اشارہ دیا گیا

جب اٹھ کھڑا ہوا تو اٹھانے کو آئے ہو
کیا خوب ڈوبتے کو سہارا دیا گیا

کشتی بھی دی گئی تو شکستہ سی دی گئی
اور دور مجھ کو اتنا کنارا دیا گیا

جتنا بھی تھا اثاثہ مرا' ساتھ لے گئے
اک خواب بھی نہ مجھ کو دوبارہ دیا گیا

غزلیں تو میری چھاپی گئیں اہتمام سے
اور ایک بھی نہ مجھ کو شمارہ دیا گیا

محسن سلیم



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

الگ کیا' تسلی کے لیے کوئی لفظ ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ان کی حالت سنبھلی تو فائزہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔

''آفتاب صاحب.....!بہتر ہے'اب آپ بھی تشریف لے جائیں۔امید ہے' آپ کے دل کی خلش بھی دور ہوگئی ہوگی۔یہاں زیادہ دیر ٹھہر کر ہمارے لیے مزید کوئی گل نہ کھلائیں کیونکہ آخرکار آپ بھی اسی عزت دار محلے کی ایک شریف فیملی کا حصہ ہیں۔''

میں کچھ کہے بغیر تھکے قدموں کے ساتھ وہاں سے چلا آیا۔

فائزہ اب گلشن اقبال کے ایک لگژری فلیٹ میں منتقل ہوچکی تھی اور وہاں ایک معروف عزت دار کی غیر منکوحہ کی حیثیت سے بڑی آن بان کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔وقتاً فوقتاً بڑی دیدہ دلیری سے چمچماتی کار میں بغیر برقعے کے ماں اور بہنوں سے ملنے آتی۔ان کو معقول رقم دیتی' حال احوال لیتی اور چلی جاتی۔پنچائیت والے واقعہ کے بعد محلے کے کسی شریف زادے کی ہمت نہ ہوئی جو اس گھرانے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ہاں البتہ وہ پورے محلے میں اچھوت بن کر رہ گئے تھے۔گلناز بیگم کا شادی بیاہ اور موت مرگ کے مواقع پر بھی محلے کے کسی گھر میں آنا جانا ممنوع ہوچکا تھا۔وہ حبیب سیٹھ کے قلعے میں محصور ہوکر رہ گئے تھے۔

آخر یہ صورتِ حال کب تک برداشت ہوتی؟ ایک دن اہلِ محلہ نے دیکھا کہ ان کا سامان ایک ٹرک میں لادا جارہا ہے۔بعد میں پتہ چلا کہ فائزہ نے ان کے لیے ڈیفنس میں ایک کوٹھی خرید لی ہے اور انہیں وہاں منتقل کردیا ہے۔گلناز بیگم کے ڈیفنس منتقل ہوجانے کے بعد ایک بار پھر میں نے فائزہ سے ملاقات کی کوشش کی۔وہ بمشکل مجھ سے ملنے پر آمادہ ہوئی۔اب تو اس کے رنگ ڈھنگ ہی نرالے ہوچکے تھے۔شرافت کا پردہ چاک ہوجانے کا خوف اٹھ جانے کے بعد تو اس کے ناز و انداز ہی بدل چکے تھے۔اس بار میں نے اسے گناہ آلود زندگی ترک کرنے اور نئی زندگی شروع کرنے کا لیکچر پلانا شروع کیا کیونکہ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے جسم میں موجود پاک باز روح ابھی تک بدی سے سمجھوتہ نہیں کر پائی تھی۔میری گفتگو وہ بڑے انہماک سے سنتی رہی۔ کہیں کہیں اس کے گال دہکنے لگتے تو کبھی آنکھیں چمک اٹھتیں پھر اچانک وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے عالمِ بے خودی میں بولی۔

''مسٹر آفتاب.....!تقریر مت جھاڑو.....میرا پریکٹیکل تمہاری تھیوری سے بہت آگے نکل چکا ہے۔ اگر اخلاقی جرأت ہے تو ابھی میرا ہاتھ تھام کر اپنے گھر لے چلو اور اعلان کردو کہ تم مجھے اپنی شریکِ حیات بنا چکے ہو۔اگر سماج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی ہمت ہے تو آگے بڑھو۔''

فائزہ کی اس اچانک اور غیر متوقع پیشکش پر میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر رہ گیا۔سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ماں باپ' بہن بھائیوں' برادری' احباب اور پڑوسیوں کی مضحکہ خیز تصویریں میری نگاہوں کے سامنے یکے بعد دیگرے گھومتی چلی گئیں۔کرسی پر بیٹھے بیٹھے چکرا سا گیا۔فائزہ کی آنکھوں میں امیدوں کے سینکڑوں چراغ جل بجھ رہے تھے۔اس کی مرمریں بانہیں میرے وجود کے لنگر سے لپٹنے کو بے تاب تھیں۔کھلے سمندر کے تھپیڑوں سے عاجز کشتی لنگر انداز ہونا چاہ رہی تھی اور ادھر سہارا خود ڈانواں ڈول ہورہا تھا۔میں نے دونوں ہاتھ میز پر ڈال دیئے اور ہارے ہوئے جواری کی طرح نظریں جھکالیں۔

لائبہ مدثر شیخ

# جنونِ محبت

مہناز بٹ ناز کا خیال

جسے پیار سمجھی تھی میں بے خبر
وفا وہ نہ تھی تھا سراب نظر

**باغِ زندگی کی ایک نادان کلی کا قصہ وہ بھنورے کی محبت کا دم بھرتی تھی**

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے آج بھی اپنے کالج کا وہ پہلا دن یاد ہے جب میں بہت نروس تھی۔ سب ہی چہرے انجان تھے۔ اپنی کلاس میں جا کر تو میں بری طرح گھبرا رہی تھی۔ میرے ساتھ بیٹھی لڑکی نے مجھ سے میرا نام پوچھا' وہ مجھ سے دوستی کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اپنا نام بتایا اور اس سے نام پوچھا۔ اس نے نہایت ہی شائستگی سے اپنا نام عکاشہ بتایا۔ میں پہلی ہی ملاقات میں عکاشہ سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ لگتا تھا' وہ مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے سر پر اسکارف تھا اور چہرے پر نقاب۔ وہ میل ٹیچرز سے پردہ کرتی تھی۔ ہم باتوں میں مشغول تھے کہ ہمارے پروفیسر آریان آئے۔ ان کو دیکھ کر میری آنکھیں دنگ رہ گئیں۔ وہ لگ بھگ ستائیس سال کے نوجوان تھے۔ وہ پڑھانے لگے لیکن میں پڑھنے سے زیادہ اُن کی جاذب نظر شخصیت میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ خوش شکل' دراز قد اور عمدہ اخلاق کے حامل مردانہ وجاہت کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ میں تو انہیں دیکھتے ہی ان کی اسیر ہوگئی تھی اور پھر یہ پسندیدگی ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ میں نے ایک دن عکاشہ سے پوچھا۔

''تمہیں سر آریان کیسے لگتے ہیں؟''

''ہاں' وہ ایک اچھی شخصیت کے مالک ہیں۔'' عکاشہ نے سرسری سا جواب دیا۔ ویسے بھی وہ پڑھنے والی لڑکی تھی۔ اس نے کبھی ان باتوں پر دھیان نہیں دیا تھا۔

ایک دن میں حسبِ معمول ان کے پیریڈ کے دوران میں ان کی شخصیت کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک سر آریان کی آواز پر چونکی۔ وہ میرے قریب کھڑے مجھ سے کوئی سوال کر رہے تھے۔ میرا تو جیسے دل حلق میں آ گیا۔ میری گھبراہٹ پر انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''نیور مائنڈ۔'' اور آگے چلے گئے۔

عکاشہ نے کئی بار مجھ سے پوچھا کہ تم سر آریا سے اتنا کیوں ڈرتی ہو؟ ave some confidence. لیکن میں اس کے اس سوال پر مسکر کر رہ جاتی کیونکہ میرے پاس اس کا کوئی جواب تھا۔ میں اسے کہتی کہ وہ میرے فیورٹ ٹیچر ہیں عکاشہ نہایت ہی ہونہار اور با اعتماد لڑکی تھی اور میں اس کے بالکل الٹ تھی' اعتماد نام کی چیز تو میرے اند موجود ہی نہیں تھی۔

وقت اسی طرح گزرتا رہا اور ہمارے مڈٹر ایگزام شروع ہوگئے۔ پہلا پیپر بھی سر آریان کے سبجیکٹ کا تھا۔ میں ان کے دیئے گئے نوٹس پکڑ ان کی ذات کے متعلق سوچوں میں مشغول تھی کہ میری نظر ان کے نمبر پر پڑی جو نوٹس کے نیچے دیا گا تھا کہ اگر اسٹوڈنٹس کو کوئی پرابلم ہو تو رابطہ کر لیں نمبر دیکھ کر میں کھل اٹھی اور وہ گھڑی میری زندگی کی سب سے بڑی گھڑی تھی جب میں نے موبائل اٹھا اور سر کے نمبر پر کال کر دی۔ دوسری جانب سے سر آریان کی آواز سنائی دی۔

''ہیلو..... ہیلو.....'' میں نے گھبرا کر فون بند کر دیا پھر سوچا کہ سر ہی تو ہیں' بات کرنے میں کیا حرج ہے؟ کال دوبارہ ملائی۔

''ہیلو.....'' سر آریان نے کہا۔

''سر' میں آپ کی اسٹوڈنٹ ہوں' آپ سے ایک سوال پوچھنا تھا؟'' میں نے بمشکل کہا۔

''جی' کہیے۔'' سر آریان نے جواب دیا۔ میں نے نوٹس پر دیکھتے ہوئے سوال کیا اور انہوں نے جواب دے دیا۔

''تھینک یو سر۔'' اور میں نے فون بند کر دیا میں بہت خوش تھی کہ آج سر سے بات ہوئی۔ سارا رات انہی کے خیالوں میں گزر گئی اور تیاری دھری رہ گئی۔



اگلی صبح میں نے عکاشہ کو کال کے بارے میں بتانا چاہا لیکن پھر سوچا' وہ الگ قسم کی لڑکی ہے' اس سے بات کرنا مناسب نہ ہوگا پھر امتحان بھی گزر گئے اور اسی بے قراری کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان کو فون کر دیا۔

''ہیلو..... سر' میں آپ کی اسٹوڈنٹ بات کر رہی ہوں۔''

''جی' کہیے۔''

''سر' وہ..... وہ..... بس ویسے ہی کال کی ہے۔''

''خیریت؟'' سر نے پوچھا۔

''ہاں سر' میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ کیوں مجھے اتنے اچھے لگتے ہیں؟ میں ہر وقت آپ کے بارے میں کیوں سوچتی رہتی ہوں؟''

''یہ تو اپنے آپ سے ہی پوچھیے۔'' سر نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

''سر' شاید مجھے آپ سے محبت ہوگئی ہے..... یا پتہ نہیں.....'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اظہارِ محبت کر دیا۔

''ارے..... ایسا کیوں ہوتا ہے آپ کو؟''

''سر' میں نہیں جانتی' ایسا کیوں ہے؟ بس میں آپ کا ساتھ چاہتی ہوں۔ جس دن سے آپ کو دیکھا ہے' کچھ اچھا نہیں لگتا۔'' میرے اندر پتہ نہیں کہاں سے اتنی ہمت اور اعتماد آ گیا کہ میں نے سب کچھ کہہ ڈالا۔

سر ہنس دیئے اور بولے۔ ''اچھا تو کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ کا نام کیا ہے؟ اور آپ کس کلاس میں ہیں؟ کیونکہ میں تو کئی کلاسز کو پڑھاتا ہوں؟''

''جج..... جی' میرا نام ثمریزہ ہے۔ میں فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔'' میں یہ باتیں کر رہی تھی کہ مما کمرے میں آتی نظر آئیں۔ ''مما آ رہی ہیں' کل بات ہوگی۔'' میں نے فوراً فون بند کر دیا لیکن مما نے میرے ہاتھ میں موبائل دیکھ لیا تھا۔

''ثمریزہ' کس سے بات کر رہی تھیں؟''

''ک..... کچھ نہیں مما' وہ..... میں عکاشہ سے بات کر رہی تھی۔'' مما مسکراتے ہوئے باہر چلی گئیں۔

اگلے دن میں کالج گئی تو میرا موڈ بہت اچھا تھا۔ عکاشہ نے پوچھا۔ ''ثمریزہ' آج بہت خوش لگ رہی ہو؟''

''ویسے ہی..... آج موڈ اچھا ہے۔'' میں اسے کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی کیونکہ وہ میری اس حرکت سے ناراض ہو جاتی۔ ''اچھا عکاشہ' آج کل تمہاری معارج سے خوب گھٹ رہی ہے۔ دیکھو' تم مجھے چھوڑ کر کسی اور کو دوست مت بنانا۔''

''ارے' تمہیں کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟ ویسے معارج اچھی لڑکی ہے' اگر تم چاہو تو وہ ہماری دوست بن سکتی ہے۔'' عکاشہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا' یوں معارج سے ہماری دوستی ہوگئی۔ معارج واقعی اچھی لڑکی تھی۔ ہم تینوں کی دوستی وقت کے ساتھ ساتھ گہری ہوتی چلی گئی۔

اس رات میں بیڈ پر بیٹھی سر کے متعلق سوچ رہی تھی اور بار بار موبائل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ سر کو دوبارہ کال کروں' سو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے کال کر دی۔ بیل جا رہی تھی اور میرا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا' دوسری جانب سے سر آریان کی آواز آئی۔

''ہیلو.....''

''ہیلو سر' میں ثمریزہ..... جس نے چند دن پہلے آپ کو کال کی تھی۔''

''اوہ' تو آپ ہیں' کہیے؟'' سر مخصوص انداز میں بولے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''سر' آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا کہ کیا آپ بھی.....'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ارے' آپ کیا بات کر رہی ہیں؟ میں نے تو آپ کو دیکھا بھی نہیں نہ ہی آپ کو جانتا ہوں تو کیسے کوئی جواب دوں؟''

''سر' آپ نے مجھے دیکھا تو ہے۔ ہاں' پہچان نہیں رہے۔''

''ہاں' ایسا ہی ہے۔''

''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔'' میں نے جھٹ کہا۔

''کیسے؟''

''وہ ایسے کہ کل آپ کلاس میں یہ رول نمبر بولیے گا اور جو لڑکی اس نمبر پر پریزنٹ کہے' وہ میں ہوں گی۔'' میں نے اپنا رول نمبر انہیں بتایا۔

''او کے' ویری گڈ۔'' یہ کہہ کر سر نے کال آف کر دی۔

میں سادہ سی لڑکی تھی' کبھی کالج زیادہ بن ٹھن کر نہیں گئی تھی لیکن اس روز میں گھنٹوں شیشے کے سامنے اپنے آپ کو سنوارتی رہی تھی اور اچھی خاصی سج دھج کے کالج گئی تھی۔ عکاشہ اور معارج مجھے دیکھ کر دنگ رہ گئی تھیں۔

عکاشہ نے تو سرزنش کرنے والے انداز میں پوچھا تھا۔ ''میڈم' آج کوئی خاص بات ہے؟''

''نہیں یار' بس دل نے کہا کہ میں بھی ذرا سادگی سے نکل کر موڈرن بن جاؤں۔'' میری بات پر عکاشہ سرخ ہو گئی اور اس کا لیکچر شروع ہو گیا۔

''ثمریزہ' تمہیں پتہ ہے' اسلام میں کنواری لڑکی کو یوں زیب و زینت کی اجازت نہیں ہے اور ویسے بھی تم پردہ نہیں کرتی ہو' میل ٹیچرز کے سامنے بھی ایسے ہی آ جاتی ہو۔ زمانہ بڑا خراب ہے۔'' میں اس کی باتوں سے بور ہونے لگی تھی۔

''او ہو' عکاشہ' اب بس بھی کرو۔''

''نہیں ثمریزہ' مجھے بولنے دو اور ویسے بھی مجھے سر آریان کی نظریں اچھی نہیں لگتیں۔'' عکاشہ کی بات سن کر میں حیران رہ گئی کہ اس نے یہ بھی نوٹ کر لیا تھا۔ بہر حال میں نے اس سے جان چھڑائی اور ہم کلاس میں آ گئے۔ میں شدت سے سر آریان کے پیریڈ کا انتظار کر رہی تھی۔ خدا خدا کر کے وقت گزرا اور ان کا پیریڈ آ ہی گیا اور وہ کلاس میں داخل ہوئے۔ میں سنبھل کر بیٹھ گئی اور غور سے رول کال سننے لگی۔ جب میرا رول نمبر آیا تو میں نے اونچی آواز میں کہا۔ ''پریزنٹ سر۔'' سر آریان نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور کنفرم کرنے کے لیے کہ میں ہی ثمریزہ ہوں' دوبارہ میرا رول نمبر پکارا۔ میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دوبارہ کہا۔ ''پریزنٹ سر۔'' وہ کچھ دیر یونہی مجھے دیکھتے رہے۔ میں بدحواس سی ہو گئی کہ لڑکیاں کیا سوچیں گی' میں نے نظریں جھکا لیں اور سر نے پڑھانا شروع کر دیا۔ پڑھاتے ہوئے وہ چور نظروں سے مجھے دیکھتے رہے تھے اور میں دل ہی دل میں جیسے ناچ رہی تھی۔ اچانک عکاشہ نے مجھے کہنی ماری اور سرگوشیانہ انداز میں پوچھا۔

''آج سر آریان تمہاری طرف اتنا کیوں دیکھ رہے ہیں؟'' میں بوکھلا گئی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی' معارج بولی۔

''آج ثمریزہ پیاری بھی تو بہت لگ رہی ہے۔'' اس کی بات پر میں نے مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔ خیر' وہ دن گزر گیا اور رات آ گئی۔ میں عموماً رات دس بجے کے بعد ہی سر سے بات کرتی تھی۔ میں نے سر کا نمبر ڈائل کر کے موبائل کان سے لگایا۔ میرا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا اور یہ جاننے کو بے قرار تھا کہ سر کو میں کیسی لگی؟ میرے خیالوں کا سلسلہ سر کو ہیلو کہنے پر ٹوٹا۔



''ہیلو سر' کیسے ہیں آپ؟''

''ٹھیک ہوں' آپ کیسی ہو؟''

''سر' میں ٹھیک ہوں' آپ بتائیں' میں کیسی لگی آپ کو؟''

میرے سوال پر سر اپنے مخصوص انداز میں ہنس دیئے اور بولے۔ ''آ..... سچ پوچھیے تو آپ تو میرے دل کو بھا گئیں۔ آپ واقعی بہت نازک اور خوبصورت ہیں۔'' سر کی تعریف پر میں دل ہی دل میں جھوم اٹھی۔ ''آپ کے بال تو کالی گھٹاؤں جیسے ہیں۔'' میں یہ سن کر خوشی سے نہال ہو گئی۔ آج سے پہلے کسی نے میری اتنی تعریف نہیں کی تھی' میں گم صم سی ان کی باتوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ انہوں نے پوچھا۔

''ثمریزہ' آپ سن رہی ہیں؟''

''ج..... جی..... سر' میں سن رہی ہوں۔'' میں نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''سر' کیا واقعی میں آپ کو اتنی اچھی لگی؟''

''کوئی شک ہے؟''

''نہیں سر' تو اس کا مطلب..... آپ بھی مجھ سے.....''

''مجھے تو پہلی نظر میں ہی آپ سے محبت ہو گئی.....'' سر کے اس جملے پر میں خوشی سے پاگل ہو رہی تھی کہ جسے میں نے چاہا' اس نے بھی مجھے پسند کر لیا تھا۔

''سر' مجھے بھی آپ سے پہلی نظر والی ہی محبت ہوئی ہے' جب آپ پہلے دن کلاس میں آئے تو جانے کیوں ایسا لگا' آپ ہی میرے پرنس چارمنگ ہیں۔'' سر ہنسنے لگے۔ ''اچھا سر' میں اب رکھتی ہوں۔ کل ممانہ آ جائیں۔'' اور میں نے کال ڈسکنیکٹ کر دی۔

میرا دل خوشی سے جھوم رہا تھا کہ سر بھی مجھے پسند کرتے ہیں۔ میرا دل چاہا کہ عکاشہ کو اس بارے میں بتاؤں' آخر کو وہ میری بیسٹ فرینڈ تھی' میں اس سے ہر بات شیئر کرتی تھی لیکن پھر خیال آیا' معارج کو بھی بتانا پڑے گا' اس طرح بات پھیل جائے گی اور سر کی اور میری بدنامی ہو گی۔ ساری رات میں سوچتی رہی کہ عکاشہ کو کیسے بتایا جائے؟ پھر ایک فیصلہ کیا اور سو گئی۔

اگلے دن کالج میں میری ملاقات عکاشہ سے ہوئی تو میں اسے ایک طرف لے گئی اور پرجوش انداز میں اس سے کہا۔ ''عکاشہ جانی' میں نے تم کو بہت اہم بات بتانی ہے' صرف اور صرف تم کو۔''

''ثمریزہ' ایسا بھی کیا ہوا ہے اور بات جو بھی ہے' تم معارج کو نہیں بتانا چاہتی؟'' اس نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''عکاشہ' میں اپنی اور ان کی بدنامی نہیں چاہتی۔''

''کیا اپنی اور ان..... یہ 'ان' کون ہے؟''

میں نے معارج کو آتے دیکھا تو عجلت میں کہا۔ ''یار عکاشہ' مجھے کسی سے محبت ہو گئی ہے لیکن تم یہ بات معارج کو نہیں بتاؤ گی۔'' عکاشہ حیرانی سے مجھے تکنے لگی اور معارج کے آنے پر ہم دونوں خاموش ہو گئیں۔

''معارج' ٹیسٹ کی تیاری کر لی ہے کیا؟'' میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

''اوہ..... میری ٹیسٹ کی تیاری تو بس ایسی ہی ہوئی ہے' میں کلاس میں جا کر ریوائز کرتی ہوں۔ ابھی کلاس لگنے میں ایک گھنٹہ ہے۔''

''اچھی بات ہے' جاؤ۔'' میں نے فوراً کہا۔ اس کے جاتے ہی میں' عکاشہ کو کالج گارڈن میں لے آئی اور ہم بینچ پر بیٹھ گئے۔

''ثمریزہ' کیا بات ہے' بتاؤ بھی؟''

میں نے سوچا' عکاشہ کو سر کا نام بتانا مناسب



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں ہے اس لیے میں نے جھوٹ بولا۔

''عکاشہ' ہماری فیملی میں ایک شخص ہے جس کی ایج تو مجھ سے تھوڑی بڑی ہے لیکن اس کی personality غضب کی ہے' مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے۔''

''ثمریزہ' تمہارے ہوش تو ٹھکانے ہیں؟ یہ کیا بات کررہی ہو اور کیا وہ بھی تم سے.....'' اس نے چونکتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں..... وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔''

''اچھا تو اس کی ایج کیا ہے؟''

''اس کی ایج ہوگی کوئی ستائیس' اٹھائیس سال۔''

''کیا..... تم پاگل ہو..... تم سولہ سال کی اور وہ اٹھائیس کا.....؟ بارہ سال بڑا ہے تم سے..... توبہ..... توبہ.....''

''یار' ایج میں کیا رکھا ہے' ویسے وہ تو شاید اس سے بھی بڑی عمر کا ہے لیکن مجھے تو وہ 28 کا ہی لگتا ہے لیکن یار' میں اس پر دل و جان سے فدا ہوں۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔

''اگر وہ 28 سے بھی اوپر کا ہے تو وہ شادی شدہ بھی ہوگا؟'' عکاشہ نے مجھ سے استفسار کیا۔ اس کے سوال پر میں چونک گئی۔ میں نے تو سر سے یہ پوچھا ہی نہیں تھا کہ وہ شادی شدہ ہیں یا نہیں؟

''عکاشہ' مجھے نہیں پتہ کہ وہ میرڈ ہیں یا نہیں؟''

''ثمریزہ' پاگل مت بنو' تم اس سے پیار کرتی ہو اور اس کے بارے میں جانتی بھی نہیں' اس کا نام کیا ہے؟''

''اس کا نام علی ہے۔ ویسے اس سے پوچھوں گی کہ کیا وہ شادی شدہ ہے یا نہیں؟'' ابھی ہم یہ باتیں کررہی رہے تھے کہ بیل بج گئی اور ہمیں کلاس میں جانا پڑا۔ کلاس میں ہماری میڈم اسپورٹس ڈے کے متعلق



بتا رہی تھیں۔ ہمارے کالج میں دو دن بعد اسپورٹس ڈے تھا' میری اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے سر آریان کے پیریڈ کا انتظار تھا۔ آخر سر کا پیریڈ آ گیا۔ سب لڑکیاں سر سے کھیلوں کے متعلق باتیں کررہی تھیں۔ سر بھی آج پڑھانے کے موڈ میں نہیں تھے۔

ایک لڑکی نے سر سے پوچھا۔ ''سر' آپ اسپورٹس ڈے پر اپنی بیٹی کو لے کر آئیں گے؟''

''ہاں' اسے ضرور لاؤں گا۔ ویسے بھی وہ کالج آنے کی ضد کرتی ہے۔'' سر کی بات سن کر مجھے جھٹکا سا لگا۔ سر شادی شدہ ہیں اور ان کی بیٹی بھی ہے؟ میرے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی' میرا سر چکرانے لگا کہ سر نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی؟ میں سر کو غصے سے گھورنے لگی۔ سر نے میری طرف دیکھا اور مجھ سے نظریں چرا گئے۔ میں گھر آئی تو خود کو کمرے میں بند کرلیا۔ میری آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے کہ میں جس شخص سے محبت کرتی ہوں' وہ میرا نہیں' کسی اور کا ہے۔ مجھے رہ رہ کر سر آریان پر غصہ آرہا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے انہیں کال کردی۔

''ہیلو.....'' سر کی نرم آواز سنائی دی۔

''سر' آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ آپ.....''

''دیکھو ثمریزہ.....'' سر نے میری بات کاٹی۔

''یہ سچ ہے کہ میری شادی ہوچکی ہے اور میری ایک پانچ سال کی بیٹی بھی ہے لیکن میں اپنی بیوی سے خوش نہیں ہوں۔''

''لیکن سر' آپ کو بتانا چاہیے تھا کہ آپ شادی شدہ ہیں؟''

''یہ شادی نہیں' مجبوری کا طوق ہے جو میرے گلے میں اٹکا ہوا ہے۔ میری زندگی بہت بے مزہ گزر رہی تھی لیکن تمہاری محبت نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میری بیوی مجھ سے محبت نہیں کرتی۔''

''سر' خدا کے لیے' میرے ساتھ کوئی کھیل مت کھیلیے۔''

''نہیں چندا' میں تمہیں کوئی دھوکہ نہیں دے رہا۔ مجھے صرف پیار چاہیے جو صرف تم سے مل سکتا ہے' اس موٹی سے نہیں۔''

''سر' کیا آپ کی بیوی موٹی ہے اور آپ سے محبت نہیں کرتی؟''

''ہاں' میری بیوی مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ میں نے اسے خوش رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ خوش رہنا ہی نہیں چاہتی۔'' سر نے اداسی بھرے لہجے میں کہا۔

''سر' کوئی وجہ تو ہوگی کہ وہ آپ سے محبت نہیں کرتی؟ جب مجھ جیسی یَنگ لڑکی آپ کو اتنا چاہ سکتی ہے تو وہ کیوں نہیں؟''

''دیکھو ثمریزہ' اسٹوڈنٹ لائف میں مجھے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی تھی' میں نے اسے پروپوز بھی کیا لیکن اس نے مجھے ٹھکرا دیا۔ میرا دل ٹوٹ گیا اور میرا محبت سے اعتبار اٹھ گیا۔ میری اس حالت سے میرے parents بھی بہت دل گرفتہ تھے۔ ان سے میری بے چینی دیکھی نہیں جاتی تھی اس لیے انہوں نے میرے لیے رشتہ ڈھونڈنا شروع کردیا پھر انہوں نے شکیلہ کو میرے لیے پسند کرلیا جو میری پھوپی زاد تھی۔ مجھے شکیلہ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن ماں باپ کی خوشی کی خاطر شکیلہ کو دلہن بنا کر اپنے گھر لے آیا۔ وہ صرف میٹرک پاس تھی اور ایک عام سی شکل و صورت والی موٹی لڑکی تھی۔ میں اتنا پڑھا لکھا اور وہ جاہل' گاؤں میں رہنے والی' میری اس کے ساتھ کبھی نہ بن پائی۔''

''لیکن سر' آپ نے تو اپنی طرف سے اس کو محبت دینے کی کوشش کرنی تھی؟''

''کوشش کی تھی لیکن اسے مجھ سے نفرت تھی اور ابھی بھی ہے۔''

''لیکن سر' کوئی reason تو ہوگا اس نفرت کا؟''

''ہاں' reason تو ہے' میں نے اسے ساری بات سچ سچ بتا دی تھی کہ میں کسی اور لڑکی سے محبت کرتا ہوں۔ ثمریزہ' تم تو جانتی ہوگی کہ اگر کسی لڑکی کو پتہ لگ جائے کہ اس کا خاوند کسی اور سے محبت کرتا ہے تو وہ چاہ کر بھی خوش نہیں رہ سکتی۔ ثمریزہ' کیا یہ سچ جاننے کے بعد بھی تم مجھ سے محبت کرتی رہو گی؟'' سر نے گلوگیر انداز میں پوچھا تھا جس سے میرا دل پگھل کر رہ گیا تھا۔

''سر' میں تو مرتے دم تک آپ سے محبت کرتی رہوں گی۔''

''تھینک یو ثمریزہ' دیکھو پلیز' مجھے چھوڑ مت دینا۔ تمہاری وجہ سے ہی میری زندگی میں خوشی آئی ہے۔ پلیز ثمریزہ' ایسا مت کرنا۔'' سر کے التجائیہ انداز پر میں خوشی سے پاگل ہوگئی۔

''سر' آپ کیسی باتیں کررہے ہیں؟ میں آپ کو کبھی نہیں چھوڑ سکتی' کیا ہوا اگر آپ شادی شدہ ہیں۔ اسلام میں تو چار شادیاں کی جاسکتی ہیں۔ میں آپ کی زندگی میں خوشیاں بھر دوں گی' آپ فکر نہ کریں۔'' میں اپنی محبت میں اتنا آگے نکل چکی تھی کہ واپسی میرے اختیار میں نہیں رہی تھی۔

''سر' کمرے میں کوئی آرہا ہے۔ میں فون رکھتی ہوں۔'' میں نے فون بند کیا تو مما کمرے میں داخل ہوئیں۔

''بیٹا' کیا بات ہے' تم آج کل چپ چپ کیوں رہتی ہو؟ بس اپنے کمرے میں ہی رہتی ہو' کوئی بات ہے کیا؟'' ماں تو آخر ماں ہوتی ہے'



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے فوراً میرے اندر کا حال پڑھ لیا۔

"نہیں مما' بس پیپرز کی تیاری کر رہی ہوں۔"

اگلے دن میں کالج گئی تو میرا دل چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں اور عکاشہ کو ساری بات بتا دوں۔ عکاشہ جب سامنے آئی تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں رو پڑی۔

"ثمریزہ.....!" عکاشہ نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"عکاشہ' تم نے مجھ سے کہا تھا نا کہ وہ ضرور شادی شدہ ہوگا؟ تو وہ شادی شدہ ہے اور اس کی ایک پانچ سالہ بیٹی بھی ہے۔"

"اچھا تو پھر اسے چھوڑ دو۔" عکاشہ نے کہا۔

"عکاشہ' محبت اتنی آسان نہیں ہوتی کہ جب چاہو' کر لو اور جب چاہو' بھلا دو۔ میں اب چاہ کر بھی سر کو نہیں بھلا سکتی۔" میں نے جوش میں بے اختیار سر بول دیا۔

"کیا..... کیا وہ کوئی سر ہیں؟ لیکن تم نے تو کہا تھا کہ وہ....."

"ہاں' میں نے جھوٹ بولا تھا' وہ میرا کزن نہیں بلکہ وہ تو سر ہیں۔"

"ثمریزہ' کیا پاگلوں والی باتیں کر رہی ہو؟ وہ سر ہیں تو کیا سر آریان ہیں؟"

"ہاں عکاشہ' وہ سر آریان ہی ہیں۔" میں نے جھجکتے ہوئے بتا دیا۔

"مجھے تو شروع دن سے اس بندے کی نیت اچھی نہیں لگی تھی' اس کا دھیان پڑھانے میں کم اور تمہاری طرف زیادہ ہوتا تھا۔"

"سر آریان بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔"

"ثمریزہ' پاگل مت بنو' میں مردوں کی فطرت کو جانتی ہوں' وہ تم سے کوئی محبت نہیں کرتے' وہ بہت شاطر انسان ہیں' وہ تمہیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔"

"عکاشہ' وہ اپنی شادی شدہ زندگی سے خوش نہیں ہیں۔"

"ہر بندہ یہی کہتا ہے لڑکیوں کو پھنسانے کے لیے۔"

"لیکن پہل تو میں نے کی تھی' انہوں نے نہیں۔"

"بے شک پہل تم نے کی لیکن اب چڑیا ان کے ہاتھ آ گئی ہے تو وہ اس کو کیوں چھوڑیں گے؟" عکاشہ نے غصے سے کہا مگر میں کسی طور اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھی۔

"لیکن میں نے ان سے محبت کی ہے اور شادی بھی ان ہی سے کروں گی۔" میں سر کے خلاف کچھ نہیں سننا چاہتی تھی۔

"جو تمہارے جی میں آئے' کرو' بھاڑ میں جاؤ..... جب وہ شخص تمہیں دھوکہ دے گا' تب روتی ہوئی مت آنا۔" اس نے غصے سے لال پیلی ہوتے ہوئے کہا اور چلی گئی۔ اس رات میں نے پھر سر کو کال کی۔

"سر' بتائیں' اب کیا کرنا ہے' میں کب اور کیسے آپ کی اور صرف آپ کی ہو جاؤں گی؟" میں نے سسکتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے اس بارے میں سوچا ہے' میں تمہارے پاپا سے تمہارا ہاتھ مانگوں گا۔ میں بزدل نہیں کہ تمہیں بھگا کر لے جاؤں۔ ہماری شادی ہوگی تو تمہارے parents کی مرضی سے۔" سر نے بڑی آسانی سے یہ بات کہہ ڈالی۔

"سر' یہ بات سننے میں جتنی آسان ہے' حقیقت میں اتنی ہی مشکل' میرے parents کبھی نہیں مانیں گے اور آپ کی بیوی؟"

"میری بیوی کی بات چھوڑ دو' اس کو منانا میرا کام ہے اور مجھے امید ہے' تمہارے parents بھی



انکار نہیں کریں گے۔"

"لیکن سر' یہ کیسے ہوگا؟"

"تم اپنا سیکنڈ ایئر پورا کرو۔ اس کے بعد میں اپنی امی کے ساتھ تمہارا ہاتھ مانگنے آؤں گا' تب تک میں تمہارے لیے الگ گھر بھی لے لوں گا۔" پھر سر مجھ سے محبت بھری باتیں کرنے لگے اور میں ان باتوں کے سحر میں گم ہو کر رہ گئی۔

اگلے دن عکاشہ کو سر کی باتوں کے متعلق بتایا تو وہ بھڑک اٹھی۔

"ثمریزہ' یہ سب مردوں کی چال ہوتی ہے' وہ تمہیں دھوکہ دے رہے ہیں' وہ ملازمت پیشہ شخص ہیں' الگ گھر افورڈ نہیں کر سکتے اور تم کیا سمجھتی ہو' تمہارے parents اتنی آسانی سے تمہیں اس بڑی عمر کے بندے کے حوالے کر دیں گے؟"

"عکاشہ' وہ مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے' وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں لیکن تمہاری بات بھی ٹھیک ہے' میرے parents کبھی نہیں مانیں گے۔" میں روتے ہوئے بولی۔

"ثمریزہ' سر کا خیال دل سے نکال دو' کیوں اپنے ماں باپ کی عزت داؤ پر لگانا چاہتی ہو؟ اگر وہ تمہاری شادی سر سے کر بھی دیں تو دنیا کے طعنے کیسے برداشت کریں گے؟ اور اُدھر تمہیں سر کی بیوی کی بھی بددعائیں ملیں گی۔ تم اتنی خود غرض کیسے ہو سکتی ہو؟ پھر تمہاری اپنی زندگی بھی برباد ہو جائے گی۔ تمہیں زندگی کا ہر عیش ملا ہے۔ ایک ٹیچر کے ساتھ وہ عیش و آرام نہیں ملیں گے۔" میں آنسو بہاتے ہوئے گم صم سی عکاشہ کی باتیں سن رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں کہ تم صحیح کہہ رہی ہو' میری اس حرکت سے بہت سی زندگیاں تباہ ہو جائیں گی۔ but I still love him"

"پلیز' ڈونٹ بی سلی' اور کان کھول کر سن لو' وہ شخص کبھی تمہارا نہیں ہو سکتا۔" عکاشہ کی باتوں نے مجھے دہلا کر رکھ دیا تھا اور میں گھر آتے ہی کمرے میں بند ہو کر رونے لگی تھی۔ میں دو گھنٹے اسی طرح مسلسل روتی رہی تھی کہ مما کمرے میں آئیں اور میرے پاس بیٹھ گئیں۔

"ثمریزہ بیٹا' کیا بات ہے' کیوں رو رہی ہو؟" مما نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔ مما کو دیکھ کر میں نے ان کے گلے لگ کر اونچی آواز سے رونا شروع کر دیا۔

"میری لاڈو بٹیا' جو بھی بات ہے' اپنی مما سے شیئر نہیں کرو گی؟" مما کے نرم انداز پر میں نے ساری بات انہیں بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

"مما' کسی کو چاہنا بری بات ہے؟"

"نہیں میری بیٹی' کیوں' کیا ہوا؟"

"مما' میرے کالج میں ایک سر آریان ہیں' میں انہیں پسند کرتی ہوں۔"

"ثمریزہ..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" مما نے مجھے گھورا۔

"ہاں مما..... میں سر کے بغیر نہیں رہ سکتی اور وہ بھی مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔"

"تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ بھی تمہیں چاہتے ہیں؟" مما نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا' تب میں نے مما کو سب کچھ بتا دیا کہ کس طرح ہماری باتیں ہوتی ہیں اور سر کی ایج کے بارے میں بھی بتا دیا۔

"بیٹی..... وہ تو تم سے کافی بڑے ہیں پھر تو وہ شادی شدہ بھی ہوں گے؟" مما نے بالکل عکاشہ والی بات کہی۔

"ہاں مما.....! ان کی شادی ہو چکی ہے اور ان کی ایک پانچ سالہ بیٹی بھی ہے۔"

ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر پڑا۔ "تمہارے ہوش تو ٹھکانے ہیں؟ تم پھر بھی اس سے محبت کرتی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو؟" How ridiculous.

"مما' جب مجھے ان سے محبت ہوئی تھی' تب میں یہ بات نہیں جانتی تھی' یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا اور وہ اپنی شادی شدہ زندگی سے خوش نہیں ہیں۔"

"بکواس بند کرو..... یہ سب مردوں کی چالیں ہیں معصوم لڑکیوں کو پھنسانے کی..... تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ اسے بھول جاؤ..... کچھ تو اپنے پاپا کا خیال کرو' وہ ہارٹ پیشنٹ ہیں؟" مما کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ "ثمریزہ..... تم میری اچھی بیٹی ہو' ایسا کوئی قدم مت اٹھانا جس کی وجہ سے ہماری بدنامی ہو۔ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ اس کو بھول جاؤ گی؟"

میں نادان تو سر آریان سے اندھی محبت کرتی تھی' انہیں کیسے بھلا سکتی تھی لیکن مما کا دل رکھنے کے لیے وعدہ کرلیا۔

"مما' آپ سے وعدہ کرتی ہوں' انہیں بھول جاؤں گی۔" میرا یہ کہنا تھا اور مما نے مجھ سے موبائل چھین لیا۔

"آئندہ میں تمہارے ہاتھ میں موبائل نہ دیکھوں ورنہ....." اتنا کہہ کر وہ کمرے سے چلی گئیں۔

پورا ایک ہفتہ ہوگیا تھا مجھے سر سے بات کیے ہوئے۔ یہ دن میں نے جیسے انگاروں پہ لوٹتے گزارے تھے۔ میری صحت بھی خراب ہوگئی تھی۔ اس دوران عکاشہ نے مجھے کافی سمجھایا اور میری سمجھ میں آچکا تھا کہ میں غلط کررہی ہوں' کسی کا گھر اجاڑ رہی ہوں' ایک معصوم بچی سے اس کا باپ چھین رہی ہوں' اپنے ماں باپ کی عزت کو خاک میں ملا رہی ہوں۔

عکاشہ کافی سمجھدار لڑکی تھی' اس نے میرا ذہن صاف کردیا تھا اور معارج جو ہماری تیسری دوست تھی' اس کو بھی اس واقعہ کا علم ہوچکا تھا۔ وہ دونوں مجھے ہر وقت سمجھاتیں کہ تمہیں اس سے اچھا کوئی اور مل جائے گا۔ یوں میں سنبھل گئی اور سر کو حقیقتاً بھولنے کا فیصلہ کرلیا۔

اس روز میں کالج کے گارڈن میں بیٹھی ان ہی خیالوں میں گم تھی کہ کسی کے کھانسنے سے چونکی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو سر آریان کھڑے تھے۔ میں گھبرا گئی۔

"سر پلیز' مجھ سے بات مت کریں' لڑکیاں کیا سوچیں گی؟"

سر نے نوٹس کے اوپر ہاتھ رکھے اور بولے۔ "میں اسی طرح بات کروں گا۔ لڑکیاں سمجھیں گی' میں نوٹس میں سے کچھ سمجھا رہا ہوں۔"

"ثمریزہ' تم مجھ سے بات کیوں نہیں کررہی ہو؟ تمہارا موبائل بھی بند جارہا ہے؟ کیا بات ہے؟"

"سر' بات یہ ہے کہ میں نے اپنی مما کو سب کچھ بتادیا ہے جسے سن کر وہ بہت ناراض ہوئیں اور انہوں نے موبائل چھین لیا ہے۔"

"یہ تم نے کیا کیا؟ مما کو کیوں بتایا؟" سر نے پریشانی سے کہا۔ "تمہاری مما نے کیا کہا ہے؟"

"انہوں نے کہا ہے' آپ کو بھول جاؤں' انہوں نے مجھ سے اس بات کا وعدہ لیا ہے۔"

"ک..... کیا؟"

"ہاں سر' ہم کبھی ایک نہیں ہوسکتے۔" یہ کہتے ہوئے میں سسک پڑی۔

"پلیز' رونا مت' لڑکیاں کیا سوچیں گی؟ دیکھو ثمریزہ' میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں تم سے شادی کروں گا۔ اگر تم کہو تو میں آج ہی تمہارے گھر رشتہ بھیجوں؟"

"نہیں سر..... ایسا نہیں کیجیے گا۔ میرے پاپا یہ بات برداشت نہیں کرسکتے۔ میں اپنے parents کو دکھ نہیں دے سکتی۔"



"پھر تم نے مجھ سے محبت کیوں کی؟ اتنا ہی parents کا خیال تھا تو پہلے سوچنا تھا لیکن اب تم اس میری ہو' میری..... سنا تم نے؟ میں تمہیں پاکر رہوں گا۔ میں نہیں جانتا' آج میں تمہارے گھر آؤں گا۔ کیا تم میرے بغیر رہ سکو گی؟" میں واقعی سر کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

"ٹھیک ہے سر' ایسا ہی ہوگا لیکن ابھی نہیں۔ آج میں آپ کو کال ضرور کروں گی۔" سر گردن ہلاتے ہوئے چلے گئے۔

عکاشہ اور معارج یہ منظر دور کھڑی دیکھ رہی تھیں۔ سر کے جاتے ہی فوراً میری طرف لپکیں۔

"کیا کہہ رہے تھے سر؟" عکاشہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں' بس اب ہم دونوں جلد ہی شادی کرلیں گے۔" میں نے بہت آسانی سے یہ بات کہہ ڈالی اور وہ دونوں ہکا بکا رہ گئیں۔

"کیا تم پاگل ہوگئی ہو؟"

"ہاں' اگر شادی کرنا پاگل پن ہے تو میں ہوں پاگل....." عکاشہ مجھے شکست خوردہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"اور تمہارے parents' سر کی بیوی' اس کی بددعائیں..... ان سے کیسے بچو گی؟ جو کسی کا گھر اجاڑتا ہے' اللہ اس کو برباد کردیتا ہے۔ تم اتنی خودغرض کیسے ہوسکتی ہو؟" عکاشہ نے مجھے سمجھانے کی ناکام کوشش کی۔

"ہاں' میں خودغرض ہوں' مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں' بس مجھے اپنی خوشی چاہیے۔ میں کیوں دوسروں کی فکر کروں؟" میرے سر پر اس وقت بس سر آریان سوار تھے۔

"لیکن تمہارے ماں باپ کا کیا قصور ہے انہوں نے تمہیں پالا پوسا' تمہاری خوشی کی خاطر اپنی خوشی قربان کی' اب ان کو خوشی دینے کا وقت آیا تو تم نے منہ موڑ لیا اور ایک بار....."

"بس عکاشہ' بس' بہت ہوگیا' تم دونوں مجھ سے جلتی ہو اس لیے میرے اور سر آریان کا ساتھ نہیں دیکھ سکتی۔ مجھے کسی کی پروا نہیں....." میں نے غصے سے کہا اور وہاں سے چلی آئی۔

کتنے ہی دن میں نے کالج کی شکل نہ دیکھی' بس اپنے کمرے میں ہی پڑی رہتی۔ ایک دو بار سر آریان سے بات کی اور انہیں رشتہ لانے کے لیے کہا مگر انہوں نے کوئی خاص جواب نہ دیا۔

ایک دن میں یونہی اپنے کمرے میں پڑی تھی کہ مما آئیں اور مجھ سے اصرار کرنے لگیں کہ بڑی بہن رہنے آئی ہوئی ہے' اس کے ساتھ بازار چلی جاؤ۔ میرا بالکل موڈ نہیں تھا اس لیے صاف انکار کردیا۔

"ہر وقت کمرے میں پڑی رہتی ہو' کالج بھی نہیں جاتی' پتہ نہیں' اس منحوس ٹیچر نے کیا کردیا؟ میری بیٹی تو دن بہ دن دبلی ہوتی جارہی ہے۔ میں تمہارا کوئی بہانہ نہیں سنوں گی' بس تم اپنی آپی رابعہ کے ساتھ جارہی ہو' او کے.....!" امی غصے سے بولتی چلی گئیں۔ مجھے راضی ہونا ہی پڑا اور بے دلی سے آپی رابعہ کے ساتھ بازار چلی گئی۔

اگر میں اس دن بازار نہ گئی ہوتی تو مجھ پر اتنا ہولناک انکشاف نہ ہوتا۔

میں آپی کے ساتھ بچوں کے garments کی shop پر تھی۔ آپی اپنے بیٹے کے لیے کپڑے پسند کررہی تھیں اور میں یونہی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ اچانک میری نظر سر آریان پر پڑی۔ وہ بھی اسی shop پر موجود تھے اور ان کے ساتھ ان کی بیوی اور بیٹی بھی تھیں۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور سر سے ملنے چلی گئی۔ سر تو مجھے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔

"السلام علیکم! باجی.....!" میں نے سر کی بیوی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! میں نے آپ کو پہچانا نہیں؟" وہ حیرانگی سے مجھے تکنے لگیں۔

"ہاں' آپ پہچانیں گی بھی کیسے؟ میں تو اُن کی اسٹوڈنٹ ہوں۔" میں نے سر کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہ..... تو آپ اِن کی اسٹوڈنٹ ہیں؟ اِن کی اتنی اسٹوڈنٹس ہیں' مجھے تو کوئی یاد نہیں رہتی۔" سر مجھے قہر آلود نظروں سے گھور رہے تھے اور غصے سے دانت پیس رہے تھے۔ "اچھا تو میرے ہسبینڈ آپ کو کیسا teach کرتے ہیں؟"

"سر بہت زبردست پڑھاتے ہیں' سر بہت انٹیلی جنٹ ہیں۔"

"Yes, he is, after all, he is my husband."

میں سر کی وائف کے منہ سے انگریزی سن کر حیران رہ گئی۔ سر نے تو کہا تھا کہ وہ اَن پڑھ ہیں' جاہل ہیں' پر ان کی وائف تو اتنے manners سے بات کر رہی تھیں اور بہت خوبصورت بھی تھیں؟

"آپ کیسا پڑھتی ہیں؟ I mean, what is ur level of studying?"

"یہ تو آپ سر سے ہی پوچھیے کہ میں کیسا پڑھتی ہوں؟"

"یہ کیا بتائیں گے؟ ان کے پاس تو اتنی اسٹوڈنٹس آتی ہیں۔"

"نہیں' نہیں' میں تو ان کی بہت ہی خاص اسٹوڈنٹ ہوں۔" میں نے خاص پر ذرا زور دیا تو سر کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

"Yes, she is very nice student."

سر نے گھبراتے ہوئے کہا۔ ساتھ میں سر کی بیٹی بھی کھڑی تھی' میں نے اسے پیار کیا۔

"How cute.....! کیا نام ہے آپ کا؟"

"رائمہ.....!" بچی نے بہت تمیز سے جواب دیا تھا۔

"Nice name. یہ تو آپ دونوں کی copy ہے۔" میری بات پر سر کی وائف مسکرا دی۔

"یہ تو بہت بزی رہتے ہیں' ہر وقت لڑکیوں کا جھمگھٹا لگا رہتا ہے۔ پہلے کالج پڑھاتے ہیں اور پھر گھر پر لڑکیاں ٹیوشن پڑھنے آتی ہیں۔ میں تو بہت تنگ ہوں' ان کے پاس تو میرے لیے ٹائم ہی نہیں ہے۔" میں حیران رہ گئی کہ سر ٹیوشن بھی پڑھاتے ہیں اور مجھے کبھی بتایا ہی نہیں۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ سر بیچ میں بول پڑے۔

"چلو جان' اب بس بھی کرو' کتنی باتیں کرو گی؟ ابھی اور بھی شاپنگ کرنی ہے۔" سر کی زبان سے جان کا لفظ سن کر تو میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ وہ تو کہتے تھے کہ انہیں اپنی وائف سے پیار ہی نہیں ہے؟

"آپ بھی ٹیوشن پڑھنے آ سکتی ہیں ہمارے گھر۔" سر کی وائف نے کہا۔

"sure. کہاں ہے آپ کا گھر؟"

"ہمارا گھر ڈیفنس میں ہے۔" انہوں نے مجھے گھر کا پتہ بھی بتایا۔ مجھے پھر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ سر نے جو address بتایا تھا' وہ یہ نہیں تھا۔

سر بوکھلاتے ہوئے بولے۔ "دیکھیں' آپ کو جو بھی مسئلہ ہے' مجھ سے کالج میں ڈسکس کر لیجیے گا۔ میں ابھی اپنی وائف کے ساتھ شاپنگ کرنے آیا ہوں' پلیز' ڈونٹ ڈسٹرب۔" میں ہکا بکا رہ گئی۔ سر نے اتنی آسانی سے میری insult کر دی تھی۔

"اچھا' اللہ حافظ! آپ بہت اچھی ہیں۔ ہمارے گھر ضرور وزٹ کیجیے گا۔ Nice to talk with you." یہ کہتے ہوئے سر کی وائف نے ان کا ہاتھ تھاما اور وہ دونوں چلے گئے۔



میرا دماغ غصے سے کھول رہا تھا۔ مجھ سے شاپنگ سینٹر میں نہ رکا گیا اور میں طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر آپی کو لے کر گھر آ گئی اور میں اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ میں یہ سوچ سوچ کر پاگل ہو رہی تھی کہ سر نے مجھ سے اتنے جھوٹ کیوں بولے؟ نہ تو ان کی بیوی جاہل تھی نہ ہی بدصورت..... بس تھوڑی سی موٹی تھی بلکہ موٹی نہیں' bulky کہنا زیادہ صحیح ہو گا۔ ان دونوں کو دیکھ کر کسی طرح بھی ایسا نہیں لگتا تھا کہ سر اپنی بیوی کے ساتھ خوش نہیں ہیں۔ دوسرے سر نے مجھے اپنے گھر کا پتہ بھی غلط بتایا تھا۔ گویا سر مجھے پوری طرح بے وقوف بنا رہے تھے' مجھے دھوکہ دے رہے تھے۔ مجھے عکاشہ کی ساری باتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ بالکل ٹھیک کہتی تھی' یہ صرف مردوں کی چال ہوتی ہے لڑکیوں کو پھنسانے کے لیے کہ ان کی بیوی اچھی نہیں ہے۔

اسی وقت میرے ذہن نے فیصلہ کیا' میں کسی کا گھر نہیں اجاڑوں گی۔ جو مجھ سے ایسے جھوٹ بول سکتا ہے' نہ جانے اور کتنے جھوٹ بولے گا' جو اپنی اتنی اچھی بیوی کو چھوڑ سکتا ہے' وہ کسی دن مجھے بھی چھوڑ دے گا۔ میں نے اپنے آنسو پونچھے اور ایک عزم کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

اگلے دن میں کالج جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ مما نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"آج اتنے دنوں بعد تمہیں کالج کیسے یاد آ گیا؟" ان کے طنزیہ سوال پر میں نے مما کا ہاتھ تھاما۔

"مما.....! میں نے آپ سے promise کیا تھا کہ میں سر آریان کو بھول جاؤں گی' اسی لیے میں کالج نہیں جا رہی تھی کہ ان کی شکل نہ دیکھوں اور انہیں بھول جاؤں۔ آج مجھے احساس ہو گیا ہے کہ میں غلط تھی' میں ان کو بھول چکی ہوں اور اب اپنی نئی زندگی شروع کر رہی ہوں۔" میری بات سن کر مما کا چہرہ کھل اٹھا۔ انہوں نے میرے ماتھے پر بوسہ دیا اور میں کالج کے لیے نکل گئی۔ میں نے رات جو کچھ سوچا تھا' آج اس سوچ کو حقیقت بنانے کا لمحہ آ گیا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو کہا کہ مجھے ڈیفنس میں اتار دو۔

اس نے پوچھا۔ "کیوں' کالج نہیں جانا؟"

"زیادہ باتیں نہ کرو' مجھے ڈیفنس اتارو' آج میں نے اپنی کسی دوست کے گھر سے کالج جانا ہے۔ چھٹی کے ٹائم تم کالج کے گیٹ پر مجھے لینے آ جانا۔" ڈرائیور نے مجھے ڈیفنس میں میرے مطلوبہ پتے پر اتار دیا۔ کچھ ہی دیر میں سر کے دروازے پر کھڑی میں ڈور بیل بجا رہی تھی۔ سر کی وائف نے دروازہ کھولا۔

"سر کہاں ہیں؟" میں نے ان سے پوچھا۔

"آریان تو کالج گئے ہیں' آپ کو کوئی کام تھا؟" ان کی بیوی نے حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ایکچوئلی' کام تو آپ سے تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے.....؟" ان کی حیرت سوا ہو گئی۔

"کیا ہم بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟"

"ہاں' ہاں' کیوں نہیں۔" وہ مجھے اپنے بیڈ روم میں لے گئیں۔ کمرے کی دیواروں پر ایسی تصویریں لگی ہوئی تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ سر اور ان کی بیوی میں کتنی محبت ہے۔ ان کی شادی کی تصویریں تھیں اور بیٹی کے ہمراہ تصویریں تھیں جو ان دونوں کی محبت کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔

"کہیے' کیا بات کرنی تھی؟"

"سوری' میں اتنی صبح آپ کے گھر آ گئی۔"

"ارے' کوئی بات نہیں۔"



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میں یہ سوچ رہی تھی کہ آپ کیسے برداشت کرتی ہیں کہ آپ کے شوہر ہر وقت لڑکیوں میں گھرے رہتے ہیں؟''

''ارے' بھلا مجھے کیا اعتراض ہوگا۔ ہاں' وہ بزی ضرور رہتے ہیں اور مجھے اتنا ٹائم نہیں دیتے لیکن مجھے ان پر پورا بھروسہ ہے' وہ میرے علاوہ کسی اور کی طرف کبھی مائل نہیں ہوسکتے۔ ہماری لو میرج ہے' پورے خاندان سے ٹکر لے کر انہوں نے مجھ سے شادی کی ہے' وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔'' یہ بات سن کر میرا حیران ہونا فطری تھا کہ سر کا ایک اور جھوٹ پکڑا گیا تھا۔

''sorry to say, لیکن شکیلہ باجی' آپ کے شوہر آپ کا بھروسہ توڑ چکے ہیں۔''

''کیا کہہ رہی ہو لڑکی.....؟''

''ہاں باجی' میں ٹھیک کہہ رہی ہوں' سر کا ایک لڑکی سے affair چل رہا ہے۔''

''دیکھو لڑکی.....! میں اپنے شوہر کے خلاف ایک لفظ نہیں سنوں گی۔'' وہ غصے سے سرخ ہوگئیں۔

''باجی.....! میں سچ کہہ رہی ہوں' آپ کو یقین نہ آئے تو میرے پاس ثبوت بھی ہے۔'' وہ حیرت اور بے یقینی کے عالم میں مجھے دیکھتی رہ گئیں۔

''کیا ثبوت ہے؟'' انہوں نے قریب قریب رو دینے والے انداز میں پوچھا۔

''ثبوت یہ ہے کہ وہ لڑکی میں ہی ہوں لیکن اب میں سمجھ چکی ہوں کہ میں غلط کرتی رہی ہوں۔ میں کسی کا گھر برباد کرنے جا رہی تھی لیکن جب میں نے آپ سے کل ملاقات کی تو مجھے پتہ چلا کہ آپ تو بہت اچھی عورت ہیں اور سر کتنے بڑے مکار اور جھوٹے ہیں.....''

''کیا جھوٹ بولا آریان نے اور یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے؟'' وہ شعلہ بار آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں پھر میں نے تمام کہانی ان کے گوش گزار کر دی اور موبائل پر سر کے بھیجے ہوئے تمام میسجز بھی دکھا دیئے اور یہ بھی بتایا کہ وہ تو آپ کو جاہل کہتے ہیں کہ آپ صرف میٹرک پاس ہیں؟''

''یہ سب آریان نے تمہیں کہا میرے بارے میں؟'' باجی شکیلہ غصے سے لال پیلی ہوگئیں۔

''جی..... جی' اور یہ بھی کہ آپ ان سے محبت نہیں کرتیں۔''

''کیا.....!! میں ایم اے انگلش ہوں اور دنیا جہاں سے زیادہ بلکہ خود سے بھی زیادہ آریان سے محبت کرتی ہوں۔'' ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے تھے۔

''باجی.....! حوصلہ رکھیں' اب میں ان کا اصلی چہرہ دیکھ چکی ہوں۔ مجھے سمجھ آچکی ہے کہ مرد ایسی ہی فطرت کے ہوتے ہیں' ذرا کسی غیر لڑکی نے لفٹ کرائی تو اپنی وفادار بیوی کو بھول جاتے ہیں۔ باجی.....! پلیز' مجھے معاف کردیں پلیز۔'' میں نے روتے ہوئے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

باجی نے مجھے گلے سے لگایا۔ ''میں نے تمہیں معاف کیا لیکن میں آریان کو نہیں چھوڑوں گی' میں تو تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے وقت پر میری آنکھیں کھول دیں۔''

جی باجی.....! میں اسی لیے آپ کے گھر آئی ہوں کہ آپ کا گھر بچ جائے۔ میں نہیں تو کوئی اور لڑکی آپ کا گھر برباد کردے گی۔''

''تھینک یو شمریزہ.....! تم نے مجھے میرے شوہر کی اصلیت بتا دی۔ اب دیکھو' میں کیا کرتی ہوں' اپنے بھائیوں اور ابو کو اس کے کرتوتوں کا بتاؤں گی تو وہ اس سے خوب نبٹ لیں گے۔''

''باجی.....! اگر میں آپ کو ایک مشورہ دوں تو؟''

''بولو.....''

''باجی.....! ضروری تو نہیں کہ سر لڑکیوں کو ہی پڑھائیں' سر لڑکوں کو بھی تو پڑھا سکتے ہیں۔ آپ کچھ بھی کر کے سر کا ٹرانسفر بوائز کالج میں کروا دیں' اس طرح یہ خطرہ ہمیشہ کے لیے ٹل جائے گا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

''اچھا باجی.....! میں چلتی ہوں' مجھے کالج پہنچنا ہے۔'' میں اُن کے گھر سے نکل آئی۔ اب میں خود کو بہت ہلکا پھلکا اور مطمئن محسوس کر رہی تھی۔ کالج پہنچی تو چھٹی ہوچکی تھی۔ گیٹ پر لڑکیاں کھڑی تھیں۔ میں بھی ان میں کھڑی ہوکر اپنے ڈرائیور کا انتظار کرنے لگی کہ عکاشہ کی نظر مجھ پر پڑی' وہ میری طرف لپکی۔

''شمریزہ.....! تم..... تم تو آج کالج نہیں آئیں تو پھر یہاں کیا کر رہی ہو؟'' میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور روتے ہوئے اس کے گلے لگ گئی۔ مجھے آج اس کے گلے لگ کر بہت سکون ملا تھا لیکن جو آنسو میری آنکھوں میں تھے' وہ خوشی کے تھے۔

''شمریزہ' کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو؟''

''تم بہت اچھی ہو عکاشہ.....! تم واقعی سچی دوست ہو۔ میں کتنی خوش نصیب ہوں کہ مجھے تم جیسی دوست ملی۔ تم نے ہمیشہ میرا اچھا چاہا اور مجھے سمجھاتی رہیں لیکن میں نا سمجھ تمہیں اپنا دشمن سمجھتی رہی۔ میرا خیال تھا کہ تمہیں سر اور میرا رشتہ برداشت نہیں ہوتا' میں کتنی غلط تھی عکاشہ' مجھے معاف کردو۔''

''ارے شمریزہ' کیسی باتیں کر رہی ہو؟ بتاؤ تو کیا ہوا؟''

''عکاشہ.....! سر جھوٹے اور مکار نکلے ہیں۔''

''یہ بات تو میں تمہیں پہلے دن سے کہتی تھی۔ پھر سر کی اصلیت تمہارے سامنے آئی؟'' اسی وقت میرا ڈرائیور آچکا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ تمام باتیں



## کھڑکیاں بھی روتی ہیں

کھڑکیوں کے شیشوں پر
رینگتے ہوئے قطرے
یوں پھسلتے ہیں جیسے
میرے اور بادل کے
درمیاں کوئی ہے..... جو
میرے اور بادل کے
راز کو سمجھتا ہے
جب گھٹائیں چھاتی ہیں
صرف وہ نہیں روتیں
آنکھیں بھی برستی ہیں
کھڑکیاں بھی روتی ہیں

عنبرین فاروق

فون پر بتا دوں گی پھر میں خوشی خوشی گھر آگئی اور شام کو عکاشہ کو فون کر کے ساری بات بتا دی۔

''شاباش شمریزہ.....! بہت اچھا کیا۔ اللہ تمہیں اس کا اجر ضرور دے گا۔ چلو دیر سے ہی سہی' پر تمہیں سمجھ تو آگئی۔''

چند دن بعد سر کا کسی اور کالج میں ٹرانسفر ہوگیا اور یہ بات میں ہی جانتی تھی کہ ان کا تبادلہ کس نے کروایا ہوگا۔

اس واقعہ کو کافی عرصہ ہوچکا ہے۔ اب میری منگنی میرے کزن سے ہوچکی ہے اور چند ماہ بعد میری شادی ہے۔ میری تمام لڑکیوں سے گزارش ہے کہ اگر آپ کسی male teacher سے پڑھتی ہیں تو پلیز' خیال رکھا کریں اور احتیاط کیا کریں۔ آپ کی چھوٹی سی حرکت سے کسی کا گھر اجڑ سکتا ہے اور آپ کی اپنی زندگی بھی برباد ہوسکتی ہے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منزہ سہام مرزا

# شہید کی ڈائری

علامہ اقبال کی پرواز خیال
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت، نہ کشور کشائی

**قوم کو حیات بخشنے والے شہیدوں کی سوچ پر مبنی ایک دل گداز سلسلہ**

میں 65ء کی جنگ کا شہید ہوں' اپنے وطن کی خاطر جان دی اور بہت خوش ہوں' بہت اچھی جگہ ہوں مگر پاکستان کے لیے دل اب بھی دھڑکتا ہے۔ جب جب آسمانوں سے نیچے دیکھتا ہوں' تب پریشان ہو جاتا ہوں۔ کہیں میری شہادت رائیگاں تو نہیں چلی گئی' یہ خیال بہت بے چین کر دیتا ہے' تبھی ماں کی سنائی ہوئی کہانی یاد آ جاتی ہے۔ ایک سلطنت تھی جس پر ایک دیو قابض ہو گیا تھا۔ دیو کی جان ایک توتے میں تھی۔ کئی شہزادے اس نیت سے آئے کہ وہ توتے کی گردن مروڑ کر دیو کو مار ڈالیں اور سلطنت پر حکمرانی کریں مگر ان کا یہ خواب' خواب ہی رہا' وہ یا تو دیو کے ہاتھوں مارے گئے یا جان بچا کر بھاگ گئے.....

سیاسی جماعتوں کا مزارِ قائد پر جلسے جلوسوں کا انعقاد' طاقت کا مظاہرہ' ناچ گانے' بے ہنگم شور' ٹریفک کی کثافت' مجھے سارے سیاست دان ان شہزادوں کی مانند لگتے ہیں جو اپنے محلوں کی اونچی فصیلوں سے ہاتھ میں تلوار لیے اپنی رعایا کو اپنا دیدار کراتے ہیں۔ اونچے اونچے محل اور نیچے' بہت نیچے رعایا' وزیروں اور مشیروں کے جلو میں نپے تلے قدم اٹھاتے شہزادے اور ان کے قدموں میں پھول نچھاور کرتی رعایا..... میں جب شہید ہوا تھا' تب میرا پیارا پاکستان دولخت نہیں ہوا تھا مگر پھر میرے وطن پر دیو قابض ہو گیا اور سارے شہزادے ناکام ہو گئے۔ کیا میری شہادت ضائع ہو گئی؟ جس پاک سرزمین کے لیے میں نے اپنے والدین کو بے سہارا کر دیا' بیوی کو تنہا چھوڑا' ننھی فاطمہ اور شیر علی کو یتیم کر دیا' وہ دو ٹکڑے ہو گیا' تب شہزادو.....! تمہیں مزارِ قائد پر آنا چاہیے تھا۔ ان کے قدموں میں بیٹھ کر اپنی ناکامی کا اعتراف کرنا چاہیے تھا' بین کرنے چاہیے تھے' ماتم ہونا چاہیے تھا' علم بلند ہونے چاہیے تھے' اپنے سروں میں خاک ڈالنی چاہیے تھی کہ تم اپنی ہی سلطنت کی حفاظت نہ کر سکے۔ میرے زخم پھر تازہ ہو گئے اور تازہ تازہ خون رسنے لگا پھر کچھ وقت گزرا' اب یہ کیسا شور؟ میرے محسن کے آرام میں کون



مخل ہو رہا ہے؟ ٹریفک کا شور' دھوئیں کی کثافت' جوانوں کے بھنگڑے' اونچی آواز میں بجتے گانے' یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میرے قائداعظم کو آرام کرنے دو۔ انہوں نے ساری زندگی انتھک محنت کی' جی بھر کر نیند نہ لی' جاگتی آنکھوں سے بھی صرف پاکستان کا خواب دیکھا۔ اپنی صحت کی بھی پرواہ نہ کی اور بالآخر ہمیں آزاد وطن کا تحفہ دے کر' ہمیں ہماری پہچان دے کر دور' بہت دور چلے گئے۔ ہمیں پہچان یا تو ہمارے والدین دیتے ہیں یا پھر قائداعظم نے یہ پہچان دی' وہ ہمارے والدین سے بھی زیادہ ہمیں محبوب ہونے چاہئیں۔ مسلمان اپنے محسن کو نہیں بھولتا اور نہ ہی مومن اپنے باپ' دادا کی قبروں پر ناچتا گاتا ہے' چیختا چلاتا ہے۔ وہاں صرف فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ وہ جائے عبرت ہے تاکہ جب کل ہم بھی قبر بن جائیں تو ہماری اولادیں بھی ہم پر فاتحہ پڑھیں۔ تم نے اپنے محسن کے مزار کو تماشہ گاہ کیوں بنا لیا ہے؟ انہیں آرام و سکون سے رہنے دو۔ تمہارا شور شرابہ اُن کے مزار کے سفید سنگِ مرمر کو تمہارے دلوں کی طرح سیاہ کر رہا ہے۔ دیکھو' میں تو اب تمہاری دنیا میں نہیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ شہید کبھی مرا نہیں کرتے۔ میں نے تم لوگوں سے کبھی کچھ نہیں مانگا مگر اب ہاتھ جوڑ کر اُس احسان کے بدلے جو میں نے جان دے کر تم پر کیا' مجھے اپنے محسن کے لیے احترام' سکون دے دو۔ میرے محسن کی آخری آرام گاہ کا احترام کرو۔ وہاں جا کر آنسو بہاؤ' اپنی ناکامیوں پر شرمندہ ہو' اس کی امانت کی حفاظت نہیں کر سکے' اعتراف جرم کرو مگر خاموش ہونٹوں اور بہتی آنکھوں سے' جھکے سر اور ٹوٹے قدموں سے کیونکہ ایک ایسا شخص جو اب تمہاری دنیا میں نہیں' احترام اور سکون چاہتا ہے۔ دوسرے ایسے شخص کے لیے جو میرا ہمسایہ ہے' اُس پر رحم کرو خدارا.....! اسلامی جمہوریہ پاکستان کسی کا نہیں' صرف اُس کا ہے' صرف اور صرف میرے اور تمہارے قائداعظم محمد علی جناح ولد جناح پونجا کا۔

نگہِ بلند' سخن دلنواز' جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

شہید وطن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قربان علی ایری

# حی علی الفلاح

علامہ اقبال کا خیال

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الہ الا اللہ

**آج کے منظر نامے کی عکاسی کرتی ایک پُرالم سچ بیانی بصورتِ کہانی**

میں کمرے میں لائٹ بند کر کے اضطرابی کیفیت میں بیٹھا تھا، ہر گزرتے دن کے ساتھ میرا ذہنی و قلبی سکون ختم ہوتا جا رہا تھا، معاشرے میں سانس لیتے ہزاروں مسائل میرے دل کے گریبان کو چاک کر رہے تھے۔ مجھے آبدیدہ کیے ہوئے تھے۔ کئی دنوں سے نیند کی دیوی بھی مجھ پر مہربان نہیں ہوئی تھی..... ہوتی بھی تو آخر کیسے، میں ایک حساس انسان تھا۔ میں بھلا کس طرح ایسے آشوب زدہ حالات میں چین کی نیند سو سکتا تھا۔ کس طرح حالات سے بے خبر رہ کر زندگی گزار سکتا تھا۔

میں ایک صحافی اور ادیب ہوں۔ ایک ایسا صحافی جس پر معاشرتی حقائق کو عیاں کرنے کی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اب تک میں اپنے فرائض، بڑی ایمانداری، مخلصی اور خوش اسلوبی سے انجام دے رہا تھا لیکن اب گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ میرے لیے یہ کام کٹھن سے کٹھن ہوتا جا رہا تھا..... اب میں جس مسئلے کی نشاندہی کرتا وہ مسئلہ اپنے اندر ہزاروں مسائل لا کھڑا کر دیتا۔ تعلیمی

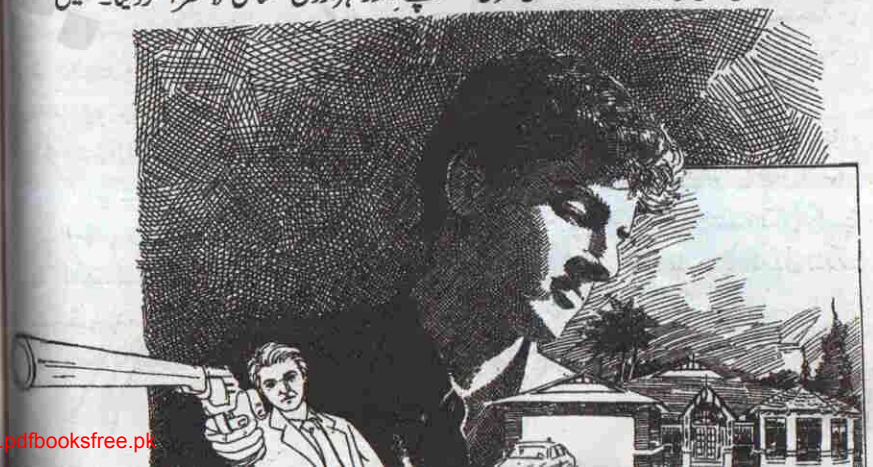

پسماندگی، صحت کے مسائل، امن و امان کے مسائل، عورتوں پر تشدد، بچوں سے ناروا سلوک، لینڈ مافیا، اغوا برائے تاوان کے واقعات تو اپنی جگہ پر..... لیکن مسجدوں میں خودکش دھماکے، ٹارگٹ کلنگ اور ڈرون حملوں نے میرے چاروں اطراف مایوسی کا عالم پیدا کر دیا تھا۔

اس روز بھی میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ..... میرا قلم آخر کس کس مسئلے کی نشاندہی کرے؟ میں قلم میز پر رکھ کے ذہنی سکون کے علاوہ کچھ موڈ کو فریش کرنے کے خیال سے گھر سے نکل پڑا اور ایک ہوٹل میں بیٹھ کر چائے کا آرڈر دیا کہ اچانک ہوٹل کے باہر فائرنگ شروع ہو گئی۔ ہوٹل میں موجود اور تمام لوگوں کی طرح میں بھی اپنی جان کی حفاظت کے لیے ایک محفوظ جگہ چھپ کر بیٹھ گیا کہ کسی اندھی گولی کا نشانہ نہ بن جاؤں۔ تقریباً بیس منٹ تک فائرنگ کا سلسلہ جاری رہا تھا اور جب فائرنگ ختم ہوئی تھی تو بہت سے لوگ گولیوں کا نشانہ بن کر مر چکے تھے اور کئی اپنی آخری سانسیں لے رہے تھے اور باقی زخموں سے لہولہان تکلیف میں تڑپ رہے تھے لیکن آدھا گھنٹہ گزر جانے کے بعد بھی نہ پولیس آئی تھی نا ہی انتظامیہ کے کوئی اور ذمے داران، کچھ سماجی کارکن آئے تھے جن سے مل کر لوگوں نے زخمیوں کو اسپتال پہنچایا تھا۔ اب مجھ میں وہاں مزید ٹھہرنے کی ہمت نہ رہی۔ میں ایک نزدیکی پارک میں چلا آیا تھا۔

مجھے پارک میں بیٹھے، ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی کہ اچانک ایک شور سا سنائی دیا تھا۔ میں نے اپنے اوسان بحال رکھے تھے اور آنے والے حالات سے نمٹنے کے لیے چوکس ہو گیا تھا اور پھر میں نے صورتِ حال جاننے کے لیے جب اپنے چاروں اطراف نظریں گھمائی تھیں تو معلوم ہوا تھا کہ..... ایک نوجوان لڑکا کسی بزرگ خاتون کا پرس چھین کر بھاگ چکا ہے۔ وہ بزرگ خاتون بری طرح سے روتے ہوئے دُہائی دے رہی تھیں۔ میرا دل اور بوجھل ہو گیا۔ میں پارک سے نکل کر ایک کچی بستی میں پہنچ گیا جہاں غربت اور افلاس کا راج تھا۔ ایک معصوم بچہ بھیک کی غرض سے میرے پاس آیا تھا..... اس کی آنکھوں میں بس بھوک تھی، کوئی خواب نہیں تھا..... اسی وقت میرے موبائل کی بیل بجی تھی۔ دوسری جانب میرا دوست جمشید تھا۔

''یار عبداللہ! میں نے ایک تقریب کا اہتمام کیا ہے جس میں ملک کی نامور شخصیات جن میں سیاست دان، عالمِ دین، اہلِ قلم اور معروف سماجی رہنما شریک ہو کر ہمارے ملک کے موجودہ حالات پر گفتگو کریں گے..... تمہیں بھی شام چھ بجے تک آنا ہو گا۔ میں نے فوری طور پر اس تقریب میں شرکت کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆.....☆

تقریب میں ہر شخص اپنے ہم خیال لوگوں کے ساتھ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے محوِ گفتگو تھا۔ ایک معروف سیاستدان جن کا تعلق صاحبِ اقتدار پارٹی سے تھا..... فرما رہے تھے کہ ہماری حکومت امن و امان کا مسئلہ بہت جلد حل کر دے گی۔ عوام کو ریلیف بھی دے رہی ہے۔ بہت جلد ہمارے ملک میں ترقی و خوش حالی کا ایک نہ ختم ہونے والا سنہری دور شروع ہونے والا ہے..... اور.....!

'کیا خاک ترقی ہوتی ہے؟ کیا خاک امن و امان قائم ہو گا؟'..... یہ سوچتے ہوئے میری آنکھوں میں کچھ دیر پہلے ہونے والی فائرنگ، لاشیں، تڑپتے زخمی اور اپنا پرس چھین جانے پر وہ روتی بزرگ خاتون بھی آ بیٹھی تھیں۔

ایک مشہور عالمِ دین اپنے فرقے کو سب سے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صحیح فرقہ قرار دے رہے تھے اور دوسرے لوگوں کو جہنمی ثابت کرنے کے لیے بہت سی آیات اور احادیثِ مبارکہ کا ترجمہ اور تفسیر اپنی مرضی سے بیان بھی کر رہے تھے۔

آج مساجد میں خودکش دھماکے ہو رہے ہیں؟ دھماکہ کرنے والے کو دھماکہ کرنے کی وجہ معلوم نہیں اور دھماکوں میں مرنے والوں کو بھی علم نہیں کہ وہ کس قصور کی بنا پر مارے جا رہے ہیں۔ آج معصوم بچوں کو خودکش دھماکوں میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کو ختم کیا جا رہا ہے۔ آج مسلمان ایک عالمی سازش کا شکار ہو رہے ہیں اور ان مولانا صاحب کو اب بھی الگ الگ فرقوں میں بٹنے کی سوجھی ہے۔

میں چند قدم آگے بڑھا تو اہلِ قلم کی محفل میں جا پہنچا جہاں چند بزرگ اہلِ قلم، مختلف سیاسی پارٹیوں کے لیے اخبارات اور رسائل میں کالم کی بنیاد پر ملنے والے انعامات اور اعزازات کی کتاب کھولے مسکرا رہے تھے اور نو آموز قلم کاروں کو بھی اپنے تجرباتی ٹپس سے نواز رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیسے اہلِ قلم ہیں جنہوں نے اپنے قلم کے تقدس کو بیچ دیا ہے، یہ بھلا کس طرح ملک کو درپیش مسائل کو قلم بند کریں گے؟

میں وہاں سے آگے بڑھا تو میری ملاقات ایک نامور سماجی شخصیت سے ہوگئی جو اپنی عظیم خدمات اور کارناموں کی خود ساختہ کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھے۔ ہم نے عوام کی خدمت کرتے ہوئے ملک کے کونے کونے تک راشن اور کپڑے تقسیم کر دیئے ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ ہمارے ملک میں کہیں کوئی بھوکا نہ رہے۔

ان کی یہ بات سن کر میری آنکھوں میں وہ غریب بستی اور بھیک مانگتا بھوکا بچہ آن بیٹھا تھا.....

اے میرے خدایا! یہ میں کہاں آ گیا مطلبی انسانوں کے درمیان؟ دو چہرے رکھنے والوں کے درمیان! جھوٹے اور فریب کاروں کے درمیان۔ یہ تمام لوگ تو انسانیت کے دشمن ہیں۔ آخر یہ انسانیت کا پاس کیسے رکھیں گے؟..... بس یہ سوچتے ہوئے میں شدید مایوسی کے عالم میں اس تقریب سے نکل آیا تھا..... اور سوچ رہا تھا کہ کیا اس ملک میں کوئی انقلاب نہیں آئے گا؟..... نفرتیں محبتوں میں تبدیل نہیں ہوں گی؟ ظلم امن میں تبدیل نہیں ہوگا؟ اور اگر ہوگا تو..... کب اور کیسے ہمیں عزت، امن اور آشتی کی فضا میں ذہنی سکون کے ساتھ رزق میسر ہوگا.....؟ آخر کون؟ ہمارے یہ تمام مسائل حل کرے گا؟ آخر کون ہمارا رہنما بنے گا؟ آخر کون ہمیں فلاح کا راستہ دے گا؟ آخر کون ہمیں کامیابی و کامرانی کا راستہ دکھائے گا؟ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں مایوسی کے اس عالم میں خودکشی کر لوں، میں اپنا سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا تھا..... میری آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر میرے گریبان کو تر کر رہے تھے کہ اچانک..... نزدیک ہی ایک مسجد سے مؤذن نے اذان دی تھی.....!

''اللہ اکبر..... اللہ اکبر..... اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔'' میں یک دم چونک اٹھا تھا اور اپنے آنسو پونچھ کے بہت خشوع و خضوع سے اذان سننے لگا تھا..... مؤذن کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

''حی علی الصلوٰۃ آؤ نماز کی طرف۔ حی علی الفلاح آؤ کامیابی کی طرف۔''

میری سمجھ میں فوراً ہی یہ بات آ گئی تھی..... میں سمجھ گیا تھا کہ..... اللہ سب سے بڑا ہے۔ وہی ہمارا رہنما ہے۔ وہی ہمیں تمام مشکلات اور مسائل سے نجات ذہنی و قلبی سکون اور کامیابی کا راستہ دکھا سکتا ہے..... بے شک ہماری ہر مشکل و پریشانی کا حل اس پاک ہستی سے رابطے میں ہے۔



علی صبا ۔۔

# وہ اجنبی ساتھی

حمیرا رحمٰن کا خیال

اس سے جو کہنا چاہا تھا میں نے کہا نہیں
پھر اب کیوں اس بات کا کانٹا مجھ میں رہتا ہے

**ایک طالبہ اور ایک اجنبی ساتھی کی مختصر مگر پراثر کہانی**

''مما..... مما..... اٹھیے نا' مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔'' میں نے آہستگی سے مما کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا کہ کہیں انہیں غصہ نہ آ جائے۔ میں کالج کے لیے تیار ہو کر سیدھی مما کے روم میں چلی آئی تھی حالانکہ جانتی تھی' مما اس وقت سو رہی ہوں گی لیکن آج مجھے اُن کو اپنا مسئلہ بتانا ہی تھا۔ خانساماں ناشتہ تیار کر چکا تھا اور ابی ڈریسنگ روم میں تیار ہو رہے تھے۔

''کیا بات ہے؟'' مما نے آنکھیں کھولے بنا کہا۔

''مما..... ابی سے کہیں نا' مجھے جلدی کالج چھوڑ دیا کریں' آپ جانتی ہیں' روز میرا پہلا پیریڈ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نکل جاتا ہے اور مس نگہت کی ڈانٹ مجھے سننا پڑتی ہے۔'' میں نے دھیمے لہجے میں شکایتاً کہا۔

''تمہارے پپا بھی انسان ہیں۔ سارا دن آفس میں مصروف رہتے ہیں۔ رات گئے لوٹتے ہیں۔ صبح ہی صبح نہیں اٹھ سکتے۔ اچھا' تم خود کہہ کر دیکھ لو' شاید مان جائیں۔'' مما نے ابی کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔ میں سمجھ گئی' اب مجھے خود بات کرنی پڑے گی لہٰذا چپ چاپ اٹھ کر ناشتے کے لیے ڈائننگ روم میں چلی گئی اور خاموشی سے ناشتہ کرتے ہوئے سوچنے لگی کہ مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا' تب میرے ذہن میں اس مسئلے کا ایک حل آ گیا۔ ناشتہ کر کے میں دوبارہ امی کے پاس گئی۔

''مما! میں روز پیدل کالج چلی جایا کروں؟ کالج زیادہ دور بھی نہیں ہے' میں آسانی سے پہنچ جاؤں گی۔''

''کیوں؟'' انہوں نے گھورا۔

''اس لیے کہ میں وقت پر پہنچ جایا کروں گی۔ ابی کو تکلیف بھی نہیں ہوگی۔''

''جانے میں حرج تو نہیں لیکن تم اپنے ابی سے پہلے پوچھ لینا۔'' میں کچھ دیر بیٹھ گئی۔ ڈریسنگ روم سے ابی تیار ہو کر نکلے تو میں نے کہا۔

''ابی..... مجھے دیر ہو رہی ہے' جلدی چلیے۔''

''چلتا ہوں بھئی' ناشتہ تو کر لوں۔''

''ابی..... کیا میں پیدل کالج چلی جایا کروں؟ آپ کو آرام ہو جائے گا۔''

''اگر تم چاہو تو چلی جاؤ۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں' بس ذرا اپنی مما سے ضرور پوچھ لینا۔'' مما سے اجازت تو پہلے ہی لے چکی تھی چنانچہ باہر آ کر میں نے ڈرائیور کو سلام کیا اور گیٹ کی طرف بڑھ گئی تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔

''کیوں چھوٹی بی بی..... گاڑی سے نہیں جائیں گی؟''

''تم لوگ چلو تو بات ہے نا۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''صاحب مجھے گاڑی چلانے ہی نہیں دیتے ورنہ میں ہی آپ کو چھوڑ آتا۔ اب تو میں صرف کلینر بن کر رہ گیا ہوں۔'' اس نے مسکین سی صورت بناتے ہوئے کہا۔

''دوبارہ تو تم گاڑی مار چکے ہو' اب تو ڈرائیوری کا دعویٰ ہی چھوڑ دو۔ شکر کرو' ابی نے تمہیں نکالا نہیں۔'' میں نے انہیں کھری کھری سنا دی اور کتابیں سنبھالتی آگے بڑھ گئی۔

آج کافی عرصے بعد یوں اکیلے جانا ہو رہا تھا' کچھ ڈر بھی لگ رہا تھا اور کچھ آزادی کا احساس بھی تھا۔ بہرحال میں چل پڑی تھی۔ خوف' خوشی اور نروس کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ میں چلی جا رہی تھی۔ بہرحال کالج پہنچتے پہنچتے میں کافی تھک چکی تھی۔ کلاس میں بھی چپ چاپ بیٹھی رہی۔ لیکچر کچھ خاص سمجھ میں نہیں آیا۔

پیدل چلنے کی وجہ سے میں یونہی تھکی تھکی اور خالی الذہن رہتی۔ سوتے وقت سارے جسم میں درد ہوتا اور میں چپ چاپ سے دوا کھا کر سو رہتی۔ اتنے نازوں سے جو پلی بڑھی تھی لیکن میں اپنی آزادی کو کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھی۔ وقت پر کالج چلی جاتی اور وقت پر ہی واپس آتی۔ ابی اور مما شاید مطمئن ہو گئے تھے اور مجھ سے سوائے خیریت پوچھنے کے' کوئی اور خاص بات نہیں کرتے تھے۔

کئی ہفتے گزر گئے اور میں خود اعتمادی سے کالج جانے لگی البتہ مجھے بوریت ہوتی تھی کہ تمام راستہ خاموشی سے گزر جاتا تھا۔ آدھے گھنٹے کا راستہ مجھے دو گھنٹے کا معلوم ہوتا تھا۔

مارچ کا مہینہ تھا' بہار کی آمد آمد تھی' درختوں پر



پتے اور پھول نکلنے شروع ہو گئے تھے' ہوا میں ایک انجانی سی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ دل چاہتا کہ اس ماحول کو اپنے اندر جذب کر لوں۔ کالج آتے جاتے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میری تھکن دور کر دیتی تھی اور میں کبھی کبھی بلامقصد بھی لمبے لمبے راستوں سے ہو کر کالج جاتی تھی۔ میں عموماً اپنے ماحول سے بے خبر اپنے آپ میں مگن چلتی تھی۔

اُس دن بھی میں اردگرد سے بے نیاز کالج کی جانب چلی جا رہی تھی کہ کسی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اس وقت میں نہر کے پل سے گزر رہی تھی۔ مجھے احساس ہوا' میرے ساتھ ساتھ کوئی چل رہا ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی میں نے سامنے دیکھتے ہوئے قدموں کی رفتار بھی بڑھا دی۔ اکثر ایسے موقع پر میں ایسا ہی کیا کرتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر میرے ساتھ تھا اور کچھ کہہ رہا تھا جس پر میرا دھیان نہیں تھا۔ تمام راستہ وہ بولتا رہا اور میں دانستہ انجان بنی رہی' یہاں تک کہ میرا کالج آ گیا اور میں اندر چلی گئی۔

اگلے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ نہر کے پل سے وہ میرے ساتھ چلنے لگا اور کالج تک کچھ نہ کچھ کہنے کی کوشش کرتا رہا اور میں نظرانداز کرتی رہی پھر تو یہ روز کا معمول بن گیا۔ میں دور سے ہی اس کو نہر کے پل پر اپنا منتظر پاتی' وہ ساتھ چل پڑتا' نہ میں نے اسے منع کیا اور نہ اس سے کوئی بات کی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میں کسی الجھن میں گرفتار ہوں اور کالج اکیلے جانے کی میری آزادی ختم ہو۔ اگر میں مما یا ابی کو اس بارے میں بتاتی تو وہ یقیناً میرا تنہا آنا جانا بند کروا دیتے۔

دو ہفتے گزر گئے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے؟ صرف ایک بات کا احساس ہوا کہ اس کے ہمراہ راستہ جلدی گزر جاتا تھا۔ ایک تو اس لیے کہ وہ باتیں بہت کرتا تھا' دوسرے اسے دیکھ کر میں تیز چلنا شروع کر دیتی تھی کہ جو وہ کہنا چاہ رہا ہے' میں سننا نہیں چاہتی تھی۔

اکثر میں سوچتی کہ یہ کون لڑکا ہے' کیوں میرے پیچھے آتا ہے؟ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ وہ میرے ساتھ ہوتا تھا جبکہ میں اس سے بے نیاز رہتی تھی۔ کئی دن گزر گئے۔ اس عرصے میں صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ بھی کسی کالج میں پڑھتا ہے' تاہم اس دوران میں نے ایک دفعہ بھی اس سے بات نہیں کی تھی۔ اس حوالے سے گھر میں کسی سے کہنے کی مجھ میں ہمت ہی نہیں تھی۔ ابی اور مما اپنی اپنی مصروفیات میں مگن رہتے تھے اور میں اپنے خیالوں میں.....

دن گزرتے رہے' بہار' موسمِ گرما میں اور گرمی برسات میں بدل گئی اور مجھے اپنا پیدل جانا آنا بھی بند کرنا پڑا کیونکہ اب مما کو فکر ہو رہی تھی کہ راستے میں آتے جاتے بارش ہو گئی تو..... لہٰذا اب ابی کے ساتھ مجھے گاڑی میں ہی جانا پڑا تھا۔

اُس دن بارش ہو رہی تھی۔ میں موسم کی خوبصورتی کو انجوائے کرتے ہوئے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہی تھی' یوں لگتا تھا جیسے میں کسی انجان دنیا میں ہوں جہاں پر صرف قوس و قزح کے رنگ بکھرے ہوں اور میں انہیں اپنے ہاتھوں میں بھر رہی ہوں۔ اُسی وقت بارش تیز ہو گئی۔ ڈرائیور نے شیشے بند کر دیئے اور گاڑی کے وائپر آن کر دیئے۔ اچانک ہی مجھے وہ پل کے کنارے کھڑا نظر آیا' میں چونک پڑی۔ ہم نہر کے پل سے گزر رہے تھے۔ گاڑی تیزی سے آگے نکل گئی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہا لیکن بارش سے شیشہ دھندلا گیا تھا اور میں کچھ نہیں دیکھ سکی تھی۔

کئی دن تک ایسا ہوتا رہا' روز پل سے گزرتے وقت میں اسے کھڑا دیکھتی' کبھی وہ بھیگ رہا ہوتا اور



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کبھی موسم اگر اچھا ہوتا تو درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہوتا۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا کہ میں اسے گاڑی روک کر بتادوں کہ میں اب گاڑی سے جارہی ہوں لیکن میری ہمت نہیں ہوتی تھی۔ ابی میرے ساتھ ہی بیٹھے ہوتے تھے۔

پھر برسات بھی گزر گئی اور میری پرانی روٹین دوبارہ شروع ہوگئی یعنی میں پیدل مارچ کرتی کالج جانے کے لیے تیار ہوگئی۔

پہلے روز میرا دل بہت دھڑک رہا تھا جیسے بہت بڑے مشن پر جارہی ہوں۔ میرا ضمیر بھی مجھے ملامت کررہا تھا کہ اتنے دن تک وہ میری وجہ سے تکلیف میں رہا۔ کم سے کم میں بتا ہی دیتی۔

نہر کے پل پر وہ میرا منتظر تھا اور خاموشی سے اس طرح میرے ساتھ ہوگیا گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی جیسے یہ روز کا معمول تھا۔ اس نے کچھ پوچھا بھی نہیں اور نہ میں نے کچھ کہا۔ میرا خیال تھا' وہ شکوے کرے گا یا ناراض ہوگا۔ بولتا تو وہ بہت تھا لیکن اس دن وہ خاموش تھا۔ پہلے میں کوشش کرتی تھی کہ اس کی بات نہ سنوں اور آج میں چاہ رہی تھی کہ وہ کچھ کہے تو سہی۔ جب کالج قریب آنے لگا تو وہ یکا یک میرے سامنے آگیا اور میرا راستہ روک لیا۔ اس کے اچانک اس عمل سے میں بوکھلا گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں؟

''میں آپ کے لیے بہت پریشان رہا' اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ کیا آپ بہت بیمار ہوگئی تھیں؟'' اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف بغور دیکھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر میں پریشان ہوگئی۔ وہ بالکل سرخ ہو رہا تھا' اس کی آنکھیں اس بات کا پتہ دے رہی تھیں کہ اسے بہت سخت بخار ہے' غالباً بارش میں بھیگنا اسے راس نہیں آیا تھا۔

یاالٰہی! یہ کیا غضب ہوگیا؟ یہ اتنا سیریس کیسے ہوگیا؟ میں بے فکر اور آزاد لڑکی ہوں' مجھے اس لڑکے سے کوئی خاص لگاؤ بھی نہیں تھا۔ خاموش صرف اس لیے رہتی تھی کہ میرا راستہ جلدی کٹ جاتا تھا اور مجھے اکیلے پن کا احساس نہیں ہوتا تھا مگر یہ کچھ اور ہی سمجھ بیٹھا تھا' تب میں نے سوچا' اس قصے کو ہمیشہ کے لیے ختم کردینا چاہیے۔

''ہٹو میرے آگے سے.....!'' میں نے قدرے چیخ کے کہا تھا۔ ''تم مجھے کیا سمجھتے ہو' میں اتنی گئی گزری نہیں ہوں' آیندہ بھی میرا پیچھا نہیں کرنا۔'' میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی سخت غصے سے کہا اور کالج کے گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔

اس رات جانے کیوں میں بہت بے چین رہی۔ مجھے رہ رہ کر اس پر غصہ بھی آرہا تھا اور دل اس کے لیے دکھی بھی ہورہا تھا۔ اگلی صبح جب میں وہاں سے گزری تو وہ موجود نہیں تھا۔ میں خاموشی سے کالج چلی گئی البتہ راستہ اداس اور لمبا لگ رہا تھا۔ کئی دن گزر گئے' وہ نظر نہیں آیا مگر ہر گزرتے دن کے ساتھ میری بے قراری بڑھتی چلی گئی۔ میری نظریں اسے تلاش کرتی تھیں اور اسے نہ پاکر جانے کیوں دل مغموم ہوجاتا تھا پھر ایک دن میں نے ڈرائیور سے کہا کہ مجھے آفس جاتے وقت ابی کے ساتھ ہی لے لینا۔ میں بہت تھک گئی ہوں' اب مجھ سے پیدل نہیں چلا جاتا۔

اس واقعے کو کئی سال گزر گئے ہیں مگر اس اجنبی کی یاد میں اپنے دل سے کھرچ نہیں پائی۔ اکثر خیال آتا ہے کہ کیا میں نے اس کا دل دکھایا ہے جو مجھے قرار نہیں آتا؟ آپ ہی بتایئے' میں کیا کروں حالانکہ میں نے اپنی دانست میں اسے ڈانٹ کر کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔



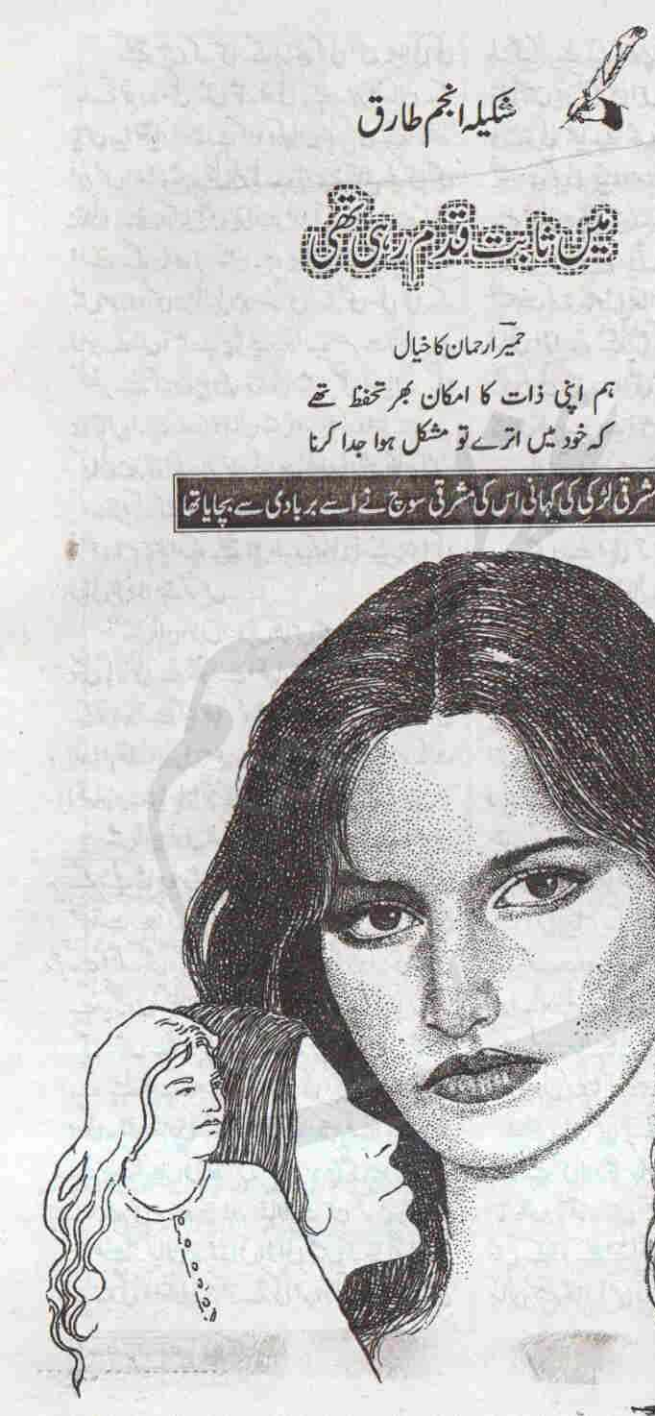

شکیلہ انجم طارق

# میں ثابت قدم رہی تھی

حمیرا رحمان کا خیال

ہم اپنی ذات کا امکان بھر تحفظ تھے
کہ خود میں اترے تو مشکل ہوا جدا کرنا

**ایک خالص مشرقی لڑکی کی کہانی اس کی مشرقی سوچ نے اسے بربادی سے بچایا تھا**

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہتے ہیں کہ کسی کے ساتھ کوئی بھی بھلائی کی جائے تو وہ نیکی میں شمار ہوتی ہے۔ ہر انسان کے پاس یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ کہاں اور کس کے ساتھ اور کس انداز میں نیکی کرتا ہے؟ اپنے آپ کو کسی بھی برائی سے روکنا بھی بذاتِ خود ایک نیکی ہے' اپنی ذات کے ساتھ احسان ہے یہاں تک کہ دوسرے میں موجود کسی برائی کی حوصلہ شکنی کرنا بھی نیکی ہی کے زمرے میں آتا ہے چنانچہ یہ تو اب حضرتِ انسان پر منحصر ہے کہ وہ پوری زندگی میں کتنی نیکیاں' کتنی برائیاں اپنے نامۂ اعمال میں درج کرواتا ہے۔ یہ کہانی میری ایک عزیزہ کی ہے' قصداً رشتہ ظاہر نہیں کر رہی کیونکہ اس میں کچھ قباحتیں ہیں' سو ہم اُس کا فرضی نام چندا رکھ لیتے ہیں۔ یہ کہانی آپ چندا کی زبانی ہی ملاحظہ کریں۔

''میں اُن دنوں دسویں کلاس میں پڑھتی تھی جب پہلی بار کسی نے مجھ سے اظہارِ محبت میری ایک کزن کے توسط سے کیا تھا' گویا یہ ایک طرح سے حفاظتی اقدام تھا۔ دوسری صورت بہت ممکن تھا کہ ڈائریکٹ اظہارِ محبت کیا جاتا تو گالیاں یا جوتے پڑتے۔

میں اُن دنوں عمر کی جس سیڑھی پہ تھی' ایسے کاموں کے لیے شاید وہ عمر پرفیکٹ سمجھی جاتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میری اپنی سوچ' اُس طرح کی سوچ سے الگ تھی جس طرح عام لڑکے لڑکیوں کی ہوتی ہے' یہ گلیوں' محلوں کی محبت مجھے صرف ٹائم پاس لگتی تھی۔ میں نے سوچا ہوا تھا کہ میری زندگی میں شادی سے پہلے محبت وحبت' پیار ویار کی کبھی کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ میں شادی کے بعد صرف اور صرف اپنے شوہر سے محبت کروں گی' خالص مشرقی سوچ تھی میری۔

میری یہ سوچ اور خیالات سن کر میری ہم جماعت لڑکیاں میرا مذاق اڑاتی تھیں کہ یہی تو ہلہ گلہ اور زندگی کو انجوائے کرنے کی عمر ہوتی ہے لیکن میں ہلہ گلہ کرنے کے نام پر اپنی عزت داؤ پر لگانے پہ کبھی تیار نہیں ہو سکتی تھی اس لیے سہیلیوں کی باتوں کا برا ماننے کی بجائے میں ہنس دیتی تھی اور انہیں بھی نصیحت کرتی جسے وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی تھیں۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا تھا' نہ انہوں نے اپنی روش بدلی تھی نہ میں نے انہیں نصیحت کرنا چھوڑا تھا اور یہ بات بھی اپنی جگہ تھی کہ مذاق اڑانے کے قطع نظر سب لڑکیاں میری عزت بھی کرتی تھیں۔ واقعی مضبوط کردار کسی بھی انسان کی پہچان کا سب سے خوبصورت ذریعہ ہوتا ہے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی اس لڑکے کی اور میری کزن کی' آپ اُس لڑکے کا نام رضا سمجھ لیں۔

میں نے اپنی کزن کی ساری بات بڑے تحمل سے سنی تھی اور اشتعال میں آئے بغیر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میری زندگی میں نہ کسی ایسے لڑکے کی گنجائش ہے' نہ ایسے فضول کاموں کے لیے میرے پاس کوئی وقت ہے اس لیے برائے مہربانی دوبارہ اس قسم کا پیغام مجھ تک لانے کی زحمت نہ کی جائے ورنہ میں سب کو بتا دوں گی۔ میں نے بالکل درست مقام پر تیر چلایا تھا جو کہ نشانے پر لگا تھا۔ میری کزن صاحبہ گھبرا کے بھاگ کھڑی ہوئی تھیں۔

اس پیغام کے تقریباً دو سال بعد اس لڑکے رضا نے مجھ سے دوبارہ رابطہ کیا تھا کہ میرا پیار سچا ہے' میں صرف اور صرف آپ کو چاہتا ہوں۔ کسی کو آزمانے کے لیے دو سال کافی ہوتے ہیں۔ پلیز' میرا پیار' میری دوستی قبول کر لو تاکہ مجھے بھی سکون و قرار آ جائے۔

اس بار اُس لڑکے رضا نے پیغامِ محبت دینے کے لیے کسی اور کا سہارا لینے کی بجائے خود مجھے چھوٹا سا رقعہ دیا تھا۔ میں جس بس میں کالج جاتی تھی' اسی بس کے ذریعے رضا بھی کالج جاتا تھا۔ وہ مجھ سے دو سال سینئر تھا۔ اُس روز اُس نے موقع پا کر مجھے دو



رقعہ دیا تھا اور خود کالج سے ایک اسٹاپ پیچھے ہی اتر گیا تھا۔

کالج آ کے فری پیریڈ میں' میں نے وہ رقعہ پڑھا تھا۔ 'اوہو' تو موصوف کی طبیعت ابھی بھی مائل بہ عشق ہے۔ عشق کا بخار اترنے کی بجائے مزید چڑھ گیا ہے۔' میں نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے وہ رقعہ پھاڑ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اور پھر اُسی شام میں نے اپنی ایک عزیز دوست شکیلہ کو فون کیا تھا کیونکہ میرے اپنے خیال میں بات اب تھوڑی سی بڑھ چکی تھی' اگرچہ میں نے رضا کے ابتدائی اظہارِ محبت پر کسی بھی قسم کا ردِعمل یا کوئی جواب نہ دے کر بہت عقل مندی کا ثبوت دیا تھا لیکن اب مجھے پانی سر سے اونچا ہوتا نظر آ رہا تھا۔

شکیلہ میری بہت اچھی اور سچی دوست تھی' وہ بہت مضبوط کردار کی مالک تھی' اُس کے بھی خیالات میرے جیسے ہی تھے اور وہ مجھے بہترین مشوروں سے نوازتی تھی۔

شکیلہ نے مجھے یہی مشورہ دیا تھا کہ رضا کو بالکل بھی لفٹ نہ کراؤ' اسے کسی بھی رقعے وغیرہ کا کبھی بھی جواب نہ دو۔ ایسا کرنے سے اس کی پیش قدمی خود بخود رک جائے گی۔

میرا تعلق جس فیملی سے تھا' وہاں رشتے فیملی سے باہر نہیں ہوتے تھے اور ایسے کسی قدم اور بغاوت کو بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ خیر' بات آئی گئی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد رضا نے دوبارہ کوئی ایسی شرارت نہیں کی' وہ میں بھی مطمئن ہو کر دل جمعی سے پڑھائی میں مصروف ہو گئی یہاں تک کہ بی اے بہت اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔

•.....•.....•

بی اے کے بعد ایم اے کے ایڈمیشن اسٹارٹ ہوئے تو میں نے ایم اے انگلش میں ایڈمیشن لے

## ❄میں چاہتا ہوں.....❄

میں چاہتا ہوں' رب ذوالجلال کا انعام ہو
دنیا میں اس قوم کا بھی اونچا مقام ہو
پاک وطن کا ہر شہری لائقِ صداحترام ہو
ہے دُعا کہ پاک وطن گہوارۂ اسلام ہو
میں چاہتا ہوں' پاک وطن میں امن وسکون ہو
نہ کہیں فتنہ ہو برپا نہ کسی کا خون ہو
نہ کہیں خودکش بمبار نہ فضائی ڈرون ہو
پاک وطن سے الفت کا ہر اک کو جنون ہو
میں چاہتا ہوں دنیا میں اپنی اک پہچان ہو
سندھی ہو' پنجابی ہو' بلوچی یا پٹھان ہو
اک لڑی میں ہم پروئے پھولوں کی مثال ہوں
چاروں صوبوں کی اک جان پیارا پاکستان ہو
میں چاہتا ہوں' پاک وطن میں علم وہنر عام ہو
نہ پھرے بے کار کوئی' سب کے لیے کام ہو
مسکراتی صبح ہو اور گنگناتی شام ہو
قریہ قریہ امن ہو' سکون ہو' آرام ہو
میں چاہتا ہوں کہ انصاف بھی ہوتا دکھائی دے
پاک وطن میں کوئی مظلوم نہ روتا دکھائی دے
گر انصاف ہو شفاف اے عدل کے منصفو.....!
شہنشاہ راز بھی تمہاری صفائی دے
میں چاہتا ہوں' مزدوروں کی سب سے اونچی شان ہو
ہر میدان میں' ہر طوفان میں' ہر مشکل آسان ہو
دھوبی' موچی' مستری' نائی اور خوشحال کسان ہو
سورج' چاند' ستارا' جی آ' پیارا پاکستان ہو

عبدالعزیز جی آ.....چکوال سٹی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیا۔ ایڈمیشن والے دن رضا سے میرا ٹاکرا ہوگیا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر مجھے سلام کیا۔

میں نے نہایت پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

''وعلیکم السلام! جی' کہیے؟''

''یہاں نہیں مس' پلیز' اگر آپ اجازت دیں تو صرف چند منٹ لوں گا' میں اپنی بات بہت سنجیدگی کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں۔''

رضا نے یہ سب اتنے التجا بھرے لہجے میں شائستگی سے کہا تھا کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہمراہ یونیورسٹی کیفے میں آ گئی تھی جہاں اُس نے دو کپ کافی آرڈر کی تھی اور پھر کو یا ہوا تھا۔

''مس چندا..... میں آپ کے لیے پچھلے پانچ سال سے خوار ہو رہا ہوں لیکن آپ ہیں کہ مجھے مسلسل نو لفٹ کا بورڈ دکھا رہی ہیں۔ پلیز' مجھ پر ترس کھائیے اور میری دوستی یا چاہت جو بھی آپ سمجھ لیں' قبول کر لیں۔ میں آپ کے سوا کسی کو نہیں چاہ سکتا نہ کسی کا بن سکتا ہوں کیونکہ آپ میری آئیڈیل ہیں۔ آخر ایسی کیا وجہ ہے جو آپ مجھ سے اتنا گریز کر رہی ہیں؟ کیا میں خوبصورت نہیں؟ پڑھا لکھا نہیں؟ آخر کیا کمی ہے مجھ میں؟''

میں نے پہلی بار رضا کو بغور دیکھا تھا۔ وہ کافی خوبصورت نوجوان تھا۔ کوئی بھی لڑکی اس سے دوستی کے لیے بخوشی تیار ہو سکتی تھی لیکن کم از کم وہ لڑکی میں نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے بہت نرمی سے کہا تھا۔ ''رضا صاحب' آپ جانتے ہیں کہ میرا تعلق ایک بہت معزز فیملی سے ہے جہاں عزت کے لیے جان دی بھی اور لی بھی جا سکتی ہے اور پھر میں اس طرح کی لڑکی نہیں ہوں جیسی آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں آپ کے جذبات کی قدر کرتی ہوں لیکن آپ کی یا کسی بھی لڑکے کی کسی بھی قسم کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتی کیونکہ ہر انسان کو زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا حق حاصل ہے تو فیصلے کرنے کا حق بھی تو ہے۔ آپ خوامخواہ اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ اپنی راہ لیں' یہیں سے پلٹ جائیں' یہی آپ کے لیے مناسب ہے۔ امید ہے' آپ دوبارہ مجھے ڈسٹرب کرنے کی یا کچھ کہنے کی کوئی بھی ٹٹی سی کوشش نہیں کریں گے کیونکہ میں ذرا اور ٹائپ کی لڑکی ہوں' مجھے یہ چیزیں بالکل بھی متاثر نہیں کرتیں نہ میں یہ خوشنما فریب کھانا چاہتی ہوں۔''

میرا لیا دیا انداز دیکھ کر رضا سخت مایوس ہو کر چلا گیا تھا اور میں بھی کافی پیے بنا اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

•.....•.....•

وقت گزرنے کے ساتھ جیسے ہی میری پڑھائی ختم ہوئی تھی' میری شادی ہوگئی تھی اور آج میں اپنے گھر میں بے حد خوش و خرم اور بہترین زندگی گزار رہی ہوں۔ میرے شوہر میرے سب سے اچھے دوست ہیں اور اتنے فرینڈلی ہیں کہ انہی کے اصرار پر میں نے اپنی یہ کہانی شکیلہ کو سنانے کا ارادہ کیا کیونکہ میں چاہتی ہوں کہ میری یہ کہانی پڑھ کر کوئی ایک لڑکی بھی راہِ راست پر آ جائے تو یہ میری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔

بات کچھ یوں ہے کہ رضا سے اُس آخری ملاقات کے بعد مجھ پر بس اچانک ہی ایک دوست کے ذریعے انکشاف ہوا تھا کہ رضا نے اپنے کچھ آوارہ قسم کے دوستوں کے ساتھ یہ شرط لگائی ہوئی تھی کہ وہ مجھ جیسی لیے دیے رہنے والی لڑکی کو اپنے جال میں پھنسا کر دکھائے گا اور زیادہ کچھ نہیں تو کم از کم میرا نام تو اپنے نام کے ساتھ جوڑ کے خوب اچھا گا لیکن یہ تو گھر والوں کی تربیت اور میرے اپنے اللہ کے کرم سے بہت اچھا ہوا کہ میں ثابت قدم رہی تھی اور وہ اپنے برے مقصد میں ناکام ہوگیا تھا۔



فیضان حسین عثمانی

# یقینِ کامل

حزیں صدیقی کا خیال

ادراک کی حد میں ہے نہ محدودِ گماں ہے
محسوس کرے کوئی تو رگ رگ میں رواں ہے

**بڑی سے بڑی مصیبت اور پریشانی سے نکلنے کا نسخہ بتاتی ایک زوداثر کہانی**

یہ کہانی شاید آپ کو زیادہ متاثر نہ کر سکے کیونکہ اس میں نہ تو تھرل ہے نہ سسپنس اور نہ کوئی مصالحہ ہے مگر اِسے پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی ذات پر آپ کے یقین میں مزید پختگی آ سکتی ہے۔

یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب میری شادی ہو رہی تھی۔ میں اپنی شادی کے کارڈز لے کر اپنے دوستوں کے پاس حیدرآباد گیا تھا۔ وہاں میرے ایک بہت اچھے اور خاص دوست بھی رہائش پذیر ہیں۔ اُن کے لیے 'ہیں' کا صیغہ اس لیے استعمال کیا ہے کہ وہ مجھ سے عمر میں بڑے ہیں۔ یونیورسٹی میں ایم اے کرنے کے دوران میری اُن سے دوستی ہوئی تھی جو کہ سات سال بعد بھی نہ صرف قائم ہے بلکہ ہر

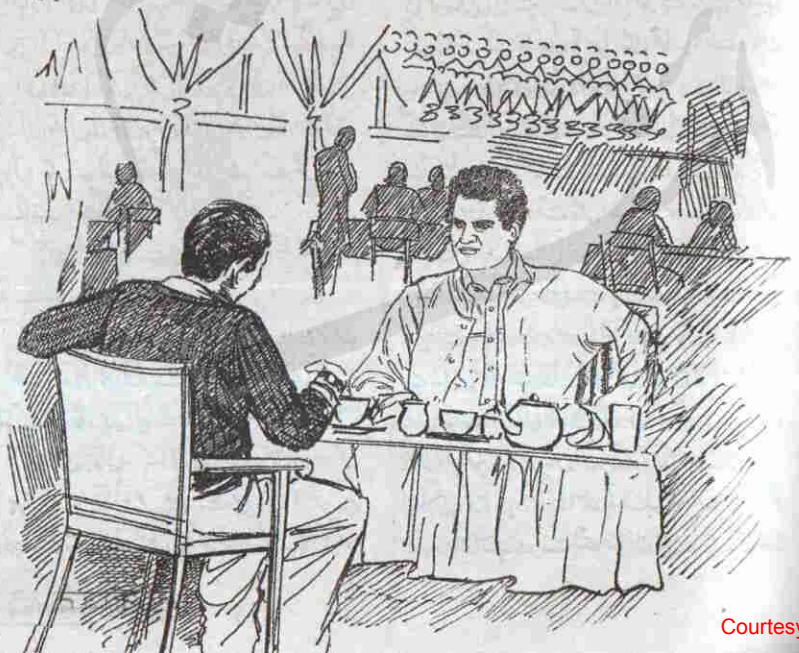

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گزرتے لمحے کے ساتھ مضبوط ہوتی چلی گئی ہے۔ ہمارے دوست ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ہمارے فیملی ڈاکٹر بھی ہیں۔ جب بھی میرا حیدرآباد کا چکر لگتا ہے تو ڈاکٹر صاحب کے ساتھ نشست ضرور ہوتی ہے۔ یہ نشست کبھی اُن کے گھر پر تو کبھی اسکول میں یا پھر اُن کے کلینک پر ہوتی تھی۔ اِس نشست میں عموماً خاص علمی اور ادبی گفتگو ہوتی تھی۔ اس دوران ہم ایک دوسرے سے اپنے ذاتی معاملات بھی شیئر کر لیتے تھے۔

جب میں کارڈ لے کر اُن کی رہائش گاہ واقع لطیف آباد 8 نمبر پہنچا تو ڈاکٹر صاحب مجھے لے کر ایک قریبی بینک چلے گئے جہاں انہیں اپنا بجلی کا بل ادا کرنا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی بچی بھی اُن کے ہمراہ تھی جو کہ انہیں پریشان کر رہی تھی اس لیے انہوں نے بل میرے ہاتھ میں تھما دیا کہ اسے جمع کرا دوں۔ میں نے بجلی کا بل تو جمع کرا دیا تھا مگر اتنے کم اماؤنٹ کا بل دیکھ کر مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ بجلی کا بل اتنا کم بھی آ سکتا ہے؟ ہمارے یہ دوست اپنی ہربل پروڈکٹ بھی مارکیٹ میں لاؤنچ کرتے رہتے ہیں۔ اس کاروبار میں انہیں فائدہ بھی ہوتا اور نقصان بھی۔ اُن دنوں اُن کا ہربل بزنس بحران کا شکار تھا۔ بہرحال میں نے اتنے کم اماؤنٹ کے بل کے حوالے سے بات کی تو وہ مسکرا دیئے تھے۔

''کہیں اطمینان سے بیٹھ کر آپ کی تشویش دور کر دیتے ہیں۔''

ہم لوگ قریبی کیفے ٹیریا میں بیٹھ کر کولڈ ڈرنک سے لطف اندوز ہونے لگے پھر ڈاکٹر صاحب نے اپنی بات کا آغاز یوں کیا۔

''فیضان بھائی.....! آپ تو جانتے ہی ہو کہ میرا ہربل بزنس کافی عرصے سے بحران کا شکار ہے' اسی وجہ سے میں نے پہلے والا گھر چھوڑ کر یہ چھوٹا گھر کرائے پر لیا ہے تاکہ اخراجات کم سے کم ہوں' خاص کر یوٹیلیٹی بلز کی وجہ سے مجھے وہ گھر چھوڑنا پڑا مگر اس دوسرے گھر میں بھی آتے ہی بجلی کے بل نے مجھے جھٹکا لگا دیا۔ مجھے آئے ہوئے ایک ماہ ہو رہا تھا لیکن اس دو کمروں کے مکان کا بل 20 ہزار روپے آ گیا۔ میرے تو ہوش اڑ گئے..... میرے مالی حالات ویسے ہی اس قدر خراب تھے کہ میں تو اُس وقت بیس ہزار کیا' دو ہزار کا بل بھی قرض لے کر بھر پاتا۔ میں نے بل کی درستگی کے لیے حیسکو آفس کے چکر لگائے مگر وہاں میرا مسئلہ حل ہونے کے بجائے دھکے ہی ملے۔ ایک کلرک دوسرے کے پاس بھیج دیتا تو دوسرا' تیسرے کی جانب رخ کر دیتا۔ اسی پریشانی میں تین دن گزر گئے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ آپ کے بل میں ڈیکشن لگ کر آیا ہے۔ آپ نے میٹر میں گڑبڑ کروائی ہوئی ہے۔ یہ سن کر تو میں انتہائی پریشان ہو گیا۔ وہ صاحب بولے کہ آپ تین یا چار اقساط کروا لیں۔ چار اقساط کا مطلب تھا' ایک قسط 5 ہزار کی جبکہ اس وقت تو میری مالی حالت بہت خراب تھی۔ اللہ کے سوا کوئی آسرا نہیں تھا۔ مالک مکان صاحب سے شکایت کی تو وہ یہ کہہ کر بری الذمہ ہو گئے کہ مجھے اس حوالے سے کچھ نہیں معلوم۔ ہوسکتا ہے' پہلے والے کرائے دار نے میٹر میں کچھ گڑبڑ کروائی ہو؟ اُس وقت میں اللہ کو یاد کرنے لگا کیونکہ آپ بھی جانتے ہیں' جب ڈیکشن لگ جائے تو واپڈا والے اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑتے جبکہ میٹر سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس میں گڑبڑ کی گئی ہے۔ اس صورتِ حال میں بس اللہ ہی کا آسرا تھا۔ جوں جوں آخری تاریخ آ رہی تھی' میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں اللہ کے آگے سربسجود ہو کر دُعائیں کرتا رہا' گڑگڑاتا رہا کہ اے مالک و مولا! تو سب جانتا ہے' میرے ہاتھ صاف ہیں۔ میں کسی غلط



کام میں شامل نہیں ہوں۔ پاک پروردگار! میرے حالات اس قابل نہیں جو یہ بوجھ برداشت کر سکیں۔ تو ہی میرا سہارا اور آسرا ہے۔ تو میری مدد فرما۔ اے رَبِ ذوالجلال! اپنی رحمت کے صدقے' مجھے اس مصیبت سے نکال دے۔ میں اور بھی جانے کتنی دُعائیں مانگتا رہا۔ دن اور رات اٹھتے بیٹھتے میرے لبوں پر یہ ہی دُعا ہوتی تھی کہ کسی طرح مالک و مولا مجھے اس مشکل سے نکال دے۔ جیسے جیسے بل جمع کرانے کی تاریخ آ رہی تھی' میری پریشانی سوا ہو رہی تھی۔ حیسکو والے کسی بھی دن آ کر میٹر کو چیک کر سکتے تھے۔ میں پریشان ضرور تھا مگر مایوس نہیں۔ مجھے کامل یقین تھا کہ میرا رَب مجھے اس پریشانی سے نجات عطا کرے گا۔ میرے لب پر ہر وقت ہی دُعا تھی اور پھر واقعی میرے رَب نے میری دُعائیں رائیگاں نہیں جانے دیں۔ اس نے میری سن لی اور اس طرح سنی کہ میں حیران رہ گیا۔ وہ اپنی رحمت کے ایسے کرشمے دکھاتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

اُس دن اسی پریشانی کے عالم میں گھر میں بیٹھا تھا۔ گرمی اتنی شدید تھی کہ سورج آگ برسا رہا تھا' اوپر سے واپڈا والوں نے لائٹ بند کر کے دہرے عذاب سے دوچار کر دیا تھا مگر میں ہر طرف سے بے نیاز اپنی پریشانی میں گم تھا۔ یکا یک آسمان پر کالی گھٹائیں چھا گئیں اور موسلا دھار طوفانی بارش شروع ہو گئی۔

''یا اللہ! تیری شان! بھی اتنی قیامت کی گرمی اور ابھی یہ موسم۔'' میں یہ سوچتا ہوا کھڑا ہوا۔ بارش ایسی زوردار تھی کہ لگتا تھا' آج سب کچھ تہہ و بالا کر دے گی۔ اُسی وقت یکا یک گلی میں شور مچ گیا۔

''آگ لگ گئی..... آگ لگ گئی.....''

میں بھی باہر دوڑا تو دیکھا کہ کھمبے پر لگے ہوئے بجلی کے میٹرز میں آگ لگی ہوئی تھی۔ واضح رہے کہ چند دن پہلے ہی واپڈا نے بجلی کے میٹر گھر کے دروازے سے کھمبوں پر منتقل کیے تھے تاکہ بجلی کی چوری کو روکا جا سکے۔ اُن ہی میٹرز سے آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے تمام میٹرز جل کر خاکستر ہو گئے تھے۔ ان میں میرے گھر کا میٹر بھی تھا۔ میں حیران و پریشان گھر کے باہر کھڑا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر میں بارش رک چکی تھی۔ لوگ بارش کو رحمت کے بجائے زحمت سے تعبیر کر رہے تھے کیونکہ اُن سب کے میٹرز جل گئے تھے جبکہ میں اُس بارش کو اللہ پاک کی رحمت کے کرشمے سے تعبیر کر رہا تھا جو اس نے میری دُعاؤں کی قبولیت کے بدلے میں دکھایا تھا۔ میرے میٹر کی حالت سب سے خاکستر تھی۔ میٹر جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ بارش رکنے ساتھ ہی آگ بھی بجھ چکی تھی اور دھوپ دوبارہ سے نکل گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میرے پروردگار نے صرف میری مدد کے لیے اپنی قدرت کا یہ نظارہ دکھایا تھا۔ بعد میں بجلی کے محکمے والوں نے اُن سب کی بجلی ڈائریکٹ کر دی تھی جن کے میٹرز جلے تھے۔ میں بھی اُن میں شامل تھا۔ اس طرح میرا ڈیکشن خود بخود ختم ہو گیا تھا کیونکہ میٹر چیک ہونے سے پہلے ہی جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد نیا میٹر لگ گیا تھا اور یہ اتنا کم بل تمہیں اسی لیے نظر آ رہا ہے۔ میں تو اپنے رَب کے حضور ہر وقت دُعا کرتا ہوں کہ ہر مصیبت زدہ و پریشان حال مسلمان کی پریشانی اسی طرح حل فرمائے جس طرح میری مشکل حل کر دی۔'' ڈاکٹر صاحب کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں جسے انہوں نے رومال سے صاف کیا اور پھر میں اُن کے پاس سے اٹھ گیا تھا۔ گھر آ کر میں کتنی ہی دیر تک سوچتا رہا کہ اگر ہم اپنے رَب کو سچے دل سے پکاریں تو وہ رحیم و کریم رَب ضرور سنتا ہے۔ شرط صرف ایمان و یقین کی پختگی کی ہے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میجر (ر) امتیاز حسین ملک

# دیارِ سنگ

حمیرا راحت کا خیال

جو منزل تک جا کے اور کہیں مڑ جائے
تم ایسے رستے کے دکھ سے ناواقف ہو

**وفا کے نام پر لٹ جانے والی اس شعلۂ جاں کا قصہ جو سراپا انتقام بن گئی تھی**

مارچ 1998ء کے اوائل میں اس سے آخری دفعہ بات ہوئی تھی۔ شام کوئی سات بجے کے قریب فون آیا۔ ہمارے تعلقات اتنے ہی تھے کہ اس کے نام بتانے پر بھی میں نے اسے نہیں پہچانا پھر جب اس نے انور اور کوئٹہ کا حوالہ دیا تو میں نے پہچان لیا لیکن حیرت ضرور ہوئی۔ تعارف کراتے اور انور کا حوالہ دیتے ہوئے وہ کافی جھجکی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس حوالے میں کچھ بھی قابلِ فخر نہیں تھا۔ جھجک کی ایک وجہ شاید میری طبیعت اور مزاج بھی ہو۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میں اس جیسی عورت میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ میں نے کوئٹہ میں رہتے ہوئے بھی اس سے کبھی تعلق نہیں رکھا تھا جہاں وہ میرے لیے ایک کھلی کتاب تھی جہاں اس سے رابطہ یا تعلق کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اس کے رابطے سے پریشانی بھی تھی کیونکہ یہ شرمندگی کا باعث بھی ہو سکتا تھا۔ مجھے اس کے مردوں سے تعلقات کا علم تھا لیکن انور میرا بہت قریبی دوست تھا۔ اس کے حوالے سے آئے ہوئے کسی بھی شخص کا خیال رکھنا بہت ضروری تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ انور کو شکایت کا موقع ملے اس لیے میں نے اس سے ٹھیک طرح بات کی۔ وہ کسی کام سے اسلام آباد آئی تھی اور کسی دوست کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔ میں نے سوچا، شاید اس کا یہاں کوئی کام ہو اور میں کچھ کر سکوں اس لیے تکلفاً پوچھ لیا کہ اگر میرے لائق کچھ کام ہو تو بتائیے؟ لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا، بس یہی کہا کہ آپ کا نمبر میرے پاس تھا، سوچا کہ بات کر لوں۔ بات ختم ہو گئی لیکن میں دیر تک سوچتا رہا کہ آخر اس نے مجھے فون کیوں کیا جبکہ ہمارے کوئی ایسے تعلقات بھی نہیں تھے؟ ایک جوان عورت اپنے سے زیادہ عمر کے مرد کو کیوں فون کر سکتی ہے وہ بھی اس کردار اور قماش کی عورت؟ کہیں وہ مجھے بھی اپنے کردار کا تو نہیں سمجھتی کہ غلط توقعات رکھتی ہو؟ لیکن وہ تو مجھے جانتی تھی پھر ایسی توقعات کیسے رکھ سکتی تھی؟ جتنا بھی سوچا، منفی خیالات ہی ذہن میں آئے۔ شاید اس کا سابقہ کردار





ذہن میں رچا بسا تھا لیکن کبھی روشنی کی ایک لکیر سی ذہن میں رینگ آتی۔ مثبت خیال کی کرن کہ کہیں اس کا کوئی کام ہی نہ ہو اور اس کے لیے مدد چاہتی ہو لیکن اب کیا ہو سکتا تھا سوائے انتظار کے۔ خیر، کام ہوا تو خود ہی دوبارہ فون کر لے گی۔ ڈر کے مارے میں نے تو اس سے فون نمبر بھی نہیں لیا تھا کہ کہیں غلط نہ سمجھ لے پھر بات آئی گئی ہو گئی نہ ہی اس نے رابطہ کیا نہ ہی میں نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت تھی۔ کچھ دنوں کے بعد انور کا فون آیا۔ اس نے پوچھا کہ سائرہ کا فون آیا تھا۔ میں نے بتایا کہ ہاں، آیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''تو پھر؟''

''تو پھر کیا، اس نے کوئی کام تو بتایا نہیں کہ اس کے لیے کچھ کرتا، اس کے علاوہ تو تم مجھے جانتے ہی ہو نہ میں اس کا اچار ڈال سکتا تھا نہ مربہ لیکن تم نے اسے میرا فون نمبر کیوں دیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ویسے ہی وہ اسلام آباد آ رہی تھی، کہنے لگی، اگر اسلام آباد میں کوئی واقف ہو تو نمبر دے دیں، شاید ضرورت پڑے۔ میرے پاس آپ کا نمبر تھا، میں نے دے دیا کہ شاید اس کی مدد کر سکیں۔'' اس کے بعد کافی عرصہ اس کا ذکر نہ ہوا۔

جولائی 1999ء میں، میں کوئٹہ آ گیا۔ انور سے تقریباً روز ملاقات ہوتی تھی لیکن سائرہ نہ تو اس کے پاس کبھی نظر آئی نہ ہی اس کا ذکر چھڑا۔ مجھے اس پر کافی حیرت ہوئی کیونکہ پہلے تو اس کا ذکر اکثر ہی رہتا تھا اور اس کے ہاں آتی بھی رہتی تھی۔ کچھ عرصہ تو میں یہی سمجھتا رہا کہ شاید کوئٹہ سے باہر گئی ہوئی ہے اس لیے نہیں آ رہی۔ آخر ایک دن اس کا ذکر چھڑ ہی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گیا۔ میرے پوچھنے پر انور نے بتایا کہ اسے خود اس کے متعلق کچھ علم نہیں۔ پتہ نہیں کہاں غائب ہو گئی ہے؟ سن کر حیرت ہوئی۔ کہاں تو اتنے تعلقات اور کہاں یہ حالت کہ کچھ خبر ہی نہیں۔ ضرور کچھ دال میں کالا تھا۔ میں نے پوچھا کہ تم نے رابطے کی بھی کوشش نہیں کی۔

''رابطہ کیسے کرتا؟ نہ تو میرے پاس اس کا فون نمبر تھا اور نہ پتہ۔ اس سے کئی دفعہ مانگا تھا لیکن دیتی ہی نہیں تھی' ٹال دیتی۔ اب اس کے بغیر اسے کیسے تلاش کرتا؟ وہ خود ہی رابطہ کرتی تھی۔ اب اس نے خود ہی رابطہ توڑ لیا ہے۔ اصل میں اس کا تعلق ایک معزز خاندان سے تھا۔ خاندان اور گھر کی عزت کا اس کو اتنا خیال یا خوف تھا کہ کسی کو بھی پتہ یا فون نمبر نہیں بتاتی تھی نہ ہی گھر یا خاندان کی کوئی اور تفصیلات بتاتی۔ پہلے اس کی کوئی ایسی ضرورت بھی نہیں پڑی تھی کیونکہ وہ خود جلدی جلدی رابطہ کرتی تھی۔''

''عجیب سی بات ہے' اگر اسے اپنے گھر اور خاندان کی عزت کا اتنا خیال تھا تو اس نے اس قسم کے تعلقات کیوں رکھے ہوئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ اس کی مجبوری تھی ورنہ کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں تھی۔'' انور نے بتایا۔

''لیکن ایسی بھی کیا مجبوری تھی کہ ایک معزز گھرانے کی لڑکی ان راہوں پر چل نکلی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے' کسی دن آرام سے سناؤں گا۔'' انور نے کہا۔

اب میں اس کو مجبور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ فوراً سنا دے ورنہ دل تو یہی چاہتا تھا۔ ڈر یہ تھا کہ کہیں وہ یہ نہ پوچھ لے کہ آخر تمہیں اس میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ کہیں تم بھی تو اس کے ساتھ تعلقات تو نہیں رکھتے تھے؟

پھر ایک دن انور نے اس کی داستان سنا ہی دی۔ ''یہ 1991ء کے آخر کی بات ہے' ایک دن میں اور اسلم ہسپتال گئے ہوئے تھے۔ ہسپتال سے واپسی پر جیسے ہی ہم لوگ گیٹ سے باہر نکلے' چادر میں لپٹی ایک خاتون نے ہاتھ کے اشارے سے ہماری گاڑی روکی۔ اس سے پہلے کہ ہم اس سے کچھ پوچھتے' اس نے خود ہی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گئی۔ میرے لیے تو یہ کوئی نئی چیز نہیں تھی لیکن اسلم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اندر بیٹھ کر اس نے منہ سے چادر ہٹائی۔ وہ کوئی پچیس سال کی خوبرو لڑکی تھی' رنگ گورا' قد لمبا' آنکھیں بڑی بڑی اور بال سیاہ تھے لیکن پتہ نہیں کیوں اس کی آنکھیں کچھ عجیب سی لگتی تھیں' ویران ویران سی' ان میں وہ رونق نہیں تھی جو اس عمر کی لڑکیوں کی آنکھوں میں ہوا کرتی ہے۔ خاموشی کو اس نے توڑا۔ ''اس طرح گاڑی روکنے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ اگر زحمت نہ ہو تو مجھے جناح روڈ تک چھوڑ دیں۔''

اتنی خوبصورت لڑکی کا ساتھ زحمت کیا' رحمت تھا۔ جناح روڈ تو نزدیک ہی تھا' وہ تو ہمیں کہیں کا بھی کہتی' ہم خوشی سے لے جاتے۔ بہرحال ہم نے اسے خوش آمدید کہا اور اسے جہاں بھی وہ چاہے' چھوڑ دینے پر خوشی کا اظہار کیا۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ گئی۔ ہم نے اپنا تعارف کرایا۔ شاید اس امید پر کہ وہ بھی اپنا تعارف کرائے گی لیکن اس نے اپنا تعارف صرف اپنے نام تک ہی محدود رکھا۔

''میرا نام سائرہ ہے۔'' اس کے الفاظ شہد میں ڈوبے ہوئے تھے۔ شاید وہ اس سے زیادہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ ہم نے بھی اسے مجبور نہیں کیا۔ جناح روڈ پر اس نے گاڑی رکوائی۔ اس کے اترنے سے پہلے میں نے ان الفاظ کے ساتھ اپنا کارڈ اس کے حوالے کیا کہ اگر وہ مناسب سمجھے یا میرے لائق کوئی



خدمت ہو تو رابطہ کرے۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور خدا حافظ کہہ کر گاڑی سے اتر گئی۔ راستہ بھر کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ ہم دونوں اس ڈر سے نہیں بولے کہ کہیں غلط تاثر نہ لے۔ پہلا تاثر (first impression) اچھا ہونا چاہیے۔ شاید وہ بھی اسی چکر میں ہو یا پھر یہ دیکھنا چاہتی ہو کہ ہم کس قسم کے لوگ ہیں؟ خیر' کارڈ تو دے ہی دیا تا' پتہ چل ہی جائے گا کہ کس قسم کی لڑکی ہے؟

دوسرے دن صبح ہی صبح اس کا فون آ گیا۔ دل خوش ہو گیا لیکن سارا معاملہ بھی واضح ہو گیا۔ ایک جوان لڑکی اگر کسی معمر شخص سے رابطہ کرے تو اس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ مطلب براری کے علاوہ کچھ نہیں۔ مطلب پیسے بٹورنا ہو سکتا ہے یا کوئی کام نکلوانا۔ اس وسیلے سے کسی بڑے آدمی تک رسائی بھی ہو سکتی ہے۔ یہی سیڑھیاں ہیں جو لڑکیاں خود یا ان کو استعمال کرنے والے استعمال کرتے ہیں۔ اب اس کے کردار کے متعلق کوئی شک نہیں رہ گیا تھا۔ اس کے فون نے سب کچھ واضح کر دیا تھا۔ جو کچھ جھجک یا خوف میرے دل میں تھا' وہ نکل گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ اس نے ہم ہی سے رابطہ کیوں قائم کیا؟ ہماری ہی گاڑی کیوں روکی؟ یا تو یہ ہمیں پہچانتی تھی اور پہلے سے ہی ہمارے پیچھے تھی یا جو لوگ اس کے پیچھے تھے' انہوں نے اسے ہمارا ٹارگٹ دیا تھا۔ اس طرح کی بے شمار پڑھی' سنی اور دیکھی کہانیاں یاد آ گئیں۔ اسی طرح تو لوگ لڑکیوں کے ذریعے معززین کو پھانستے ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں' ہمارا شمار شہر کے معززین میں ہوتا ہے۔ سارا خاندان اچھے عہدوں پر ہے۔ خدا کے فضل سے روپے پیسے کی بھی کمی نہیں اس لیے اسے یقیناً ہمارے شکار کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ میں ذہنی طور پر اس وار کے لیے تیار ہو گیا لیکن میں اس سے خوف زدہ نہیں تھا کیونکہ میرے لیے یہ کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ مخالفین بھی ایک دوسرے کے ساتھ ایسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں اور پیشہ ور بلیک میلر بھی۔ ایسے وار سہنا بھی مجھے آتا ہے اور ایسی عورتوں سے نپٹنا بھی۔ تیسرے دن پھر فون آیا۔ میں نے فون نمبر یا پتہ مانگا تو اس نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں خود ہی رابطہ کرتی رہوں گی۔ کافی دیر گپ شپ رہی۔ چوتھے دن فون آیا تو میں نے ضد کر لی اور فون نمبر یا پتہ دینے تک ہر قسم کے رابطے سے انکار کر دیا لیکن میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ تعلقات رکھنے ہیں تو اعتبار کرو اور فون نمبر یا پتہ دو ورنہ آج سے رابطہ ختم۔ اس پر وہ پریشان ہو گئی۔ جب میں نے زیادہ دباؤ ڈالا اور اسے یقین دلایا کہ فون نمبر یا پتہ نہ دینے کی صورت میں تعلقات ختم ہو جائیں گے تو اس نے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ملاقات خوشی کی بات تو تھی لیکن اس میں مسئلے بھی بڑے تھے۔ سارا شہر مجھے جانتا تھا اس لیے کسی مصروف جگہ پر مل بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ تو چادر اوڑھتی تھی اس لیے شاید نہ پہچانی جاتی لیکن پھر بھی خوف زدہ تھی۔ شہر سے باہر لمبی ڈرائیو پر جانے کی بات طے ہوئی۔ کینٹ کی ایک مصروف سڑک پر ایک مقام پر شام کا وقت طے ہوا۔

مقررہ وقت اور جگہ پر وہ موجود تھی۔ میں نے جیسے ہی اس کے پاس گاڑی روکی' وہ دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی لیکن اس دفعہ پچھلی سیٹ پر نہیں' اگلی سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھی۔ کینٹ سے ہم ایئرپورٹ کی طرف مڑے اور پھر لمبی ڈرائیو پر نکل گئے۔ کچھ دیر تو اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر وہ اصل بات کی طرف آ گئی۔ سب کچھ اس نے کھل کر کہہ دیا۔ وہ بولی۔

''آپ حیران تو ہوں گے کہ میں نے آپ سے رابطہ کیوں کیا؟ جو کچھ آپ کے ذہن میں آیا ہو گا'



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کا مجھے اندازہ ہے۔ جو کچھ اس معاشرے میں ہوتا ہے، میں بھی جانتی ہوں اور آپ بھی جانتے ہیں۔ عمر کے فرق سے ہی آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ یہ پیار محبت کا کھیل تو ہے نہیں۔ آپ نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ میں آپ کو کسی چکر میں پھنسا رہی ہوں اس لیے آج میں آپ کو سب کچھ صاف صاف بتا دینا چاہتی ہوں۔ آپ میرے لیے کوئی اجنبی نہیں، میں آپ کو، آپ کے خاندان کو اور آپ لوگوں کے اثر و رسوخ کو جانتی ہوں۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کے قریبی عزیز کن عہدوں پر فائز ہیں اور یہ بھی کہ عورت آپ کی کمزوری ہے۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ اگر آپ چاہیں تو میرا کام کر سکتے ہیں اور یہ بھی کہ اس کے بدلے میں آپ کیا چاہیں گے؟ یہ سب کچھ میں نے سوچ سمجھ کر کیا ہے اور اس کے نتیجے میں جو کچھ بھی ہو، اس کے لیے تیار ہوں لیکن پہلے آپ میری داستان سن لیں، اس کے بعد میرے متعلق کوئی رائے قائم کیجیے گا۔

میرا نام سائرہ ہے۔ میرا تعلق ایک معزز خاندان سے ہے۔ بی اے تک تعلیم حاصل کی لیکن اب تعلیم چھوڑ چکی ہوں۔ والدین نے تو کہا تھا کہ اگر چاہو تو آگے پڑھوں لیکن اب میرا دل نہیں چاہتا۔ والدین نے شادی کے لیے بھی کہا لیکن میں اس کے لیے بھی راضی نہیں۔ والدین مجھ سے سخت تنگ ہیں۔ مجھے بچپن سے ہی ریاض سے محبت تھی۔ ہم دونوں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ رہتے بھی ایک ہی محلے میں ہیں۔ گھر بھی نزدیک ہی ہیں اس لیے بچپن اکٹھا گزرا۔ اسکول تک اکٹھے پڑھے۔ علیحدہ علیحدہ کالج میں گئے لیکن گھر نزدیک ہونے کی وجہ سے تقریباً روز ہی ملتے رہے۔ ہماری طبیعت، ذوق اور شوق سب چیزیں ملتی تھیں اس لیے نزدیک سے نزدیک تر ہوتے چلے گئے۔ یہی قربت آہستہ آہستہ محبت میں بدل گئی۔ یہی وہ دن تھے جب اظہار اور اقرار کے مرحلے طے کیے گئے اور مستقبل کے سہانے خواب دیکھے گئے۔ ہمیشہ کے ساتھ اور شادی کی قسمیں کھائی گئیں۔ جانے کیا کیا خواب دیکھے اور دکھائے گئے۔ یہی خواب دیکھتے دیکھتے ہم گناہ کی حدیں بھی پھلانگ گئے۔ ہوش تو مجھے اس وقت آیا جب یہ خبر ملی کہ ریاض کی منگنی فائزہ سے ہوگئی ہے۔ کئی دوستوں نے تصدیق کی لیکن مجھے یقین نہ آیا۔ میں ابھی تک خوابوں ہی کی دنیا میں تھی۔ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ریاض مجھے دھوکہ دے گا۔ ریاض سے ملنے کی کوشش کی لیکن روزانہ ملنے والا ریاض مجھے پورا ہفتہ نہ مل سکا۔ آخر مل ہی گیا تو اس سے اس خبر کے متعلق پوچھا۔ پہلے تو اس نے ٹال مٹول کی پھر اقرار کر ہی لیا کہ ہاں، والدین نے زبردستی کر تو دی ہے لیکن تم فکر نہ کرو، میرا دل تو تمہارے ہی ساتھ ہے۔ شادی کروں گا تو تمہارے ہی ساتھ۔ اس نے ایک اور خواب دکھایا۔ خوابوں کی دنیا میں رہنے والے شاید اس دنیا سے نکلنا ہی نہیں چاہتے۔ اس نے خواب دکھایا اور میں نے دیکھ لیا۔ اس نے کہا، میں نے مان لیا، اب سوچتی ہوں تو اپنی سادگی اور بے وقوفی پر حیرت بھی ہوتی ہے اور ہنسی بھی آتی ہے۔ ہم اسی دنیا میں رہے، ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں، پیار محبت اور گناہ کا کھیل بھی۔ اس دنیا سے تو میں اس دن نکلی جس دن گھر میں ریاض اور فائزہ کی شادی کا کارڈ دیکھا، بس اندھیرا سا چھا گیا پھر کیا ہوا، کچھ یاد نہیں، ہوش آیا تو ہسپتال میں تھی۔ آنکھ کھلی تو زبان بند ہوگئی۔ لاکھ پوچھا گیا کہ کیا ہوا تھا، کچھ تو بتاؤ لیکن میری زبان نہ کھلی، بتاتی بھی کیا؟ ان خوابوں کا کیا بتاتی جن کی کرچیاں اب میری آنکھوں میں چبھ رہی تھیں، ان محلوں کا کیا بتاتی جو میں نے ہوا میں تعمیر کیے تھے اور آج ان ہی کے ملبے پر کھڑی تھی۔ ان وعدہ کا کیا بتاتی جو کچے دھاگے ثابت ہوئے۔ یہ صورت حال دو ایک مہینے رہی۔ ڈاکٹر، حکیم، نفسیات اور عامل سب کو دکھایا گیا لیکن کسی کے پاس اس کا علاج نہ تھا۔ میری زبان نہ کھلی، بس اندر ہی اندر کچھ ہوتا رہا پھر آہستہ آہستہ تبدیلی آنی شروع ہوئی۔ آنکھ کی ویرانی کی جگہ آگ کی سرخی نے لے لی اور لہو میں برف کی جگہ بھی آگ نے لے لی۔ میں سراپا انتقام بن گئی، میں نے تہیہ کرلیا کہ جس نے مجھے برباد کیا ہے، اسے برباد کر کے چھوڑوں گی۔ اس وقت سے میں اس شخص کے پیچھے ہوں۔ اس کو بھی یہ پتہ ہے اس لیے مجھ سے چھپتا پھرتا ہے۔ میرے سامنے تو آتا ہی نہیں۔ اب مجھ سے جان چھڑانے کے لیے اس نے کہیں اور پوسٹنگ کرالی ہے لیکن کہیں بھی چلا جائے، میں نے اس کا پیچھا تو نہیں چھوڑنا۔ اب میں اسے نوکری سے نکلوانا چاہتی ہوں۔ تعویذ، گنڈے وغیرہ سب طریقے میں آزما چکی ہوں۔ اب میں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ معززین یا اچھے عہدوں پر فائز لوگوں سے تعلقات قائم کر کے ان کی مدد سے ریاض کو نکلواؤں گی۔ اس سے پہلے دو سے رابطہ کر چکی ہوں، آپ تیسرے ہیں۔ وہ دونوں افسر تھے۔ اس کام کے عوض جو کچھ انہوں نے مانگا ہوگا، اس کا اندازہ تو آپ کو ہو ہی گیا ہوگا۔ میرے لیے شروع میں یہ بہت مشکل تھا لیکن لٹ تو میں پہلے ہی چکی تھی، اوپر سے انتقام کی آگ، انہوں نے مانگا، میں نے دیا لیکن وہ دونوں میری مجبوری سے فائدہ اٹھاتے رہے، کام دونوں نے نہیں کیا۔ اب سوچا ہے کہ معززین کو آزماؤں۔ آپ کے متعلق پتہ چلا تھا کہ خود بھی خاصا اثر و رسوخ رکھتے ہیں اور دوسرے عزیز رشتے دار بھی اعلیٰ عہدوں پر ہیں اس لیے اب آپ سے رابطہ کیا ہے۔ بتائیں آپ کیا کرتے ہیں؟"

میں نے اس سے ریاض کے متعلق ساری تفصیل معلوم کی اور مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ میں نے اسے دو دن بعد رابطہ کرنے کو

## مہنگائی کا جن

آنسو، آہیں، فکریں، فاقے
چاروں جانب ارزاں ہیں
خوشی کا ہے کال یہاں
اداسی کا ہے راج بہت
عوام کو اکثر ملتا ہے دھوکہ
پھر کیوں وہ دیتے ہیں موقع؟
عمر کی ندی بہتے بہتے
خوشیوں کے موسم کو ترسے
میٹھے وعدوں کی لوری سے
دل کو اپنے یوں بہلائے
جیسے کسی غریب کے بچے
دہلیز پہ اپنی آنکھیں بچھائے
باپ کے وعدوں کی
تکمیل کو ترسیں
اور غریب باپ بے چارہ
اپنے ہی بچوں سے آنکھیں چرائے
چپکے سے گھر میں آئے
خاموشی سے گھر سے جائے
بے بسی سے ہاتھ ملے
اور چپکے چپکے نیر بہائے
اپنی ساری کوشش پر بھی
اُن کو خوشیاں دے نہ پائے
مہنگائی کا جن ہر پل
ان کی خوشیاں لوٹے جائے

شگفتہ شفیق



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہا۔ سبی میں میرے اچھے خاصے تعلقات تھے۔ میں نے ریاض کے متعلق کافی معلومات حاصل کرلیں۔ اس کے رابطہ کرنے پر جب اسے میں نے وہ معلومات دیں تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ میں اس کے کام میں واقعی دلچسپی لے رہا ہوں۔ رابطے بڑھ کر تعلقات کی صورت اختیار کر گئے۔ بے تکلفی بھی ہوگئی۔ اب وہ بے جھجک میرے دفتر آنے لگی۔ اس کی داستان سن کر مجھے اس سے ہمدردی بھی ہوگئی تھی اس لیے میں اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ میرے خیال میں وہ کوئی بری لڑکی نہ تھی' ریاض نے اسے دھوکہ دے کر خراب کیا تھا لیکن اب تو وہ پاگل ہو چکی تھی' انتقام کی آگ نے اس کے اندر کی ہر چیز جلا ڈالی تھی۔ اب نیکی' بدی' اچھائی' برائی' وفا' جفا' اعتماد اور دغا قسم کے الفاظ اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے نزدیک اس آگ کو بجھانے کا ایک ہی طریقہ تھا اور وہ تھا ریاض کی بربادی۔ مجھے خود بھی ریاض پر اس کی زیادتی کی وجہ سے غصہ تھا لیکن میں ڈرتا بھی تھا' کہیں ایسا نہ ہو کہ سائرہ نے جو کچھ کہا ہے' غلط ہو اور میں انجانے میں ریاض کا نقصان کر بیٹھوں اسی لیے جو کچھ میں کر رہا تھا' نیم دلی سے کر رہا تھا۔ سائرہ نے کچھ عرصہ انتظار کیا' جب اس نے دیکھا کہ ریاض کا کچھ نقصان نہیں ہوا تو وہ مجھ سے بدظن ہوگئی۔ کسی کے اچھے یا برے ہونے کا معیار اس کے نزدیک اب یہی رہ گیا تھا کہ وہ اس کی خاطر ریاض کا نقصان کرسکتا ہے یا نہیں؟ غالباً اس نے یہی سمجھا کہ میں بھی اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا رہا ہوں' اس کا کام نہیں کرنا اس لیے وہ غائب ہوگئی' سب رابطے ختم کردیئے۔ اب کافی عرصہ ہوگیا' اس سے کوئی رابطہ نہیں۔ میرے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں کہ اس کا پتہ کروں۔ پتہ نہیں کہاں ہے؟ کسی اور کو آزما رہی ہے یا کسی اور طریقے کو؟ مجھے تو ڈر ہے' تنگ آ کر کہیں ریاض کو گولی نہ مار دے یا خودکشی نہ کرلے۔ ایسی لڑکی سے کچھ بھی بعید نہیں۔ ریاض تو ہے ہی اس قابل لیکن سائرہ کے ایسے انجام پر مجھے بہت افسوس ہوگا۔''

انور سے سائرہ کی دکھ بھری داستان سن کر بہت افسوس ہوا۔ اسلام آباد میں اس کے ساتھ اپنے رویئے پر بھی افسوس ہوا۔ شاید اسلام آباد وہ کسی سہارے ہی کی تلاش میں گئی ہو۔ ڈوبتا شخص ڈوبنے سے پہلے ہاتھ پاؤں تو مارتا ہی ہے' شاید وہ بھی ہاتھ پاؤں ہی مار رہی ہو۔ ممکن ہے کہ اگر میں اس کا ہاتھ تھام لیتا تو وہ ڈوبنے سے بچ جاتی لیکن میں کیا کرتا' میں تو خود اس سے خوف زدہ تھا۔ مجھے تو ڈر تھا' کہیں مجھے بھی نہ لے ڈوبے۔ ایسا لگا جیسے وہ راول جھیل میں ڈوب رہی ہو۔ میں کنارے سے اسے ہاتھ پاؤں مارتا دیکھ رہا ہوں لیکن اس کا ہاتھ نہ تھاما۔ ہاتھ تھام لیتا تو شاید اس کے بچنے کی کوئی صورت نکل آتی۔ اب پتہ نہیں وہ زندہ ہے یا نہیں؟ مر تو خیر' وہ کب کی چکی تھی' اب تو اپنی لاش اٹھائے پھر رہی تھی۔ اس کی لاش بھی دفن ہوگئی یا نہیں؟ پتہ نہیں اس نے خودکشی کی ہو یا اسی روگ سے گھٹ گھٹ کر مر گئی ہو؟ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی موت ایک قتل تھا جو ریاض نے کیا۔ مجھے بھی یہ احساس ساری زندگی رہے گا کہ ایک ڈوبتے کو سہارا نہ دے سکا حالانکہ اس میں میرا اتنا قصور بھی نہیں تھا۔ اس کے کردار کی جو جھلک میں نے دیکھی تھی' اسے دیکھ کر تو کوئی بھی شریف آدمی یہی کرتا پھر مجھے یہ کب معلوم تھا کہ وہ ڈوب رہی ہے؟ اگر زندہ ہے تو پتہ نہیں کس حال میں ہوگی؟ اس کی زندگی بھی کیا زندگی ہوگی' شاید اسی لیے.....

لوگ اب موت سے نہیں ڈرتے
لوگ اب زندگی سے ڈرتے ہیں



صدف آصف

# اے جذبۂ دل

شیریں گلِ رعنا کا خیال
بہت قرینے سے رکھا تھا میں نے اپنا بھرم
ہنسی کے پردے میں چھپتا رہا تھا میرا الم

**ایک ایسی ماں کی کہانی جس نے وطن کی محبت میں حیرت انگیز قربانی دی تھی**

میں اُس دن اپنی امی کے ساتھ خالہ زاد سلمیٰ باجی کے گھر اُن سے ملنے گئی تھی۔ جب شام کو میری واپسی ہونے لگی تھی تو وہ اور اُن کے دونوں بھولی بھالی صورت بچے ببلو اور گڑیا میرے پیچھے لگ گئے تھے کہ اُن کی چھٹیاں ہیں' میں ایک دو روز کے لیے اُن کے پاس رہ جاؤں مگر میں نے سہولت سے انکار کر دیا تھا۔ اب آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ میں کوئی بہت مغرور انسان ہوں' بس مجھے اپنے گھر اور اپنے

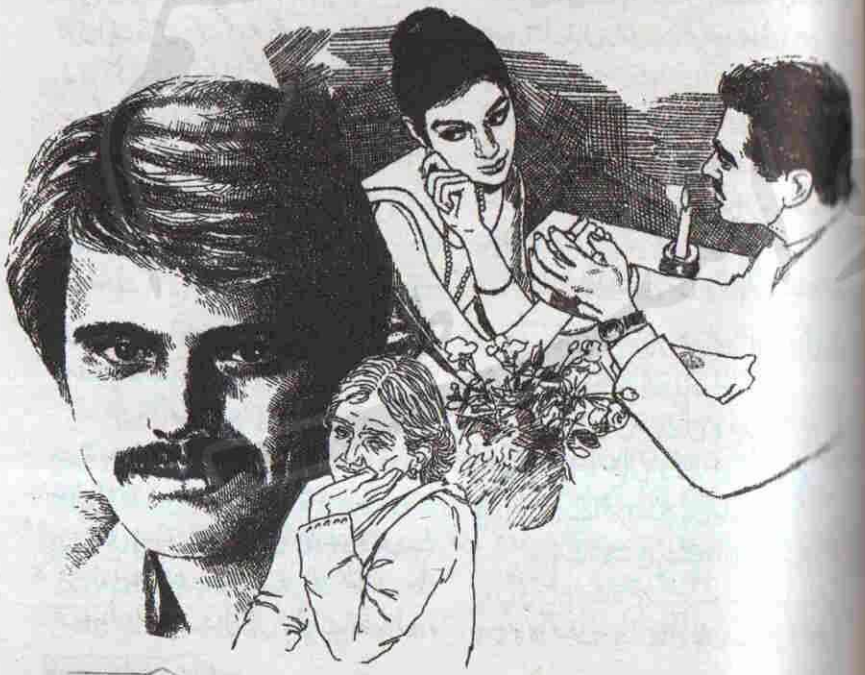

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کمرے کے سوا کہیں آرام نہیں ملتا۔ میرا اپنا ایک روٹین ہے' رات کو کتابیں پڑھنا میرا شوق ہے اسی لیے میں کسی کے گھر رکنے سے اجتناب کرتی ہوں۔

''ہاں' ظاہر ہے' ہم غریبوں کے گھر تم کیوں رہوگی؟ پیسے والوں کو غریب کی کٹیا میں آرام کہاں ملتا ہے؟'' سلمٰی باجی نے منہ پھلا کر ایک جذباتی ڈائیلاگ مارا تھا تو میں اُن کا ہاتھ بہت پیار سے تھام کر ہنس دی تھی۔ میں نے امی کو گھر واپس بھیج دیا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی ایک آدھ روز اُن کے گھر رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میں اُن سب کی محبت کے ہاتھوں مجبور ہوگئی تھی۔

سلمٰی باجی کے میاں انور بھائی ایک گورنمنٹ ادارے میں سینئر کلرک تھے۔ وہ جس پوسٹ پر تھے' مہینوں میں اپنا گھر کھڑا کرسکتی تھے مگر وہ حق حلال کی کمائی کھاتے تھے اسی لیے اُن کے گھر پر غربت کا سایہ پھیلا ہوا تھا مگر اُن سب کے چہروں پر اطمینان بھری ایک خاص چمک تھی جو مجھے بہت بھائی تھی۔

سلمٰی باجی نے کھانا ٹیبل پر لگانے کے بعد ہم سب کو آواز دی تھی۔ میرے لیے انہوں نے خاص طور پر مٹر پلاؤ پکایا تھا' ساتھ میں پودینے کی چٹنی اور شامی کباب تھے۔ یہ میرا من پسند کھانا تھا' ویسے بھی اُن کے گھر میں حق حلال کے کھانوں کی لذت ہی الگ ہوتی تھی' سب انگلیاں چاٹتے رہ جاتے تھے۔

میں جلدی سے ہاتھ دھو کر ٹیبل پر آ گئی تھی۔ سب نے بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کیا تھا۔

''اماں جی کو کھانا کھلا دیا؟'' انور بھائی نے نوالہ منہ میں لے جاتے ہوئے ہاتھ روک کر باجی سے سوال کیا تھا۔

''جی ہاں' آج میری باری تھی تو اُن کو میں نے گرم روٹی اور کباب بھجوا دیئے تھے۔ ٹھنڈی روٹی سخت ہوکر اماں سے چبائی نہیں جاتی ہے اور چاول وہ شوق سے کھاتی نہیں ہیں' میری مروت میں چاول کو تو لیتیں مگر اُن کا پیٹ نہیں بھرتا۔'' سلمٰی باجی نے پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے بتایا تھا۔

''یہ بہت اچھا کیا تم نے' اُن کا خیال رکھا کرو اور کبھی کبھی اُن کے پاس جا کر بیٹھ جایا کرو۔ سلمان کے جانے کے بعد وہ بہت اکیلی ہوگئی ہیں۔'' انور بھائی نے باجی کو تاکید کی تھی۔

''آپ بالکل فکر مت کریں' محلے کی ساری خواتین نے دن طے کر رکھے ہیں' سب اپنی باری والے دن جلدی جلدی گھر کے کام نمٹا کر اماں کے ساتھ دوپہر اور رات میں ایک گھنٹہ گزارنے چلی جاتی ہیں' یوں اماں کا اکیلا پن بھی ختم ہوجاتا ہے اور ہمیں بھی بہت سی دینی اور دوسری کام کی باتوں کا پتا چل جاتا ہے۔''

اب میرے دل میں اس تجسس نے سر ابھارا تھا کہ یہ کس اماں کے بارے میں بات ہورہی ہے' جس کا سارا محلہ خیال رکھتا ہے؟ مگر انور بھائی کی وجہ سے خاموش رہی تھی۔

''اب تو ہر روز رات کو محلے بھر سے بچے وہاں جمع ہوکر کہانی سنتے تھے۔'' سلمٰی باجی نے کھانے کے اختتام پر انور بھائی کو تولیہ پکڑاتے ہوئے خوشی خوشی بتایا تھا۔

''یہ تو تم لوگ بہت نیکی کا کام کر رہے ہو' اس طرح اُن کا دل بھی بہلا رہتا ہوگا۔'' انور بھائی نے مسکرا کر اُن کی کوششوں کو سراہا۔

''جی' ہم اُن کی قربانیوں کا صلہ تو نہیں دے سکتے مگر اُن کا خیال رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' باجی نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے والی ہے کہ ہمارے بچوں کی مسکراہٹ قائم رکھنے کے لیے اماں نے اپنا مامتا کا گلا گھونٹ دیا۔'' بھائی جان نے تولیہ اسٹینڈ



کہتے ہوئے کہا تو سلمٰی باجی نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ اب تو میں نے پکا ارادہ کرلیا کہ رات کو جب سلمٰی باجی سب کاموں سے فارغ ہوں گی تو اُن سے اس بابت پوچھوں گی مگر اس سے قبل ہی یہ عقدہ خود بہ خود حل ہوگیا۔

کھانے کے بعد ببلو اور گڑیا مجھے اپنے دوستوں سے ملوانے زبردستی ایک گھر میں لے گئے۔ وہاں میں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ یہ ایک بہت بڑا ہال سا مگر صاف ستھرا گھر تھا' صحن میں ایک کوری چٹی' خوبصورت بوڑھی خاتون چارپائی پر بیٹھی تھیں' اُن کی گود میں چھوٹی سی بچی اور اردگرد بہت سے بچے اُن کو گھیر کر بیٹھے تھے۔

''اماں جی.....! کہانی سنائیں نا؟'' ایک بچہ بولا۔ اتنے میں اُن خاتون کی نظر مجھ پر پڑی' اُن کی مسکراہٹ بہت پیاری تھی' جب وہ مسکرائیں تو اُن کا چہرہ جیسے جگمگا اٹھتا۔ انہوں نے میرے بیٹھنے کے لیے اپنے پاس جگہ بنائی تھی۔

ببلو اور گڑیا نے اُن سے میرا تعارف بڑھا چڑھا کر کرایا تھا۔ میں شرمندہ ہورہی تھی' سارے بچے اشتیاق نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اماں جی کو اپنے بارے میں مختصر آگاہ کیا تھا۔

''اچھا' تم سلمٰی بیٹی کی مہمان ہو یعنی ہماری بھی مہمان ہو۔'' پھر انہوں نے مجھے کچن سے سوجی کا حلوہ لاکر کھلایا جو بہت مزے دار بنا ہوا تھا۔

''شیر کی کہانی سننی ہے یا بھالو کی سناؤں؟'' اماں جی نے بچوں کی طرف متوجہ ہوکر پوچھا۔

''یہ سب تو سنی ہوئی کہانیاں ہیں' آج تو آپ کوئی نئی کہانی سنائیں نا۔'' ایک چھوٹی بچی نے تتلا کر کہا تو انہوں نے اس بچی کو سینے سے لگالیا۔

''آج ہماری آنی پہلی بار یہاں کہانی سننے آئی ہیں اس لیے ہم اُن کی پسند کی کہانی سنیں گے۔''

تیرے انتظار میں
میں کتنا بدل گئی ہوں
بہار سے نکل کر
خزاں میں ڈھل رہی ہوں

**اصفا فیصل**

سب نے اس رائے سے اتفاق کیا تھا۔

ببلو نے گویا میرے دل کی بات کہہ دی تھی۔ میں نے فوراً فرمائش کردی۔ ''اماں.....! پلیز' مجھے اپنی زندگی کی کہانی سنائیں نا؟'' اماں جیسے ماضی میں کھو سی گئی تھیں۔ ''اچھا بچو.....! آج میں تم سب کو ایک ایسی بچی کہانی سناتی ہوں جو تم نے پہلے کبھی نہیں سنی ہوگی۔'' اماں جی نے سب بچوں میں سوجی کا حلوہ بانٹتے ہوئے کہا تھا۔

•.....•.....•

حاجرہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے حاجرہ کی ساری خواہشات اس کے والدین بڑی محبت سے پوری کرتے تھے۔ حاجرہ کے والدین اس ارضِ وطن کی محبت سے سرشار تھے جو انہوں نے بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کیا تھا۔ انہوں نے شروع سے ہی وطن کی محبت گھٹی کی صورت میں بیٹی کو دی تھی۔ وہ ہمیشہ جشنِ آزادی اور ۲۳ مارچ کو پورے گھر میں چراغاں کرتی' محلے بھر کی لڑکیوں کو جمع کرکے جھنڈیاں لگاتی اور ملی نغمے گاتی۔ حاجرہ کے باپ کا جنرل اسٹور تھا جسے وہ بڑی ایمان داری سے چلاتا تھا۔ اپنی شرافت کی وجہ سے وہ محلے میں ہردلعزیز تھا۔ اس جنرل اسٹور پر ایک شکور نامی یتیم اور یسیر لڑکا بھی کام کرتا تھا۔ حاجرہ کے باپ نے نہ صرف اس کی پرورش کی تھی بلکہ اسے بیٹے کی طرح



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پڑھایا لکھایا بھی تھا۔

"حاجی بٹیا......! یہ لو' آج میں تمہارے لیے امرتی لایا ہوں' تمہیں بہت پسند ہے نا؟" نظام دین نے گھر میں داخل ہو کر بیٹی کے ہاتھ میں لفافہ پکڑایا اور اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ خوشی خوشی امرتی لے کر اندر بھاگ گئی۔

"نظام دین......! لڑکی سے اتنا پیار نہ کر' کل کو اِسے دوسرے گھر جانا ہے۔" رشیدہ بی بی نے ٹرے میں چائے' پانی رکھ کر میاں کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بی بی......! یہ تو تم حق بات کرتی ہو کہ ہماری بیٹی کو کل پرائے گھر بھی جانا ہے۔" نظام دین نے پانی کا گلاس اٹھا کر کلی کی' ہاتھ دھویا پھر بیٹھ کر پانی پیا۔ "ویسے میں نے اس مسئلے پر کافی سوچا ہے اور ایک بیچ کا راستہ نکالا ہے۔ اس طرح حاجرہ کی شادی بھی ہو جائے گی اور وہ ہمارے ساتھ بھی رہے گی۔" یہ کہہ کر نظام دین نے بیوی کے کان میں سرگوشی کی تو وہ بھی خوش نظر آنے لگی۔

•......•......•......•

"شکور بیٹا......! اگر برا نہ مانو تو مجھے تم سے کچھ ذاتی باتیں کرنی ہیں؟" نظام دین نے بڑی لجاجت سے اپنی دکان میں موجود حساب کتاب دیکھنے والے نوجوان سے کہا۔

"ارے چاچا......! تم تو میرے باپ کی جگہ ہو' تم نے مجھے پڑھایا لکھایا یہاں تک کہ اپنی دکان پر نوکری بھی دی' میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتا اور پھر مجھ یتیم و مسکین کا تمہارے سوا اور ہے کون؟ جو بھی کہنا ہے' بے دھڑک کہو۔" شکور نے احسان مندی سے کہا اور نظام دین کے ہاتھوں کو تھام لیا۔

"اللہ تمہیں خوش رکھے۔ تمہاری سعادت مندی ہی تمہارے خاندانی ہونے کا ثبوت ہے ورنہ اس دور میں کون کسی کے کیے کو مانتا ہے۔" نظام دین [...] کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ شکور منتظر تھا کہ نظام د[...] شروع کرے مگر نظام دین' بیٹی کا باپ ہو[...] سے ہچکچا رہا تھا۔ اس نے پانی کا گلاس ہونٹو[...] لگایا اور بات شروع کی۔

"بات کچھ ایسی ہے بیٹا......! کہ مجھے ا[...] سے کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے' پتا نہیں تم کیا [...]" نظام دین نے شکور کی طرف آس بھری نظر[...] دیکھا۔

"دیکھو چاچا......! مجھ پر تمہارے اح[...] قرض ہے۔ اگر میں کسی بھی طرح تمہارے [...] تو اس کو میں اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔" شکور [...] کے پیر دباتے ہوئے کہا۔

"اصل میں بات یہ ہے کہ حاجرہ ہماری بیٹی ہے اور اگر وہ بیاہ کر ہم سے دور چلی جا[...] ہم میاں بیوی کے لیے اُس کے بغیر جینا م[...] اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اس سے شادی [...] ہمیشہ ہمارے ساتھ رہو۔" نظام دین نے [...] بتائی تو شکور پر شادیٔ مرگ والی کیفیت طار[ی] وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نظام دین اُ[...] اکلوتی خوبصورت بیٹی سے شادی کی پیشکش [...] گا۔ وہ سوچنے لگا۔ 'حاجرہ تو میرے خیالوں [...] سے آبسی تھی مگر میری شرافت مجھے اپنے محسن [...] دینے سے روکتی تھی اسی لیے میں دل کی صد[ا] نہیں دھرتا تھا'

"کیا بات ہے بیٹا......! تم چپ کیوں [...] اگر تمہیں یہ بات منظور نہیں تو کوئی بات [...] دوبارہ یہ ذکر نہیں کروں گا مگر تم یہ دکان چھوڑ [...] جانا۔ میرا بیٹا تو نہیں' مجھے تم سے بیٹوں [...] ہو گئی ہے۔" نظام دین نے شکور کی خاموشی [...] مطلب نکالا تھا۔



[...] نہیں چاچا......! تم جو بھی فیصلہ کرو گے' [...] ہے مگر شادی کے لیے میری کچھ شرطیں [...] نے مسکرا کر کہا تھا۔

[...] ہاں' ہاں' بولو' میری دکان' میرا مکان' روپیہ [...] میری بیٹی اور داماد کا ہو گا۔" نظام دین دل [...] وں کا سن کر ڈرا مگر وہ ہر شرط ماننے کے لیے [...]

[...] چاچا......! تم نے پھر مجھے غلط سمجھا' میں تو بس [...] ہوں کہ تمہارے برابر میں جو غلام علی کا مکان [...] کے لیے خالی ہے' وہ میں رہائش کے لیے [...] اور تمہاری دکان پر بدستور تنخواہ دار ملازم کی [...] کام کرتا رہوں تاکہ میری خودداری کو بھی ٹھیس [...] اور تمہاری بیٹی بھی تمہارے نزدیک رہے۔"

[...] شکور کے فیصلے اور خودداری کے مظاہرے [...] خوش ہوا۔ اس نے اٹھ کر شکور کو گلے سے لگا [...]

•......•......•......•

[...] دلہن بنی تو اُس کی خوبصورتی کی دھوم [...] محلے میں مچ گئی' وہ ہر دلعزیز تھی' سو سب کی [...] میں رخصت ہو کر پیا کے گھر چلی گئی تھی۔ [...] کے ساتھ اپنی نئی زندگی شروع کر کے [...] خوش تھی۔ اپنے بابا کی دکان پر کام کرنے [...] سنجیدہ مزاج نوجوان کو وہ جانے کب سے [...] میں چاہنے لگی تھی مگر اسے اپنے والدین [...] کا خیال تھا اسی لیے منہ سے بھاپ نہ [...] حال وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو پا کر [...] تھے اور پھر جلد ہی ایک گل گوتھنا سا بچہ ان [...] میں آ گیا تھا۔ زندگی میں چین ہی چین تھا [...] ختم ہو گیا......

[...] شکور دکان کا سامان لینے شہر گیا ہوا [...] کے کام کر رہی تھی مگر اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ صبح سے کئی کام غلط ہوئے تھے۔ شیشے کا گلاس دھوتے ہوئے ٹوٹا تو اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "یا اللہ......! خیر رکھنا' آج پتا نہیں کیا ہو رہا ہے؟ صبح سے دل بہت گھبرا رہا ہے' شکور بھی اس وقت تک آ جاتا تھا پھر آج کہاں رہ گیا تھا؟" حاجرہ پریشانی سے ٹہلنے لگی کہ اچانک دروازہ بہت زور زور سے دھڑ دھڑایا گیا۔ حاجرہ نے دوڑ کر دروازہ کھولا تو قیامت کا سماں تھا۔ ایدھی ایمبولینس کھڑی تھی' شکور لاش کی صورت میں واپس لوٹا تھا۔ حاجرہ کو سکتہ ہو گیا۔ کسی بس والے کی تیز رفتاری نے اس کے سر کا تاج اور اس کے بچے کا باپ چھین لیا تھا۔ حاجرہ کے ماں باپ اور محلے والے اس کے بیوہ ہونے کا ماتم کر رہے تھے پر اُسے تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔" اماں جی یہاں تک کہانی سنا کر خاموش ہو گئیں اور پھر بولیں۔

"چلو بچو......! اب بہت دیر ہو گئی ہے' باقی کہانی پھر کبھی سناؤں گی۔ میں دروازے پر کھڑی ہوتی ہوں' تم سب اپنے گھروں کو واپس جاؤ ورنہ صبح تمہاری آنکھ نہیں کھلے گی اور تمہاری مائیں ناراض ہوں گی۔" اماں حاجرہ آنسو پونچھتی ہوئی اپنے حال میں واپس آ گئی تھیں۔

میں' ببلو اور گڑیا کو گھر بھیج کر وہیں بیٹھ گئی تھی۔ "اماں......! پلیز' مجھے اپنی پوری کہانی سنائیں نا؟" میں نے لجاجت سے اُن کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔ انہیں بھی اُس وقت شاید کسی ہمدرد کی ضرورت تھی جس سے وہ اپنے دکھ شیئر کر سکتیں' سو وہ دوبارہ ماضی کے سفر پر نکل کھڑی ہوئی تھیں۔

"جوانی میں بیوہ ہونے کے بعد کتنے ہی لوگ میرا ہاتھ تھامنے کو بڑھے مگر میں نے بڑی استقامت کے ساتھ سب کو منع کر دیا اور اپنی زندگی کا محور بیٹے کی ذات کو بنا لیا۔ بیوگی کی کڑی دھوپ نے میری آنکھیں بھی چندھیا دی تھیں مگر سلمان' میرا بیٹا میری



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھایہ بن گیا' یوں جینے کی وجہ بنی۔" اماں حاجرہ نے سلمان کا نام لیا تو مجھے لگا کہ یہ نام میں نے نور بھائی کے منہ سے بھی سنا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور سلمٰی باجی بھی میری خبر گیری کرنے آ گئیں' ویسے بھی اس وقت محلے کی کوئی نہ کوئی عورت اپنی ڈیوٹی کے حساب سے اماں حاجرہ کے گھر اُن کے چھوٹے موٹے کام نمٹانے آتی تھی۔ آج اتفاق سے سلمٰی باجی کی باری تھی۔ وہ بھی ہماری باتوں میں شامل ہو گئیں۔

"شکور کے جانے کے بعد جب اماں ابا آگے پیچھے دنیا سے چلے گئے تو مجھے یوں لگا کہ میں قسمت کی مار سے مر جاؤں گی مگر محلے والوں کے ساتھ نے مجھے زندگی کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دیا پھر ابا کے مکان اور دکان کے کرائے نے مجھے غمِ روزگار سے بچائے رکھا اور میں نے اپنے بیٹے کی پرورش حلال رزق سے کی لیکن میرا بیٹا؟ نہیں' نہیں' میں سلمان کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔" اماں حاجرہ نے اچانک ہی رونا شروع کر دیا تھا۔

"چھوڑیں نا خالہ......! بچہ تھا' بھٹک گیا' زمانہ ہی خراب ہے' سامنے کا بچہ کیسا بھولا بھالا' معصوم سا ہوا کرتا تھا' جب کالج جانے کے لیے گلی سے نکلتا تھا' مجال ہے کہ کسی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ لے۔ وہ تو جانے کون سی بری گھڑی تھی جو سمیرا اُس سے جا ٹکرائی اور سیدھے راستے پہ چلتا ہوا ہمارا بچہ بھٹک گیا اور جب اُس پر برا وقت آیا تو اُس بے وفا لڑکی سمیرا نے سلمان سے بات کرنے سے بھی منع کر دیا کہ اس کی بدنامی ہو گی۔ ارے' یہ تو اُن بگڑی امیر زادیوں کا کھیل ہے' ایک کو پکڑا' دوسرے کو چھوڑا' سمیرا تو سلمان کے ساتھ دل لگی کر رہی تھی مگر وہ سلمان کے دل کی لگی بن گئی۔" سلمٰی باجی جو اماں حاجرہ کے تمام حالات سے واقف تھیں' بہت ہمدردی سے بولی تھیں۔

"تم کچھ بھی بولو' غلطی اس میں میرے بیٹے کی ہے۔ اُس نے پیارے وطن سے غداری کا سوچا بھی کیسے؟ میں نے اُسے ہمیشہ پاکستان کا محافظ بنانے کا خواب دیکھا تھا' وہ رہزن کیسے بن گیا؟ میں اپنے معصوم بیٹے کی بلائیں لیتے ہوئے نہیں تھکتی تھی' وہ جوان ہو چکا تھا' میرے خواب پورے ہونے کے دن قریب تھے کہ جیسے ہر چیز ٹوٹ کے بکھر گئی۔ سمیرا میرے بیٹے کی زندگی میں کب آئی' مجھے پتا ہی نہیں چلا مگر ایک دن اس کے ایک قریبی دوست نے اُن دونوں کی بابت مجھے بتایا بلکہ استدعا بھی کی کہ وہ ایک بڑے ماں باپ کی بگڑی ہوئی اولاد ہے اور میں اس لڑکی سے اپنے بیٹے کو بچا کر رکھوں۔ سلمان کے دوست نے مجھے جیسے سلمان اور سمیرا کی کہانی سنائی' میں تمہیں بھی سنا دیتی ہوں۔" اماں حاجرہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا تو میں نے بھی سر ہلا دیا۔

سمیرا سے سلمان کی پہلی ملاقات تب ہوئی جب وہ ایک مارکیٹ میں کچھ شاپنگ کر رہا تھا۔ وہ ایک دکان سے نکلا تو دیکھا کہ ایک بوڑھا برگر والا اپنے ٹھکانے پر کھڑا رو رہا تھا۔

"کیا بات ہے بھائی؟" سلمان نے پوچھا۔

"وہ سامنے جو سفید گاڑی جا رہی ہے' اس میں تین چار بڑے گھرانوں کی بگڑی ہوئی لڑکیاں تھیں' انہوں نے برگر وغیرہ کھایا اور جب بل مانگا تو مجھے دھکا مار کر چلی گئیں۔ دیکھو بابو' میرا نقصان جو ہوا سو ہوا' بے عزتی الگ ہوئی۔" بوڑھے نے کاندھے پر پڑے ہوئے رومال سے اپنی آنکھیں پونچھی تھیں۔

"آپ ٹھہریئے' میں ابھی آتا ہوں۔" سلمان کو ان بگڑی رئیس زادیوں پر بہت غصہ آیا اور اس بوڑھے پر ترس۔ اس نے بائیک اٹھائی اور گاڑی کا پیچھا کیا' اتفاق سے سگنل بھی بند ہو گیا' اُس نے بائیک لڑکیوں کی گاڑی کے پاس جا کر روکی اور اس کا فرنٹ ڈور کھول دیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی ہماری گاڑی کا دروازہ کھولنے کی؟" ان میں سے ایک لڑکی زور سے چیخی۔

"آپ کو بدتمیزی کی تعریف بتاؤں؟ بدتمیزی اسے کہتے ہیں جو آپ لوگوں نے اس بوڑھے کے ساتھ کی ہے۔ پلیز' آپ لوگ اُس کا بل ادا کر دیں' میں یہاں کوئی تماشہ نہیں کرنا چاہتا۔" سلمان نے بائیک سے اتر کر ان سے کہا تھا۔

"تم خود کو کیا سمجھتے ہو' تم جیسے تو ہماری جوتیاں صاف کرتے ہیں۔" ایک بوائے کٹ بالوں والی لڑکی نے نخوت سے اپنے بالوں پر اپنے گاگلز ٹکائے تھے۔

"میڈم' لگتا ہے' آپ کو کسی نے بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی؟ اینی وے' میرے پاس آپ جیسی بددماغ عورتوں سے بات کرنے کا ٹائم نہیں ہے' جلدی سے اُن بابا کی ادائیگی کریں۔" سلمان کے عورت کہنے پر گاڑی میں بیٹھی لڑکیوں کا میٹر گھوم گیا' ساری ایک ساتھ چیخنے لگیں سوائے سمیرا کے جو اس خوبرو نوجوان کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

"پلیز' جلدی کریں' تمام لوگ ہماری طرف متوجہ ہو رہے ہیں اور وہ دیکھیں' پولیس کانسٹیبل بھی ادھر ہی آ رہا ہے۔"

"تم یہ سب کہنے والے ہوتے کون ہو؟" وہ لڑکی دوبارہ بھڑکی مگر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی خوبصورت لڑکی نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"it's ok. میرا نام سمیرا ہے' ہماری ہی غلطی تھی' یہ لیجیے برگر کے پیسے۔ اصل میں ہم نے یہ سب تھرل کے لیے کیا تھا۔" وہ دلکش انداز میں مسکرائی تھی۔

"کسی کی بے عزتی سے آپ کو کیا تھرل حاصل ہوا؟ آپ کا ضمیر بے چین نہیں ہو گا؟ بہر حال بل کے لیے شکریہ' اگر کبھی وہاں دوبارہ جانا ہو تو اس بوڑھے آدمی سے معافی مانگ لیجیے گا پھر دیکھیے گا' کیسا سکون حاصل ہوتا ہے' یہ بھی ایک تھرل ہی ہو گا۔ چلتا ہوں۔" سلمان نے ہاتھ اٹھا کر جانے کا عندیہ دیا تھا۔

"سنیں' آپ نے اپنا تعارف تو کروایا نہیں؟" سمیرا نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"میرا نام سلمان شکور ہے' اب اجازت دیں۔" اُس نے مسکراتے ہوئے بائیک اسٹارٹ کی۔

"سنو' یہ میرا موبائل اور گھر کا فون نمبر ہے' پلیز' کل شام 5 بجے مجھ سے بات ضرور کرنا' میں انتظار کروں گی۔" سمیرا نے جلدی جلدی ایک کاغذ پر نمبر لکھ کر دیا۔ سلمان نے لاپروائی سے وہ رقعہ جیب میں رکھ لیا تھا۔

سمیرا کی آنکھوں میں نہ جانے ایسا کون سا نشہ تھا کہ وہ سلمان کے حواسوں پر چھا گئی تھی۔ ایک دو ہفتے تک تو اُس نے سمیرا کے خیال کو نظر انداز کیا تھا مگر ایک دن وہ سمیرا کا نمبر ملا بیٹھا تھا۔ ہوا یوں کہ وہ اپنے بچپن کے دوست راشد کے گھر کمبائنڈ اسٹڈی کر رہا تھا' دوست کسی کام سے اندر گیا تو سامنے ہی فون موجود تھا' سلمان نے پرس میں سے سمیرا کا نمبر نکالا اور ڈائل کیا۔ کال سمیرا نے ہی ریسیو کی تھی۔

"میں روزانہ تمہارے فون کا انتظار کرتی تھی' مجھے یقین تھا کہ میری لگن' میرے جذبے تمہیں میری طرف ضرور متوجہ کریں گے۔"

سلمان' سمیرا کے منہ سے یوں کھلا اظہار پسندیدگی سن کر حیران اور خوش ہوا تھا اور پھر ان کی دوستی یا محبت کا ایک سلسلہ دراز ہونے لگا تھا اور بات دور تک جا پہنچی تھی۔

"سمیرا' پلیز یار' بات تو سنو نا' کہاں بھاگی جا رہی ہو؟" سلمان نے جدید تراش کے ماڈرن لباس



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ملبوس سمیرا کو پکارا تھا جو کسی بات پر ناراض ہو کر غیر ملکی فاسٹ فوڈ سینٹر کے دروازے سے باہر نکل رہی تھی۔

"میرا پیچھا مت کرو' کیا فائدہ ان باتوں کا؟ مجھے تو لگتا ہے' تم مجھے چیٹ کر رہے ہو۔"

"shut up. سمیرا.....!" سلمان نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پکڑ کے رخ اپنی طرف کیا تھا۔ سمیرا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ اُسے اپنے ساتھ ریسٹورنٹ کے اندر لے گیا تھا اور ذرا دیر کی خاموشی کے بعد بولا تھا۔ "تم کیا سمجھتی ہو' اگر میری تم سے شادی نہ ہوئی تو میں خوش رہ سکوں گا؟ نو' نیور لیکن تم یہ بات بھی سمجھو کہ ابھی میرے حالات ایسے نہیں کہ تمہارے گھر رشتہ بھجوا سکوں۔ میرا تعلق ایک لوئر مڈل کلاس گھرانے سے ہے جبکہ تم جس کلاس سے belong کرتی ہو' وہاں انسان کی عزت اُس کی بینک بیلنس شیٹ پر لکھے ہوئے ہندسوں سے ہوتی ہے اور میں نے تو شروع میں ہی اپنے بارے میں تمہیں سب بتا دیا تھا' تب تو تم نے بڑے بڑے فلمی ڈائیلاگ بولے تھے کہ میں سماجی اونچ نیچ کو نہیں مانتی' ہمیشہ تمہاری ہی رہوں گی' اب کیوں اپنے قول سے پھر رہی ہو؟"

"میں اب بھی اپنے قول پر قائم ہوں مگر میرے والدین میری شادی جلد کرنا چاہ رہے ہیں' میں تمہاری طرح اکلوتی نہیں ہوں' میری اور بھی بہنیں ہیں اور پھر خاصی اچھی فیملیز سے میرے پروپوزل بھی آئے ہوئے ہیں۔ اب میرے والدین نے چوائس مجھ پر چھوڑ دی ہے' میں چاہتی ہوں' تم اپنی ماں کو لے کر میرے گھر آؤ تاکہ میں تمہارے لیے بات کر سکوں۔" سمیرا نے جوس کا سپ لیتے ہوئے کہا تھا۔

"تم کس دنیا میں رہتی ہو سمیرا؟ جب میں اُن کو یہ بتاؤں گا کہ میں ایک 80 گز کے مکان میں رہتا ہوں اور فی الحال آمدنی کا ذریعہ نانا کی ترکہ میں چھوڑی ہوئی دکان کا کرایہ اور ٹیوشنز ہیں تو کیا وہ مجھے داماد کے طور پر قبول کر لیں گے؟ ہرگز نہیں' وہ مجھے اور میری ماں کو بے عزت کر کے گھر سے نکال دیں گے۔" سلمان نے حقیقت پسندی کا سہارا لیتے ہوئے صاف بات کی تھی۔

"میں تمہارے ان مسئلوں کو سمجھتی ہوں مگر ان باتوں کو بار بار دہرانے سے تو کام نہیں بنے گا' تمہیں جلد از جلد کچھ کرنا ہوگا۔" سمیرا نے منہ پھلا کر کہا تھا۔

"یار' میں کوشش کر تو رہا ہوں' ابھی میری تعلیم مکمل نہیں ہوئی' اس کے مکمل ہونے پر میں اچھی سی جاب تلاش کروں گا' تمہارے لیے ایک بڑا سا گھر بناؤں گا پھر باعزت طریقے سے تمہارے والدین کے پاس تمہارا ہاتھ مانگنے آؤں گا۔" سلمان نے خلاؤں میں گھورتے ہوئے جیسے خواب دیکھا تھا۔

"ہیلو مسٹر.....! یہ دس سالہ منصوبہ اپنے پاس رکھو جس کی کامیابی کی کوئی گارنٹی بھی نہیں' بی پریکٹیکل' تمہارا کیا خیال ہے کہ ایجوکیشن مکمل ہوتے ہی تمہیں جاب مل جائے گی؟ تمہیں پتا نہیں کہ اچھے اچھے ایجوکیٹڈ لوگ یہاں جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں' تم کوئی شارٹ کٹ ڈھونڈو ورنہ مجھے بھول جاؤ' اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" یہ کہہ کر سمیرا گاڑی کی چابیاں اٹھا کر چل پڑی تھی جبکہ سلمان وہیں بیٹھا جانے کیا سوچتا رہا تھا۔

•.....•.....•

"کیا بات ہے بیٹا! کچھ اداس لگ رہے ہو؟" حاجرہ بی بی نے پیار سے سلمان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"امی.....! میں سوچ رہا ہوں کہ کیوں نا' ہم یہ مکان اور دکان بیچ کر کسی اچھے علاقے میں کوئی فلیٹ



خرید لیں؟" بیٹے نے ماں کا ہاتھ تھام کر پوچھا تھا۔

"تمہارے ذہن میں ایسی بات بھی کیوں کر آئی؟ یہاں تمہیں کیا تکلیف ہے؟ ہمارے آس پڑوس میں وہ لوگ رہتے ہیں جنہوں نے تمہارے باپ کے بعد ہمیں تحفظ دیا ورنہ اس معاشرے میں اکیلی جوان عورت کا رہنا آسان نہیں' یہ سب باتیں بیٹا.....! تم بھول سکتے ہو مگر میں نہیں۔" یہ سب کہتے ہوئے حاجرہ بی بی کا لہجہ کچھ تلخ ہو گیا تھا۔

"میں ان سب باتوں کو اور ان سب کے احسان کو بھی مانتا ہوں لیکن کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم ہمیشہ اس گندے علاقے اور اس بوسیدہ مکان میں رہیں؟" سلمان چڑ کے ماں سے جرح کرنے لگا تھا۔

"اچھا چلو' ہم دکان فروخت کر دیتے ہیں پھر کھائیں گے کہاں سے؟" ماں نے سوال کیا تھا۔

"تم اس کی فکر چھوڑو' میں جلد ہی اتنا کمانے لگوں گا کہ ہمارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

اس جواب پر حاجرہ بی بی نے پہلے حیرت سے بیٹے کو دیکھا تھا پھر التجائیہ انداز میں کہا تھا۔ "میرے بچے! جو بھی کام کرنا' ایمان داری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔"

"ایمان داری سے تو ہم فاقے کر سکتے ہیں اماں.....! اور کچھ نہیں۔" سلمان غصے میں بولتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ حاجرہ بی بی گم صم ہو گئیں۔ یہ اُن کا بھولا بھالا معصوم بیٹا سلمان تو نہیں تھا' یہ تو کوئی اجنبی تھا جس سے آج پہلی بار اُن کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد دو دن تک دونوں میں بات چیت بند رہی۔ آخر ماں تھیں' تھک کر انہوں نے گھر اور دکان بیچنے کی اجازت دے دی تھی۔

"نہیں' رہنے دیں اماں.....! میں نے اسٹیٹ ایجنٹ سے دونوں کی مالیت کا تخمینہ لگوایا تھا' انہیں فروخت کر کے اتنے پیسے بھی نہیں ملیں گے کہ ہم کسی بڑے علاقے میں ایک چھوٹا سا فلیٹ ہی لے سکیں۔ اب مجھے کچھ اور ہی کرنا پڑے گا۔" سلمان نے بہت رکھائی سے کہا تھا۔

"یا اللہ! میرے بچے کو کس کی نظر کھا گئی؟ یہ ایسا بدلحاظ تو نہ تھا؟" حاجرہ بی بی نے آسمان کی طرف دیکھ کر فریاد کی تھی۔

سلمان نے اب راتوں کو دیر سے گھر آنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ماں کے پوچھنے پر اپنا بزنس شروع کرنے اور کام کی زیادتی کا بہانہ بناتا۔ ماں اگر بزنس کے حوالے سے کچھ پوچھتی تو کہتا کہ "میں اب بڑا ہو گیا ہوں' بچہ نہیں رہا ں۔ ماں.....! تم اپنا دماغ ان مسئلوں میں نہ الجھاؤ۔" ماں ساری رات عبادت کرتی اور بیٹے کے لیے دُعائیں مانگتی رہتی۔

•.....•.....•.....•

ایک روز جب سلمان پوری رات گھر نہ آیا تو حاجرہ بی بی پریشان ہو کر محلے کے ایک بچے کے ساتھ سلمان کے دوست راشد کے گھر جا پہنچیں۔ راشد کالج جانے کے لیے نکل رہا تھا' حاجرہ بی بی کو دروازے پر دیکھ کر حیران ہو گیا پھر اندر لا کر ڈرائنگ روم میں عزت سے بٹھایا۔

"بیٹا.....! میں بہت پریشان ہوں' سلمان رات بھر گھر نہیں آیا۔ تمہارے سوا میں اس کے کسی دوست کو جانتی بھی نہیں ہوں' تم ہی کچھ کرو نا؟" حاجرہ بی بی رو دینے کو تھیں۔

"خالہ.....! میں خود پریشان ہوں کہ سلمان کو کیا ہو گیا ہے؟ اب پڑھائی لکھائی میں اس کی دلچسپی صفر رہ گئی ہے۔ میرے پاس بھی زیادہ نہیں آتا ہے۔ اگر میں کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں تو لڑ پڑتا ہے۔ اس نے جانے کہاں کے آوارہ دوست بنا لیے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں' ہر وقت ان کے ساتھ نظر آتا ہے جن کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی غیر قانونی سرگرمی میں ملوث ہیں۔ ان کی جیبیں نوٹوں سے بھری رہتی ہیں' ان ہی کی وجہ سے اس نے اپنے سارے پرانے دوستوں سے ناتہ توڑ لیا ہے۔ میں تو خود آپ کو یہ سب بتانا چاہتا تھا مگر سلمان کی ناراضگی کے ڈر سے نہ بتا پایا۔"

یہ تمام باتیں سن کر حاجرہ بی بی سر پکڑ کے بیٹھ گئیں پھر فکرمندی سے پوچھا۔ "آخر اس بدلاؤ کی کوئی تو وجہ ہوگی؟"

"جی ہاں' ایک لڑکی ہے سمیرا' بڑے ماں باپ کی بیٹی ہے' اس کا کام ہی لڑکوں کو بے وقوف بنانا ہے' وہ سلمان کے ساتھ بھی ایسا ہی کھیل' کھیل رہی ہے۔ اصل میں سلمان نے ایک دن اس کی اور اس کی دوستوں کی بے عزتی کردی تھی۔ ہم نے بہت کوشش کی ہے کہ اسے سمیرا کے جال سے نکالیں اس لیے سلمان کو سمیرا کی اصل شکل دکھانے کی کوشش کی مگر وہ بے وقوف' اس کے خلاف کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔" راشد نے بہت تاسف سے کہا تھا۔

حاجرہ بی بی یہ سب سن کر ٹوٹ سی گئی تھیں۔ راشد نے اُن سے وعدہ لیا تھا کہ وہ ابھی اِن باتوں کا سلمان سے کوئی ذکر نہیں کریں گی بلکہ خاموشی سے اپنے بیٹے کے شب و روز پر نظر رکھیں گی۔

•......•......•

دروازہ بہت زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ اگر سلمان گھر میں ہوتا تو عام طور پر وہ ہی دروازے پر جاتا مگر کیونکہ وہ سو رہا تھا' حاجرہ بی بی دروازے پر گئی تھیں۔ "ارے' کون ہے بھئی' دروازہ توڑو گے کیا؟" انہوں نے جھری سے جھانکا اور پوچھا تھا۔

"سلمان ہے؟ اس کو بولو' رمضان خان آیا ہے۔" دروازے پر موجود مشکوک حلیے والا شخص کھردرے لہجے میں بولا تھا۔

حاجرہ بی بی کو راشد کی باتیں سچ نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے اس شخص سے بغیر سوال جواب کیے' بیٹے کو اٹھایا اور دروازے پر بھیجا' خود دروازے کے پیچھے چھپ کر ان کی باتیں سننے لگیں۔

"لالہ' آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا' میں نے پہلے ہی سب کو منع کیا ہوا ہے کہ میرے گھر کوئی نہیں آئے گا۔" سلمان نے اس شخص کی آمد پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور مڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا کہ کہیں ماں تو نہیں دیکھ رہی؟

"او یارا...... کام ہی اتنا ارجنٹ تھا کہ ہم کو آنا پڑا' تمہارا موبائل بھی بند جا رہا تھا۔" رمضان خان نے ہاتھ دبا کر معذرت کی تھی۔

"ہاں' اس کی بیٹری ڈاؤن ہوگئی ہے' خیر' آپ ٹھکانے پر پہنچیں' میں آتا ہوں۔" سلمان نے چور نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

حاجرہ بی بی جلدی سے جا کر پلنگ پر بیٹھ گئیں اور سبزی کاٹنے لگیں۔ سلمان اندر داخل ہوا تو ماں کو سبزیوں میں مگن پا کر اطمینان کی سانس لی اور بائیک کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔ اس نے ماں کو یہ بتانے کی زحمت بھی نہ کی تھی کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟

حاجرہ بی بی اپنے بیٹے کے لیے بہت فکرمند تھیں مگر بیٹے سے بات کر کے اپنا بھرم نہیں کھونا چاہتی تھیں۔ اُن کا دل ہول رہا تھا' انہیں لگ رہا تھا کہ کچھ بہت ہی برا ہونے والا ہے۔ انہوں نے فوراً ہی دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے تھے۔ "یا اللہ! تو ہی میری مدد فرما۔ روزِ قیامت مجھے اپنے پیارے نبی ﷺ اور شکور کے سامنے شرمندہ نہ ہونے دینا۔ میں نے اِسے حق حلال کی روٹی کھلائی' پاکستان کی محبت اس کے روم روم میں بسائی' آج یہ کیوں باغی ہوگیا؟



میرے پڑھائے ہوئے سارے سبق کیوں بھول گیا؟" وہ بہت دیر تک سجدے میں پڑی روتی رہی تھیں۔

•......•......•

"اماں...... ! میرے کچھ مہمان آئے ہیں' وہ بیٹھک میں رہیں گے۔ آپ پلیز' اپنے کمرے میں ہی رہیے گا۔" یہ کہتے ہوئے سلمان' ماں سے نظریں چرا رہا تھا۔ حاجرہ بی بی' بیٹے سے کوئی سوال کرنا چاہتی تھیں مگر سلمان جلدی سے اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا تھا۔ اب تو حاجرہ بی بی کو تجسس کے ساتھ ساتھ پریشانی نے بھی آ گھیرا تھا۔ انہیں آنے والوں کے عزائم کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ وہ جلدی سے اُس کمرے کی طرف گئیں جہاں بیٹھک میں کھلنے والی ایک کھڑکی تھی اور کان لگا کے سننے لگیں۔

"لالہ...... تم نے تو اکیلے آ کر معاملات طے کرنا کا کہا تھا پھر ان سب کو کیوں لے آئے؟" سلمان کا انداز جارحانہ تھا۔

"او یارا...... ہمیں آنا تو اکیلے ہی تھا مگر وہ خبیث پولیس کی بچی کو ان لوگوں پر شک ہوگیا' ہوٹل آ کر بھی ان سے پوچھ تاچھ کی' اب ایسے میں ان کو اور ان کے خطرناک سامان کو چھوڑنا رسک تھا پھر تمہارا گھر ہی سب کی نظروں سے بچا ہوا تھا اس لیے ہم سب جان بچا کر یہاں آ گئے۔" رمضان خان نے سلمان کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔

"آپ تو کہہ رہے تھے' پولیس کے ساتھ سارے معاملات طے ہیں؟" سلمان کے لہجے میں تشویش تھی۔

"او خوچہ...... یہ لمبی تفصیل ہے' ہمارے بڑوں نے پولیس کے ایک اعلیٰ افسر سے معاملات طے کر رکھے تھے' وہ خبیث کی بچی راشی تھا' اس کے خلاف اچانک انکوائری بیٹھ گئی' اس نے اپنی جان بچانے کے لیے ہمارا اتہ پتہ بھی دے دیا' اس کی جگہ جو نیا افسر آیا ہے' اس ظالم نے ہمارے ساتھ فوری طور پر معاملات طے کرنے سے منع کر دیا کیونکہ ......" رمضان خان ڈھیرے ڈھیرے تفصیل بتا رہا تھا۔ یہ سب باتیں سن کر حاجرہ بی بی کے رونگھٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

"اوہ...... تو اس کا مطلب ہے' ہمارا مشن کینسل ہے؟" سلمان نے مایوسی سے پوچھا تھا۔

"ہونا تو یہ ہی چاہیے تھا مگر ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم لوگوں نے دو مہینے پہلے ہی باہر والی پارٹی سے ایڈوانس پیسے لے لیے تھے' اب انکار کا مطلب ان سے دشمنی مول لینا پھر ہماری شہرت الگ خراب ہوگی اس لیے ہمارے بڑوں نے یہ رسک لینے کا فیصلہ کیا ہے۔" رمضان خان نے بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا تھا۔ "دیکھو بچے...... ہم تم کو ایسے ہی تو کروڑ پتی بنانے کا وعدہ نہیں کیا ناں' تمہیں یہ بیگ ایسی جگہ رکھنا ہے جہاں لوگوں کا بھیڑ ہو' جتنے زیادہ لوگ مریں گے' تباہی پھیلے گی' اتنے ہی دام ملیں گے۔" رمضان خان نے سفاکی سے کہا تھا۔ یہ تمام باتیں سن کر حاجرہ بی بی فرش پر گرنے کے انداز میں

## آرزو

مجھے معجزوں پر یقیں نہیں مگر آرزو ہے کہ جب قضا
مجھے بزمِ دہر سے لے چلے
تو پھر ایک بار یہ اذن دے
کہ لحد سے لوٹ کے آسکوں
تیرے در پہ آ کے صدا کروں
تجھے غمگسار کی ہو طلب تو ترے حضور میں آ رہوں
یہ نہ ہو تو سوئے رہِ عدم میں پھر ایک بار روانہ ہوں

فیض احمد فیض



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیٹھ گئی تھیں، انہیں چکر آنے لگے تھے، کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔

"مگر لالہ..... تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا کہ یہ کام کرنا ہے؟ میں انسانی جانوں سے نہیں کھیل سکتا، وہ منشیات کی اسمگلنگ الگ بات ہے....." سلمان نے سیدھے اور سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

"دیکھو بچے..... جب تم ہماری پارٹی میں شامل ہوئے تھے تو ہم نے اسی وقت بتا دیا تھا کہ یہاں ہر قسم کا خطرہ ہے مگر تم پر اس وقت پیسہ کمانے کی دھن سوار تھی، تم نے ہماری ساری شرطیں مانی تھیں، اس نئے کام کے لیے بھی جب ہم نے تم کو فون کیا تو تم نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ کام کیا ہے؟ تم نے بس یہ پوچھا تھا کہ دام کیا ملے گا؟ اب تو تمہیں ہمارا کام کرنا ہی ہوگا، تمہارے علاقے کے باہر جو فیملی میلہ لگا ہے، وہاں ایک بم لگا دو، وہاں بچوں کی تعداد زیادہ ہے، ان کی لاشیں گرنے پر لوگوں میں غم و غصے کا طوفان اٹھے گا، علاقے میں بدامنی اور انتشار پھیلے گا، بس یہی ہمارا باہر والا صاحب چاہتا ہے۔" رمضان خان نے اپنا چہرہ سلمان کے منہ کے قریب لا کر بہت سفاکی سے کہا تھا۔

"مجھے معاف کر دو لالہ، میں یہ کام نہیں کر سکتا، اس علاقے کے لوگوں کی محبتوں کا مجھ پر قرض ہے، ابھی تو وہ ہی نہیں اترا اور تم چاہتے ہو کہ میں ان کے دلوں کا سکھ چین چھین لوں، ایسا نہیں ہو سکتا۔" سلمان نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"تمہیں ایسا ہی کرنا ہوگا ورنہ تم خود مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ....." رمضان خان نے ریوالور نکال کر سلمان پر تان لی تھی۔

"بس بیٹا.....! یہاں میری مامتا اور میرے ضمیر کا مقابلہ شروع ہو گیا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ وطن سے وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے بیٹے اور اس کے ساتھیوں کو پکڑا دوں مگر جب بیٹے کی طرف دیکھتی تو آنسو نہیں رکتے تھے کہ ایک ہی بیٹا تھا جسے بڑے ارمانوں سے پالا تھا اور پھر میرے ضمیر کی جیت ہوئی، میں فوراً ہی راشد کے گھر پہنچی تھی، وہ اپنے دروازے پر مجھے دیکھ کر حیران پریشان کھڑا تھا، میں نے اُسے فوراً ہی پولیس کو فون ملانے کو کہا تھا، اُس نے پولیس اسٹیشن فون ملا کر ریسیور مجھے تھما دیا تھا۔ میں نے جلدی جلدی ساری بات بتائی تھی۔ پولیس کو پہلے ہی ان مشکوک افراد کی تلاش تھی، وہ فوراً ہی میرے گھر پہنچ گئی تھی۔ کافی دیر کے پولیس مقابلے کے بعد پولیس جب میرے گھر کی بیٹھک میں داخل ہوئی تھی تو وہاں صرف لاشیں موجود تھیں البتہ سلمان شدید زخمی حالت میں ملا تھا۔ جب پولیس اسے اسٹریچر پر ڈال کر اسپتال لے جا رہی تھی تو وہ روتے ہوئے مجھ سے معافی مانگ رہا تھا۔ میں نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اُس کے سر پر رکھ دیا تھا اور پھر سلمان کو میری دُعاؤں نے زندگی تو دے دی تھی مگر وہ دنیا کی عدالت میں سزا سے نہیں بچ سکا تھا البتہ یہ ضرور ہوا تھا کہ وعدہ معاف گواہ بننے کے باعث اس کی سزا میں کچھ کمی ضرور ہو گئی ہے۔"

"جب سارے محلے کو یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ اماں حاجرہ نے اپنے پاک وطن، اپنی دھرتی ماں کی محبت میں کتنی بڑی قربانی دی ہے تو ہم سب محلے والوں کے سر اُن کے احترام میں جھک گئے تھے۔" سلمٰی باجی نے گھر جاتے ہوئے بتایا تھا۔

اماں حاجرہ اَب بھی جشنِ آزادی پر محلے بھر کے بچوں کو جمع کر کے جھنڈیاں لگواتی ہیں، چراغاں کرتی ہیں اور خوشیاں مناتی ہیں، اَب اُن کی زندگی بس دو باتوں، وطن سے محبت اور اپنے بیٹے سلمان کی رہائی کے انتظار سے جڑی ہوئی ہے۔



مون شاہ

# راہِ الفت

سعدیہ حریم کا خیال

جذبۂ دل کہیں محتاجِ بیاں ہوتا ہے
اِس کا ہر رنگ تو چہرے سے عیاں ہوتا ہے

**نام نہاد محبت کے ہاتھوں برباد ہوئی لڑکی کا لہو رنگ قصۂ الم**

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دربار کے احاطے میں جھاڑو لگاتے ہوئے مجھے سسکیوں کی آواز آئی تو میں جھاڑو چھوڑ کر دربار مبارک کی طرف بڑھا۔ وہ عورت دربار میں قدموں کی جانب بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ گریہ وزاری کرتے ہوئے اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ میں گہری سانس لے کر اس سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گیا۔ میں اسے جانتا تھا' یہ وہی تھی جسے اُس کی ملازمہ شہزادی کہہ کر مخاطب کرتی تھی اور وہ ہر جمعرات کو دربار پر حاضری دیا کرتی تھی اور اسی طرح روتی تھی۔ مجھے اس کا رونا تجسس میں مبتلا کر دیا کرتا تھا۔ گریہ وزاری کی وجہ سے وہ اکثر بے ہوش بھی ہو جاتی تھی۔ اس دربار پر بھانت بھانت کے لوگ آتے تھے۔ وہ منتیں مانتے تھے اور مرادیں پوری ہونے پر چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ میں نے بہت سوں کو روتے بھی دیکھا تھا مگر معلوم نہیں کیوں اس لڑکی شہزادی کا رونا مجھے بے حد ملول کر دیتا اور میں تجسس میں مبتلا ہو جاتا۔ اس کی آہ و فغاں میں مجھے انوکھا سا درد محسوس ہوتا تھا' شاید میرے تجسس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اس قدر اضطراب میں پہلے کسی کو نہ دیکھا تھا۔ اس کی تڑپ مجھے دوسروں سے جدا لگتی تھی۔ میرا جی چاہتا کہ میں اُس سے اس کا دکھ پوچھوں مگر میں کبھی خود میں ایسی ہمت پیدا نہیں کر سکا۔ وہ پچھلی تین جمعراتوں سے دربار پہ آ رہی تھی۔ وہ یونہی قدموں کی جانب بیٹھی سر جھکائے منہ میں جانے کیا بڑبڑاتی رہتی اور روتی رہتی تھی۔ لگتا تھا جیسے اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے جس کی معافی کے لیے وہ اس قدر اضطراب کا شکار تھی یا ممکن ہے' وہ کسی سے عشق کرتی ہو اور اس کے لیے یہاں دُعائیں مانگتی ہو۔ بہرحال جو بھی تھا' مجھے تو وہ حیران کیے دے رہی تھی۔ میں اس سے کئی بار دریافت کرتے کرتے خاموش ہو جاتا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔ ابھی بھی اسے روتا دیکھ کر میرے اندر کچھ پوچھنے کی خواہش چٹکی لے رہی تھی۔

اس نے آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھایا۔ اس کی بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ سرخی و سپیدی لیے اس کا چہرہ کسی بھیگے گلاب کی مانند لگ رہا تھا۔ مسلسل رونے کی وجہ سے اس کی ستواں ناک سرخ ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہا' میں اسے دنیا بھر کی خوشیاں دے دوں۔ اتنا پیارا چہرہ دکھوں کے لائق نہیں ہو سکتا۔ وہ تو کسی موم کی گڑیا کی مانند تھی مگر میں نہیں جانتا تھا کہ اس پر تقدیر نے کیا کیا ستم ظریفیاں کی ہیں؟ اس کا کیا مسئلہ ہے؟ مگر اس کا مسئلہ مجھے اپنا مسئلہ لگنے لگا تھا کیونکہ مجھے اس بھیگے چہرے' غلافی آنکھوں والی موم کی گڑیا سے عشق ہو گیا تھا۔ میں دربار کی صفائی کرتا اور چپکے چپکے ایک نگاہ اس کے چہرے پہ بھی ڈال لیتا۔ حلیے سے وہ اچھے خاندان کی لگتی تھی۔ وہ دربار میں اس وقت تک بیٹھی روتی رہتی جب تک دربار بند ہونے کا وقت نہیں ہو جاتا چنانچہ آج بھی وہ اُسی وقت اٹھی اور دروازے کے سامنے بیٹھی ملازمہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے اشارے پر ملازمہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں دربار کے دروازے پر کھڑا اسے تب تک دیکھتا رہا جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ اب وہ اگلی جمعرات کو دربار آتی۔ یوں مجھے پورا ہفتہ اس کا انتظار کرنا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس بار جب وہ آئے گی تو میں اس سے اس کی کہانی جان کر ہی دم لوں گا لیکن مجھے ہفتے بھر انتظار نہیں کرنا پڑا۔

ایک روز خلافِ معمول جمعرات سے پہلے ہی وہ مجھے گیٹ سے اندر آتی دکھائی دی۔ میں اسے دیکھ کر قدرے حیران ہوا اور پھر فوراً دربار میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس بار وہ تنہا تھی' ملازمہ اس کے ہمراہ نہیں تھی۔ آج جمعرات نہیں تھی اس لیے دربار میں رش نہیں



تھا۔ سفید لباس میں وہ شہزادی دکھ رہی تھی مگر اس کا چہرہ معمول سے زیادہ اداس تھا۔ وہ حزن و ملال کی تصویر بنی ہوئی تھی پھر وہ اسی طرح معمول کے مطابق دربار مبارک میں مدفون بابا سائیں جمال شاہ کے قدموں کی طرف بیٹھ کر روتی رہی اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتی رہی۔ آج اس کی آواز بھی قدرے بلند تھی۔ وہ میری موجودگی کی پروا کیے بغیر ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ بہت دیر بعد جب اس کے آنسوؤں اور آہوں کا طوفان تھما تو میں نے ہمت باندھی اور اسے پکارا۔ ''بی بی.....!'' میری آواز پہ اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

''جج.....جی.....!'' اس نے لرزتی آواز میں بمشکل کہا۔

''اگر آپ کو برا نہ لگے تو آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں؟'' میں نے اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میں پچھلی تین جمعراتوں سے آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ آپ آتی ہیں اور بابا سائیں کے قدموں پر سر رکھے رونے لگتی ہیں۔ آپ کو کیا دُکھ ہے؟'' میں نے اپنا سوال اس کے سامنے رکھ دیا۔

''آپ یہ سب جان کر کیا کریں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہو سکتا ہے' میں آپ کا دکھ بانٹ سکوں۔'' میری بات پر اس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

''کس حیثیت سے؟''

''ایک خیر خواہ کی حیثیت سے۔''

''خیر خواہ؟'' اس کے لہجے میں کڑواہٹ بھر گئی۔ ''خیر خواہ تو زندگی میں بہت سے ملے ہیں' اُن خیر خواہوں کی بدولت ہی میں آج اس مقام پر ہوں جہاں کوئی سچی چاہت نہیں۔ اگر آپ کو میرا دکھڑا سننے کا اتنا ہی شوق ہے تو سنیے۔'' میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

اس نے اپنی المناک کہانی شروع کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا گھرانہ چار افراد پر مشتمل تھا۔ میرے بابا' اماں' میں اور مجھ سے چھوٹا بھائی گلفام۔ ہم شہر کے مضافات میں واقع ایک چھوٹے اور خوبصورت گاؤں میں رہتے تھے۔ ہمارے گاؤں سے شہر تک کا فاصلہ صرف آدھ گھنٹے میں طے ہو جاتا تھا۔ میری زندگی بہت خوبصورت گزر رہی تھی کہ اس زندگی میں رب نواز کی آمد ہوئی۔

رب نواز میری دوست نازیہ کا خالہ زاد بھائی تھا' بہت بانکا سجیلا' بالکل میرے خوابوں کی طرح۔ اس سے میری ملاقات نازیہ کے گھر پر ہی ہوئی تھی۔ وہ پہلی نظر میں مجھے بھا گیا تھا اور میں بھی اسے بہت پسند آئی تھی۔ مجھ میں کوئی ایسی بات ہی نہیں تھی جو مجھے ناپسند کیا جاتا۔ میں سر سے پا تک حسن کا شاہکار تھی اور مجھے اپنے حسن کا ادراک بھی تھا۔ اپنے حسن پر مغرور تو میں پہلے بھی تھی مگر رب نواز کی چاہت نے مجھے نئے جہان کی سیر کرائی تھی۔ میں خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگی تھی۔ جلد ہی ہماری محبت کی خبر نازیہ کو بھی ہو گئی تھی' وہی ہماری ملاقات کا بندوبست کرتی' ہمارے خطوط قاصد کے طور پر نازیہ ہی ایک دوسرے تک پہنچاتی تھی۔ وہ ایک مخلص دوست تھی اور دل سے چاہتی تھی کہ ہمارا ملن ہو جائے۔ نازیہ کی ماں مر چکی تھی' باپ تھا جو محنت مزدوری کرتا تھا۔ دو چھوٹی بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ نازیہ سب سے بڑی تھی اور اپنے تایازاد سے منسوب تھی۔

وقت اسی طرح گزر رہا تھا۔ رب نواز کبھی اپنے گاؤں چلا جاتا اور کبھی مجھ سے ملنے کے بہانے نازیہ کے گھر آ جاتا۔ اب ہماری بے قراری حد سے سوا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہونے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اب ملاقاتوں میں ہمارے درمیان جسمانی قربت بھی ہونے لگی مگر یہ قربت ایک حد سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ میں اب رشتہ بھیجنے کے لیے اس پر زور دینے لگی مگر وہ ٹال مٹول کرتا رہا۔

عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے' ہمارے پیار کی خبر کسی طرح بابا کو ہوگئی اور پھر مجھ پر پہرے لگ گئے۔ میں پرائیویٹ بی اے کر رہی تھی' میری تعلیم پر بھی پابندی لگ گئی۔ بابا اور اماں مزدوری کرنے کھیتوں پر چلے جاتے تو گلفام میری چوکیداری کو موجود ہوتا۔ میری وجہ سے اس بے چارے کا اسکول بھی چھوٹ گیا تھا۔ میرے بابا بس سخت مزاج آدمی تھے مگر مجھ سے بہت پیار کرتے تھے بلکہ وہ ہم دونوں بہن بھائی کی فرمائشوں کو حتی الامکان پورا کرتے تھے۔ میری اماں سیدھی سادی صابر عورت تھیں۔ انہوں نے بھی ہمارے بہتیرے لاڈ اٹھائے لیکن میری وجہ سے اماں کو بھی طعنے ملے اور بابا نے میرے ساتھ ساتھ اماں پر بھی تشدد کیا تھا۔

میری وجہ سے گھر کا ماحول کشیدہ ہو چکا تھا۔ اپنی اماں کو ہمہ وقت روتے دیکھ کر بھی میرا دل پسیج نہیں رہا تھا۔ اماں نے اپنے سر کی چادر اتار کر میرے پاؤں پہ پھینکی تھی مگر میں جانے کیوں اس اندھے جذبے کی خاطر مزید شیر ہوگئی تھی۔ مجھے بابا کے جھکے کندھوں اور اماں کے پریشان چہرے پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔ میں سنگدل ہوئی جا رہی تھی اور اسی سنگدلی میں مجھے اپنے خون کی مہک' رشتوں کی گہرائی' کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر گزرتا دن مجھے ڈھیٹ اور کٹھور بنا رہا تھا۔ میں نے اماں سے صاف کہہ دیا تھا کہ میں شادی کروں گی تو صرف رب نواز سے' مجھے کسی طرح بھی کوئی اور رشتہ منظور نہیں۔ میری بے باکی پر اماں ہول اٹھی تھیں۔ وہ مجھے پیار سے سمجھاتی رہیں مگر میں اپنی ضد پر قائم رہی تو اماں نے دیوار سے ٹکریں مار مار کر اپنا ماتھا لہولہان کر لیا اور روتے ہوئے مجھے کوسنے اور بددعائیں دیتی رہیں۔ شفیق ماں کا یہ روپ میرے لیے نرالا تھا۔ میری ہی ضد نے ان کو اس حال تک پہنچایا تھا مگر میں اڑیل بنی اپنی ضد پر اڑی رہی تھی اور اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ بے تحاشہ بین اور بددعائیں دینے کے بعد اماں تھک ہار کر چپ ہوگئیں۔ میں کم ذات یہ سمجھ نہ پائی کہ اماں اب ہمیشہ کے لیے چپ ہوگئی ہیں۔ وہ تو گلفام گھر آیا تو اس نے اماں کو صحن میں بے سدھ پڑا دیکھ کر شور مچا دیا۔ شور کی آواز سن کر میں اپنے کمرے سے باہر آئی۔ دوڑ کر اماں کی نبض ٹٹولی۔ اماں تو جانے کب تمام دکھوں سے بے نیاز ہو چکی تھیں۔ میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ میں کتنی بدنصیب تھی کہ میری وجہ سے میری ماں نے جان دے دی تھی۔ کاش میں مر جاتی مگر اس وقت یہ خیالات میرے ذہن میں نہیں تھے' بس اماں کی موت کا صدمہ تھا۔ یہ بات علیحدہ تھی کہ اتنے بڑے سانحے کے بعد بھی میری سوئی رب نواز پہ اٹکی ہوئی تھی۔

میری چیخ و پکار سن کر تمام محلہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ بابا کو اطلاع دی گئی' وہ سب کام چھوڑ کر بھاگم بھاگ گھر آیا۔ اس دن میں نے زندگی میں پہلی بار بابا کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرے بابا تو بہت ہمت و حوصلے والے اور مضبوط اعصاب کے مالک تھے مگر اماں کی موت نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ دن بہ دن گھلتے جا رہے تھے۔ اماں کے بعد گھر میں ایک عجیب سی ویرانی چھا گئی تھی۔ میں بھی اماں کے بغیر اداس تو تھی مگر نادم نہیں۔

اماں کے چہلم کے بعد ایک دن نازیہ مجھ سے ملنے آئی۔ اس کی چادر میں شاید کوئی چیز تھی اور جب



وہ چیز برآمد ہوئی تھی' پتہ چلا میرے ہاتھ میں نئے ماڈل کا موبائل تھا۔ یہ موبائل نواز نے میرے لیے بھجوایا تھا۔ نازیہ نے مجھے موبائل استعمال کرنے کا طریقہ سمجھایا اور چلی گئی۔

میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا کہ رب نواز سے رابطے کا ذریعہ مل گیا تھا۔ موبائل میں سائلنٹ پر لگا کے اور بابا سے چھپا کر رکھتی تھی۔ موبائل پر باتیں کرنا اب ہمارا معمول بن گیا تھا۔ بابا شاید میری طرف سے مطمئن ہو گئے تھے یا پھر اماں کے غم نے انہیں مجھ سے غافل کر دیا تھا۔ بہرحال جو بھی تھا' اب وہ مجھ پر توجہ نہیں دیتے تھے اور میں اس بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے محبت والے پاگل پن میں مصروف تھی۔

ایک دن رب نواز نے مجھے گھر سے بھاگنے کا کہا۔ اس کے مطابق' اس کی اماں اس شادی پر راضی نہیں تھیں۔ پہلے وہ مجھے شہر میں کسی دوست کے ہاں رکھے گا پھر ہم شادی کر کے اپنا گھر بنائیں گے۔ میں تو پہلے ہی راضی تھی اور ایک رات اپنے بابا کی عزت کو قدموں تلے روندتی ہوئی گھر کی دہلیز پار کر گئی۔ میں خوابوں میں رہنے والی کمزور لڑکی رب نواز کے جھانسے میں آ گئی تھی۔ وہ مجھے اپنے دوست کے فلیٹ پر لے گیا۔

اور پھر اس نے شادی تو نہیں کی بلکہ مجھے بہلاوے دے کر قربتوں کی تمام حدیں پار کر لیں۔ میں بدکردار ہو چکی تھی' میری عزت لٹ گئی تھی' اس محبت نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔ وہ کئی روز تک مجھ سے کھیلتا رہا پھر اپنے دوست کے سامنے مجھے پیش کر دیا۔ یہ دیکھ کر میں روتی رہی' گڑگڑاتی رہی' التجا کرتی رہی' ان کے آگے ہاتھ جوڑے مگر ان خبیثوں نے میری ایک نہ سنی۔ اس وقت میری نگاہوں میں اپنی سیدھی سادی اماں کا لہولہان بے سدھ وجود گھوم گیا۔ مجھے ننھا گلفام یاد آیا' اپنے مہربہ لب بابا یاد آئے' اماں کی بددعائیں اور کوسنے میرے کانوں میں گونجنے لگیں مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا' جب ان شیطانوں کا دل بھر گیا' وہ مجھے اس بستی میں لے گئے جہاں حوا کی بیٹی بکتی ہے۔ میرے عوض انہوں نے اچھی خاصی رقم حاصل کر لی تھی۔ میں کسی سے کیا شکوہ کرتی' یہ سب میں اپنے کیے کی سزا بھگت رہی تھی پھر میرے پاؤں میں گھنگھرو بندھ گئے اور میرا جسم بازار میں رکھی جنس بن کر رہ گیا۔

بازارِ حسن میں مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا' میں حسن کا نگینہ تھی' محفلیں میرے دم سے آباد ہونے لگی تھیں۔ میں محفلوں میں تھرکتی' ہنستی تو تنہائیوں میں روتی تھی۔ میری روح اور جسم پر ایسے گھاؤ لگے تھے جو کبھی نہیں بھر سکتے تھے۔ میں اپنے بابا کی عزت رول بیٹھی تھی۔ اب میں طوائف تھی' دولت کے انبار میرے قدموں میں تھے' میرا غرور خاک ہو گیا تھا۔ مجھے میری کم عقلی اور اماں کی بددعاؤں نے زندہ درگور کر دیا تھا۔ میں جتنا پچھتاتی' کم تھا مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ دولت تو میرے پاس تھی' عزت نہیں تھی۔ جانے کتنے نام نہاد عزت داروں کے ہاتھوں کھلونہ بننے کے بعد میں امید سے ہو گئی۔ میں نے لاکھ چاہا کہ گناہوں کی اس نشانی سے نجات حاصل کر لوں مگر کامیاب نہیں ہو سکی کیونکہ کوٹھے کی مالکن شاپارہ بیگم کو بھی میرے وجود سے ایک اور شہزادی چاہیے تھی۔ میں تڑپتی رہی اور اپنی کوکھ میں سانس لیتی اس ننھی جان کے لیے مر جانے کی دعا کرتی رہی۔ میں اللہ سے دعا کرتی کہ وہ مجھے بیٹا دے' بیٹی نہ دے مگر قدرت کے اپنے کھیل ہوتے ہیں' وہ بے نیاز ہے' اس کی بے آواز لاٹھی کی مار بہت سخت ہوتی ہے۔ اس نے مجھے ایک نہیں' دو بیٹیوں سے نوازا تھا۔ میں رو رہی تھی اور کوٹھے پر جشن کا سماں تھا۔ سب کی چاندی ہو گئی تھی۔ ان کا مستقبل تابناک ہو گیا تھا مگر



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں لرز رہی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی' بددعاؤں کی بازگشت میری بچیوں کے ساتھ بھی تاریخ دہرادے اور انہیں بھی گھنگھرو باندھنے پڑیں۔ وہ میرے نقشِ قدم پر چلیں پھر میں نے فیصلہ کرلیا۔

میں نے دودھ کی بوتل میں زہر کا ایک قطرہ ٹپکایا۔ ننھی سی جانوں کے لیے ایک قطرہ ہی مہلک ثابت ہوتا۔ ایک بچی جس کا نام شہ پارہ بیگم نے ستارہ رکھا تھا' وہ بھوک سے بلکنے لگی جبکہ ہیرا ننھی آنکھوں کو موندے سو رہی تھی۔ دونوں بچیوں نے ہو بہو میرا حسن چرایا تھا اور میں اب اس حسن سے خائف ہوگئی تھی۔ جانتی تھی' یہ حسن بربادی کا سامان ہے پھر میں نے ستارہ کو زہر آلود دودھ پلا کر ہمیشہ کی میٹھی نیند سلا دیا اور اپنے سینے سے چمٹا کر سسک اٹھی۔ اس کے ننھے منے وجود کو چومنے لگی۔

''میری بچی! مجھے معاف کردینا۔ تیری گناہ گار ماں مجبور تھی' نہیں چاہتی تھی کہ میرے کرتوتوں کا خمیازہ تو بھگتے۔'' کوٹھے میں صفِ ماتم بچھ چکی تھی' کسی کو معلوم نہ ہوسکا کہ اس کی قاتل میں ہوں پھر یونہی ایک دن میں نے ہیرا کو مارنے کا فیصلہ کیا مگر اس بار یہ کام مجھ سے نہ ہوسکا۔ میری ممتا تڑپ گئی تھی۔ وہ ناجائز اولاد سہی مگر میرے جگر کا ٹکڑا تھی۔ اس کی ننھی رگوں میں میرا لہو بھی تھا۔

ستارہ تو مرگئی تھی مگر میرے گناہوں میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ میرا دل محفلوں سے اچاٹ ہوگیا تھا مگر پھر بھی میں گھنگھرو باندھ کر عزت داروں کو خوش کرتی رہی۔ میں سوچتی' ہیرا کا مقدر کیا ہوگا؟ میں وہ جنت اسے کہاں سے دوں گی جو اللہ نے ماں کے قدموں تلے رکھی ہے؟ میرے قدموں تلے تو جہنم کی آگ ہے پھر میں اپنے خدا کے قریب ہوگئی۔ اس کی رحمت سے مجھے بڑی امید تھی۔ میں اس کی معافی کی خواستگار بن کر تنہائی میں بلکتی رہتی۔ جائے نماز پہ گھنٹوں بیٹھ کر توبہ استغفار کرتی اور اب یہاں آپ کے سامنے ہوں۔ خانقاہوں پہ جانا میرا معمول ہے۔ میں بابا سائیں جمال شاہ کی معتقد ہوں اور اُن کے توسط سے اللہ تعالیٰ سے معافی کی طلب گار ہوں۔ مجھے اللہ کی رحمت سے بہت امید ہے۔ شاید وہ مجھے معاف کردے۔ ویسے سنا تو یہ ہے کہ وہ والدین کے نافرمانوں کو معاف نہیں کرتا۔'' آنسو اس کے شفاف رخساروں پر پھسل رہے تھے۔ اس کی دکھ بھری داستان نے مجھے بھی افسردہ کردیا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں ہوسکا کہ کب میرے آنسو بھی اس کے دکھ پہ بہہ نکلے تھے۔

''مایوسی کفر ہے شہزادی.....!'' میں نے اسے دلاسہ دیا۔ وہ پھیکے پن سے مسکرائی اور اٹھ کر چل دی۔ میرا دل بھی بوجھل تھا۔ میرے ہاتھ بے ساختہ اس کے حق میں دُعا کی صورت اٹھ گئے۔

کئی جمعراتیں گزر گئیں۔ شہزادی نہیں آئی تھی۔ میری حالت غیر تھی۔ مجھے اس کے متعلق فکر سی لاحق ہوگئی تھی۔ اس روز شہزادی تو نہ آئی لیکن اس کی ملازمہ میرے پاس آکر رکی۔ اس کی چادر میں کچھ چھپا ہوا تھا۔ میں نے بے تابی سے شہزادی کے بارے میں پوچھا۔

''صاب.....! شہزادی نے خودکشی کرلی ہے.....''

''کیا.....؟'' میں صدمے سے گنگ رہ گیا۔

''ہاں صاب..... اس نے اپنی امانت آپ کے حوالے کی ہے اور میں بہت مشکل سے آپ کے پاس آئی ہوں۔'' ملازمہ نے آنسو پونچھ کر کمبل میں لپٹی بچی کو میرے حوالے کیا۔ وہ واقعی کسی ہیرے کی مانند چمک رہی تھی۔ اس نے ایک خط بھی میری طرف بڑھایا اور واپس چلی گئی۔ میں نے بچی کو دیکھا' ننھی منی مٹھیوں کو بھینچے وہ معصوم حقیقتاً شہزادی کا



دوسرا روپ تھی۔ میں نے اس کے گلابی گالوں پہ بوسہ دیا اور اپنی گود میں لٹا کر خط کھولا۔

''محترم احمد صاحب!

السلام علیکم!

یہ خط جب تک آپ کے پاس پہنچے گا' میں اس دنیا کے جھمیلوں سے دور جا چکی ہوں گی۔ میں نے آپ کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت و شفقت دیکھی ہے۔ ہیرا میں میری جان ہے۔ میں مرنے سے پہلے اسے محفوظ ہاتھوں میں دینا چاہتی تھی اور آپ مجھے اس کے لیے محفوظ پناہ گاہ لگے۔ آپ شاید میرے بارے میں اتنا نہ جانتے ہوں جتنا میں آپ کے بارے میں جانتی ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ بابا سائیں جمال شاہ کے دربار پر نگران مقرر ہیں۔ شادی شدہ ہیں مگر اولاد کی نعمت سے محروم ہیں۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا اور ہیرا نے آپ کی بیٹی بننا تھا۔ اب آپ چاہے ہیرا کو مجبور و دکھی ماں کی امانت سمجھیں یا محبت کا تحفہ' اس کی پرورش آپ کے ذمے ہے اور اگر آپ کو یہ منظور نہیں تو پھر اسے کسی دارالامان یا یتیم خانے چھوڑ دینا مگر خدا کا واسطہ ہے' اسے اس بستی سے بچالینا جہاں عصمتوں کا خون ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی رگوں میں میرا خون ہے مگر آپ کی اچھی تربیت سے ہیرا واقعی ہیرا بن جائے گی۔ بابا سائیں جمال شاہ کے حضور میرا اسلام عرض کیجیے گا اور میرے حق میں دُعا کریں کہ وہ رب میرے گناہوں کو معاف فرمائے۔

خدا حافظ!

ایک دُکھی ماں''

میں نے اس کا خط لبوں سے لگا کر بے ساختہ چوم لیا۔ واہ مالک! تیرے کھیل نرالے ہیں۔ تیرا قلم بہت بے نیاز ہے۔ بابا سائیں جمال شاہ کی خدمت میں اس کا سلام عرض کرتے ہوئے مجھے یقین تھا کہ

## اب میں بس.....

گن گن خوشیاں سمیٹتا ہوں
کچھ بارش کی بوندوں سے
کچھ پھولوں کی کلیوں سے
گن گن خوشیاں سمیٹتا ہوں
لمحوں کو پہچان دیتا ہوں
کچھ زندگی کے رنگوں سے
کچھ زندگی کے لمحوں سے
گن گن خوشیاں سمیٹتا ہوں
زندگی گزارتا ہوں
جب محفل میں بیٹھتا ہوں
اپنی خوشیاں بانٹتا ہوں

زوہیب ماہی

اللہ اسے معاف کردے گا کیونکہ شہزادی کے گناہ اللہ کی رحمت سے زیادہ نہیں تھے اور مجھے یقین ہے کہ میری بیوی ناجیہ اس بچی کو خوشی سے قبول کرلے گی کیونکہ وہ خداترس عورت ہے۔ ہیرا میرے لیے شہزادی کا خوبصورت تحفہ تھی۔ میں نے اس کی پیشانی پہ اپنے لب رکھ دیئے۔ مجھے اِس میں شہزادی کی خوشبو آرہی تھی۔

''شہزادی.....! تُو پاگل ہے' ماں اگرچہ طوائف ہی کیوں نہ ہو۔ خدا نے اس کے پیروں تلے بھی جنت رکھی ہے۔''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وفا صدام حسین غازی

# نایاب انسان

شاہد بخاری کا خیال

اس عشق کے میدان کا وہ شخص بظاہر
لگتا تو نہیں، مان لو فنکار بہت ہے

**ایک ایسے عجیب انسان کا قصہ جو اب نایاب ہوتے جا رہے ہیں**

میں نے پہلی بار اسے مسجد میں دیکھا تھا اور وہ مجھے پہلی نظر میں اچھا لگا تھا۔ اس کے چہرے پر سادگی و معصومیت چھائی ہوئی تھی پھر وہ ہر روز مسجد میں نظر آنے لگا مگر کبھی میری اس سے بات نہیں ہوئی۔ وہ زیادہ تر خاموش رہتا تھا اور کسی سے بات نہیں کرتا تھا' بس اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ اس کی اس خاموشی نے مجھے بے چین کر دیا کہ آخر اس کی خاموشی کی وجہ کیا ہے اور ایک دن میں نے اس سے بات کرنے کی ٹھانی۔ اس کی ایک عادت بھی تھی کہ نماز کے بعد وہ لمبی دعا مانگتا تھا۔ چنانچہ اس روز میں نے مختصر دعا مانگی اور فوراً اس کے نزدیک جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ اٹھے ہوئے تھے اور نظریں آسمان پر ایسے جمی ہوئی تھیں جیسے کسی کو کھوج رہی ہوں البتہ اس کے لب خاموش تھے۔ خاصی دیر تک اسی طرح وہ ہاتھ اٹھائے خاموش لبوں کے ساتھ دعا مانگتا رہا اور پھر منہ پر ہاتھ پھیر کر اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ دیکھ کر میں بھی اٹھا اور اس کے پاس جا کر سلام کیا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

''جی' کہیے؟''

''جی' میرا نام محمد علی ہے اور آپ کا.....؟''

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ''میرا نام حسین ہے۔''

''آپ یہاں نئے آئے ہیں؟'' میں نے اس سے استفسار کیا۔

''ہاں!'' اس نے مختصراً جواب دیا۔ ''ویسے آپ ہیں کون؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''میں یہیں رہتا ہوں اور ٹیچر ہوں۔''

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی' اچھا محمد علی بھائی! میں چلتا ہوں۔ مجھے ضروری کام ہے۔'' اس نے کہا اور چلا گیا۔ میں سوچ رہا تھا اس نوجوان کو کیا غم ہو سکتا ہے جو اتنی گریہ وزاری کرتا ہے۔ وہ بیس یا بائیس سال کا نوجوان تھا۔ چہرہ پرکشش تھا لیکن اس پر اداسی چھائی رہتی تھی۔

پھر کئی دن گزر گئے لیکن وہ مسجد میں نظر نہیں آیا۔ ایک دن عشاء کی نماز کے لیے میں دیر سے پہنچا تھا مسجد تقریباً خالی ہو گئی تھی مگر وہ مسجد کے ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ہاتھ اٹھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں دعا کرنے میں مشغول تھا۔ میں نے نماز نہیں پڑھی اور اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ وہ دعا میں بڑبڑا رہا تھا۔ میں اس انتظار میں رہا کہ وہ فارغ ہو مگر اس کی دعا لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے اردگرد سے بے نیاز خود فراموشی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ کافی دیر بعد جب دعا سے فارغ ہو کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں غم و اداسی گھلی ہوئی تھی تاہم اس کے چہرے پر ایک خاص چمک تھی۔

''محمد علی بھائی! کیسے ہو آپ؟'' اس نے اداسی بھری مسکراہٹ سے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں' آپ سنائیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ کی دعائیں ہیں۔ آج آپ لیٹ ہو گئے۔'' اس نے کہا۔

''جی ہاں، دراصل آج کام سے ہی لیٹ آیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا' آپ نماز پڑھیں۔ میں چلتا ہوں' کبھی فرصت کے ٹائم میں باتیں کریں گے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور مسجد سے باہر نکل گیا۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا پھر کئی دن تک وہ غائب ہو گیا۔

ایک روز میں نے اسے اپنے ایک دوست کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تو میں حیران رہ گیا۔ میرا وہ دوست دو گلی چھوڑ کر رہتا تھا۔ اس کا نام عمر تھا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگلے دن میں عمر سے ملا اور اس سے حسین کے متعلق پوچھا تو عمر نے بتایا تھا۔

''حسین میرا بھائی ہے۔''

''کیا!! لیکن میں نے پہلے تو کبھی اسے تمہارے گھر میں نہیں دیکھا۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں یار وہ یہاں نہیں رہتا تھا۔ نوکری کی وجہ سے دوسرے شہر میں رہتا تھا اور بہت کم ہی آتا تھا۔'' عمر نے کہا۔

''لیکن اب تو یہ مستقل یہیں نظر آرہا ہے اور یہ اداس کیوں رہتا ہے؟''

''وہ دراصل نوکری چھوڑ کر آگیا ہے اور اس کی اداسی کے پیچھے ایک کہانی ہے۔'' عمر نے کہا۔

''اچھا' وہ کیا؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''ابھی میرے پاس وقت نہیں ہے۔ رات کو ملیں گے پھر بتاؤں گا۔'' یہ کہہ کر عمر چلا گیا اور میں بت بنا کھڑا رہ گیا۔

عمر، حسین کا بڑا بھائی تھا اور میرا ہم عمر تھا۔ یہ لوگ تین سال پہلے اس علاقے میں آئے تھے۔ عمر میرے ساتھ ہی اسکول میں ٹیچر تھا اس لیے کچھ ہی دنوں میں اس سے دوستی ہوگئی تھی لیکن میں نے کبھی حسین کو نہیں دیکھا تھا۔

رات کو میں اپنے کاموں سے جلدی فارغ ہو کر عمر کے گھر پہنچ گیا کیونکہ مجھے حسین کے بارے میں جاننے کا شدید تجسس تھا۔ ہم دونوں گھر کی بیٹھک میں بیٹھ گئے جہاں میں اور عمر اکثر باتیں کرتے تھے۔

''عمر بھائی' جلدی بتاؤ یار' حسین کے متعلق' مجھ سے صبر نہیں ہو رہا۔'' میں نے بے چین ہو کر کہا۔

عمر نے سنجیدگی سے بات کا آغاز کیا۔ ''یار محمد علی! میرا بھائی بہت سیدھا سادہ ہے۔ یہ ہر ایک کے ساتھ بھلائی کرتا ہے مگر نہ جانے کیوں لوگ اس کے ساتھ بھلائی نہیں کرتے۔ میرا بھائی بچپن سے ہی ایسا ہے۔ دوسروں کی زیادتیوں کو معاف کرنا اور اپنی عزیز ترین چیزیں دوسروں پر قربان کر دینا اس کی فطرت میں شامل ہے۔ بچپن میں جب بھی کھلونوں پر میری اس سے ناراضگی ہوتی تو وہ لڑنے کی بجائے اپنے سارے کھلونے میرے حوالے کر دیتا تھا اگر کبھی میں اس سے بات کرنا چھوڑ دیتا تو وہ بے چین ہو جاتا اور مجھے منا لیتا تھا۔ اسی طرح ہمارا بچپن گزر گیا۔ جب اس کی پڑھائی مکمل ہوئی تو وہ نوکری کے سلسلے میں حیدرآباد چلا گیا اور ہم بھی گاؤں چھوڑ کر لاڑکانہ آگئے۔ حیدرآباد میں ہمارے بہت سے رشتے دار رہتے تھے لیکن حسین نے کسی عزیز رشتے دار کا احسان لینے کے بجائے اپنا گھر لیا اور رہنے لگا' تاہم عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کی ایثار و قربانی کی عادت بھی بڑھتی چلی گئی۔ اسے جو بھی کوئی کام کہتا' وہ فوراً کر دیتا۔ اس سے کوئی چیز مانگی جاتی تو انکار نہ کرتا۔ اپنی خواہشوں کو تو اس نے جیسے دفنا دیا تھا۔ وہ دوسروں کے لیے جیتا تھا۔ ہمیشہ مسکراتا رہتا تھا۔ کسی کی تلخ بات دل پہ نہیں لیتا تھا جو اسے برا بھلا کہتا تو یہ مسکرا دیتا تھا۔ ہمیشہ سب کے کام آتا۔ حیدرآباد میں اسے رہتے ہوئے دو سال گزر گئے۔ ان دو سالوں میں وہ صرف ایک بار گھر آیا تھا۔ حیدرآباد نے تو جیسے سمجھو اسے قید کر لیا تھا۔ اسی دوران اسے حیدرآباد میں ایک لڑکی سے محبت ہوگئی۔ وہ لڑکی ہماری خالہ کی بیٹی تھی۔ اس کا نام نائلہ تھا۔ حسین کی ہم عمر تھی۔ یقین کرو میرا یہ بھائی ایسا ویسا نہیں تھا کہ لڑکیوں کے چکروں میں رہے وہ تو پانچ وقت کا نمازی تھا مگر نہ جانے کیسے اسے محبت ہوگئی۔ میرا بھائی نائلہ کے پیار میں پاگل سا ہونے لگا۔ جب اس کی محبت حد سے سوا ہوئی اور اس کی بے چینی بڑھنے لگی تو اس نے مجھے فون کر کے سب کچھ بتا دیا۔



ہم دونوں بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے دوست بھی ہیں۔ وہ اپنی ہر بات مجھ سے شیئر کرتا ہے۔ اس نے اپنی یکطرفہ محبت کے حوالے سے مجھے ساری بات بتا دی۔ میں نے اسے کہا کہ جا کے نائلہ کے سامنے اپنی محبت کا اظہار کر دے۔

''نہیں، یہ میں نہیں کر سکتا۔'' اس نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو پھر میں فون کر کے کہہ دیتا ہوں۔''

''نہیں' نہیں' آپ کچھ نہیں کہیں گے۔ میں خود پرپوز کروں گا۔''

''ٹھیک ہے پھر ہمت کرو۔''

اسی طرح ایک سال اور گزر گیا لیکن وہ اظہار نہیں کر پایا۔

ایک رات کوئی ایک بجے اس کا فون آیا تو میں پریشان ہو گیا کہ جانے کیا مسئلہ ہوا تھا اس کے ساتھ۔ کال ریسیو کی تو اس کی سسکیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''کیا ہوا حسین..... !بولو.....'' میری کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ مسلسل حسین کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ وہ کچھ بول ہی نہیں پا رہا تھا۔ میں دیر تک اسے سمجھاتا رہا لیکن وہ مسلسل روتا رہا پھر اچانک بول پڑا۔

''یار عمر بھائی! وہ میرے نصیب میں نہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں بھائی! وہ اب میری نہیں رہی۔''

''آخر بتاؤ تو سہی بات کیا ہے؟''

''بھائی جان! میری محبت یکطرفہ تھی۔ میں اسے کبھی نہیں کہہ پایا کہ میں اس سے پیار کرتا ہوں۔ کچھ دن پہلے ہی حیدر اور نائلہ کی منگنی ہوگئی ہے۔ حیدر بھی نائلہ کو چاہتا تھا اس نے اپنے گھر والوں کو نائلہ کے رشتے کے لیے بھیجا اور دونوں کی بات پکی

**نظم**

شعور کی حدوں سے
بہت زیادہ آگے
سوچوں کی کسی کہکشاں میں
احساسات کے ہر رخ میں
تیری تصویر تراشی ہوئی ہے
کائنات کے سارے منظر
تیرے بغیر ادھورے ہیں
تیری شخصیت کا سحر
مجھ پر ایسے حاوی ہے
جیسے کوئی دیوتا.....

علی رضا عمرانی۔ سجاول

ہوگئی۔'' وہ پھر رونے لگا۔

''میں فون کرتا ہوں خالہ کو۔'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں بھائی! پلیز، آپ ایسا نہیں کریں گے۔'' اس کی التجا پر میں چپ ہو گیا اور اس نے فون بند کر دیا۔ میں سوچتا رہا۔ میرا بھائی کتنا بڑا دریا دل ہے۔ اس نے کسی اور کی خوشی کے لیے اپنی محبت کی قربانی دے دی۔

''یہ حیدر کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''حیدر بھی ہمارا کزن تھا۔''

''میں کافی دیر تک سوچتا رہا کہ اپنے بھائی کے لیے کیا کروں پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا کہ کیوں نہ میں نائلہ کو سب کچھ بتا دوں' سو یہ سوچ کر میں نے نائلہ کو فون کر دیا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

''عمر بھائی! کیسے ہیں آپ؟ سوری بھائی! وہ آپ کو منگنی کا ضرور بتاتے پر سب کچھ ایک دم سے ہو گیا۔ پتا ہی نہ چلا۔'' میں بس اس کی باتیں سن رہا تھا۔

''بھائی آپ مبارک باد نہیں دیں گے۔

''وو.....وہ.....حسین.....'' میں بہ مشکل اتنا ہی کہہ پایا۔

''ہاں' ہاں.....آپ سے پہلے حسین نے بھی فون کیا تھا' اس نے بھی مبارک دی' بڑا خوش ہوا میری منگنی کا سن کر۔'' اس بات پر میں نے کال کاٹ دی۔ کتنا سخی تھا میرا بھائی! اتنی بڑی قربانی کتنی آسانی سے دے دی۔

''پھر کچھ دن بعد وہ واپس آ گیا لیکن اب وہ اداس رہنے لگا تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت مسجد میں گزرنے لگا۔ اسے مسجد سے جیسے پیار ہو گیا تھا۔ اس کی نمازیں طویل ہونے لگیں۔ دعائیں لمبی ہونے لگیں۔ اس کا دل یہاں بھی نہیں لگا تو پھر گاؤں چلا گیا۔ اب وہ ہفتے میں دو دن یہاں تو باقی دن گاؤں میں ہوتا ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر گھر والے پریشان ہیں۔ اماں نے شادی کے لیے اصرار کیا تو وہ انکار نہیں کر پایا۔ کیسے کرتا انکار.....اس نے تو کبھی نا کا لفظ تو استعمال ہی نہیں کیا تھا۔ پہلے پیار کی قربانی دی، اب وفا کی بھی قربانی دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ صرف والدین کی خوشی کی خاطر حالانکہ اس نے تنہا رہنے کی قسم کھائی تھی۔ میں کیسے بتاتا' اماں ابا کو کہ بھائی پر کیا بیتی ہے پھر گاؤں میں رہنے والی ایک کزن سے اس کی شادی ہو گئی۔

وقت بدلتا گیا لیکن میرا بھائی نہیں بدلا۔ یہ اب بھی ویسا ہی ہے۔ کسی نہ کسی رشتے پر قربان ہوتا رہتا ہے اور خاموش رہتا ہے۔ مسکراہٹ اس کا ہتھیار ہے۔ اپنا غم اس مسکراہٹ میں چھپا لیتا ہے۔ گاؤں میں ہماری کچھ زمین ہے۔ اس ہی کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ بس اسی طرح اس کی زندگی کی گاڑی آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کی معاف کرنے اور قربان ہونے والی صفت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔'' عمر کی باتوں نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ حسین اتنا غم زدہ ہے لیکن کیسے اپنے غم چھپا لیتا ہے۔

''نائلہ کو بھی پتا چلا حسین کے پیار کا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں' اسے میں نے بتایا تھا۔ میرے بھائی کی محبت کے بارے میں جان کر وہ تڑپ اٹھی تھی۔''

''آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' اس نے سسکتے ہوئے پوچھا تھا۔

''حسین نے منا کر دیا تھا۔''

''اتنی بڑی قربانی دی حسین نے میری خوشی کے لیے۔''

وہ آج تک حسین کے سامنے نہیں آئی اور نہ ہی فون پر بات کی ہے۔ اس کی نظر میں وہ اس قابل نہیں کہ حسین جیسے عظیم انسان کا سامنا کر سکے' وہ اکثر مجھ سے کہتی ہے۔ ''بھائی! کاش' آپ نے بتا دیا ہوتا۔''

حسین کی کہانی سن کر میں گھر آ گیا تھا۔ اس رات میرے ذہن پر حسین کی شخصیت ہی غالب رہی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ دنیا میں اب بھی ایسے بے لوث انسان موجود ہیں۔

صبح کی نماز میں حسین سے سامنا ہوا تو اس نے مسکرا کے مجھے دیکھا تھا۔ میں حیران تھا کہ اس انسان کو اتنا ضبط اور صبر کہاں سے ملا۔ یہ انسان نہیں' فرشتہ ہے۔ قدرت نے اسے جانے کس مٹی سے بنایا تھا وہ اپنے دکھ کس آسانی سے چھپا لیتا تھا۔ ایسے انسان تو دنیا سے ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔



# جیتی جاگتی تحریریں ☆ زندگی کی ہفت رنگ تصویریں

احمر منصور

## ان کہی سی داستان

قابل اجمیری کا خیال

نامرادی اپنی قسمت، گمرہی اپنا نصیب
کارواں کی خیر ہو ہم کارواں تک آ گئے

**معاشرے کی اس جنس کی کہانی زندگی جس کے لیے ایک دشنام سے کم نہیں، آخری حصہ**

سانوری صبح سے بیٹھی رو رہی تھی اور نغمہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اُسے کیسے چپ کرائے؟ اتنے میں نیلو بھی آ گئی اور اس نے جب یہ تماشہ دیکھا تو وہ خوب زور زور سے ہنسنے لگی۔

''بس اتنی سی بات پر اور یوں ڈکرا رہی ہے جیسے کم بخت کے سارے مویشی مر گئے ہوں؟ لو بھلا چار سو روپے چوری ہو گئے یا کہیں گرا آئی تو کیا اب رو رو کے جان دے دے گی' ادا مادی کہیں کی.....''

''دیکھ سانوری.....جو تو ابھی کے ابھی چپ نہ ہوئی تو میں تیرے سر پر لا کے ہانڈی پھوڑ دوں گی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب کہہ دیا کہ ہم سب مل کے تجھے سو سو روپے دے دیں گے' ہو جائیں گے پورے چار سو اور کیا اب کم بخت منحوس ماری کیا ہماری جان لے گی؟ کس مشکل سے تو یہ رہنے کی جگہ ملی ہے' کیا یہاں سے بھی نکلوائے گی ہمیں؟ ٹھیک ہے' تیری آواز اتنی بری نہیں' پر ہے تو بری ہی' اتنی اچھی نہیں کہ تو یوں بیٹھی پٹر پٹر کرتی رہے اور لوگ برداشت کریں۔ ابھی نغمہ کی بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ دروازہ دھڑ دھڑانے لگا۔

"لے آ گئے تیرے خصم محلے والے..... اور ان میں وہ رفیق ضرور ہوگا جو پہلے ہی ہمارا دشمن ہے' اسے تو بس موقع چاہیے ہوتا ہے۔ اری او چھنال..... اب تو بند کر دے اپنا بھونپو' نہیں تو سب کو گھر میں گھسا لاؤں گی اور دے دوں گی اجازت کہ خوب مرمت کریں تیری....."

"ایسے ہی مرمت کریں گے' میں نے کون سی حرامیوں کی مرغیاں چرائی ہیں؟" روتے روتے یکا یک سانوری چپ ہو گئی اور لگی تڑکی بہ تڑکی جواب دینے۔ نیلو کو پھر ہنسی آئی۔

"چل نیلو..... تو بھی دروازے پر' اس کے ہونے والوں سے نمٹیں۔" نغمہ اب بھی غصے اور جھنجلاہٹ میں تھی۔

"چل ری' ٹھہر و تم دونوں' میں خود ہی نمٹ لوں گی ان کتوں سے۔" یہ کہہ کر سانوری اٹھی اور کمرے سے باہر چل دی۔ نیلو اور نغمہ ایک دوسرے کی طرف دلچسپی سے دیکھنے لگیں۔ ان کے لیے یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی کہ محلے والے ان کی طرف سے شاکی ہی رہتے تھے اس لیے بڑی احتیاط سے جینا پڑتا تھا۔

کچھ دیر میں سانوری لوٹ آئی۔ "کیا ہوا' کیا کہتے تھے' وہ موا رفیق بھی تھا کیا؟ اتنی جلدی کیسے لوٹ آئی؟" نیلو' نغمہ نے مل کر سوالوں کی بوچھار کر دی۔

"دم لینے دو کتیاؤں..... یوں تیر پہ تیر چلاتی نہ چلی جاؤ....." سانوری نے کہا۔

"چل اب بتا اور کتنے دم لے گی؟ سور جی..... تیرے دم لیتے لیتے کہیں ہمارا دم نہ نکل جائے' پھوٹ بھی اب....." نغمہ کو طیش آنے لگا' ویسے بھی وہ زیادہ دیر چپ بیٹھنے والی مخلوق نہیں تھی۔

"اری..... وہ رفیق کی بیوی تھی رشیدہ' کہتی تھی' بچہ رات بھر نہیں سویا۔ ابھی سویا ہے تو میری آواز سے جاگ جائے گا۔ بے شک روتی رہو پر ذرا نیچی آواز سے۔"

یہ سنتے ہی نیلو ہنس ہنس کے دہری ہو گئی۔ "مطلب' وہ کہتی ہے' بے شک روتی رہو' پر نیچی آواز سے؟" نیلو تالیاں پیٹ پیٹ کے ہنسے چلے گئی۔

"اب کیا ہنس ہنس کے جان دے گی منحوس ماری..... لوگوں کو ہمارے رونے ہنسنے کی پروا بھی کب ہے' اوپر سے سانوری غریب کا تو رونا بھی ایسا ہے جیسے گدھوں میں بھونکنے کی ریس لگی ہوئی ہو....." نغمہ نے کچھ یاسیت سے کہا۔

"چل' چل' اب حد سے بڑھتی نہ جا' گدھا ہوگا تیرا پورا خاندان..... مجھے گدھا بولتی ہے؟" سانوری کو ایک دم غصہ آ گیا۔

"تو پھر کیوں آئی تھی وہ تیری سوت تجھ خصماں کھانی کو رونے سے روکنے؟" نغمہ کو تو موقع چاہیے ہوتا ہے' لڑنے اور کتر کتر زبان تیز کرتے رہنے کی اسے یوں بھی عادت تھی۔

"چل چھوڑ نا نغمہ' تو بتا' رو کیوں رہی تھی؟" نیلو کچھ سنجیدہ ہو گئی۔

"ارے' وہ پوہے نا' ندیم نام ہے اس کا۔"

"ہائے..... کاش میں شبنم ہوتی....." درمیان



سے نغمہ نے چٹخارہ بھرا۔

"بچہ ہے وہ دس سال کا' شبنم نہ ہوتی' ندیدی..... حرام خور....." سانوری پھر دھاڑنے لگی۔

"تو بھی نا نغمہ..... اتنی مشکل سے تو وہ اپنے رونے کی وجہ بتانے پر راضی ہوئی تھی تو نے پھر گند ڈال دیا۔ کچھ دیر اس زبان کو تالا لگا۔" نیلو نے نغمہ کو سخت سست سنانا شروع کر دیں اور نغمہ منہ پر انگلی رکھ کے بیٹھ گئی۔

"چل اب بول بھی چک سانوری' تیرے تو نخرے ہی بہت ہیں۔" نیلو اب چڑنے لگی تھی۔

"وہ ندیم ہے نا' اس کی فیس کے لیے رکھے تھے۔ بے چارے کے ابا نہیں ہیں' دن بھر ایک مکینک کی دکان پر کام کرتا ہے۔ اس سے ایک چھوٹی بہن اور ماں کا بڑی مشکل سے گزارہ ہوتا ہے' بس یونہی ایک دن میں نے اس سے پوچھ لیا کہ منے تمہاری عمر تو پڑھنے والی ہے' پڑھتے کیوں نہیں ہو؟ تو بولا۔ "پیسے نہیں ہیں۔" ہائے نیلو..... کلیجہ کٹ گیا میرا..... پیسہ بڑی کتی مخلوق ہے تو مجھے سمجھ ہی نہ آئے کہ کیا کہوں اس سے تو میں نے پھر پوچھا۔ "پیسہ ہوگا تو پڑھو گے؟" بولا۔ "ہاں' مجھے بڑا شوق ہے پڑھنے کا۔" تو میں نے پوچھا کہ یہ جو کام کرتے ہو اس کا کیا ہوگا؟ بولا۔ "استاد جی سے آدھے دن کی اور رات دیر تک کام کرنے کی اجازت لے لوں گا۔ پر استاد ڈرامشکل سے مانے گا۔" تو میں نے کہا۔ "میں استاد سے بات کروں؟" بولا۔ "پر پیسے کہاں سے آئیں گے؟ ہر مہینے پانچ' چھ سو روپے تو ضرور چاہیے ہوتے ہیں؟" میں نے بڑی مشکل سے اسے راضی کیا کہ میں اسے ہر مہینے دے دیا کروں گی اتنے پیسے تو وہ اسکول میں داخلہ لے لے اور اس کے استاد سے بھی میں نے بات کی۔ استاد کو شرم آ گئی تھوڑی کہ جو سانوری اس کے آگے ہر روز دو روپے کے لیے

## نیند کہاں.....؟

نیند پورے بستر میں نہیں ہوتی
وہ پلنگ کے ایک کونے میں
دائیں
بائیں
کسی مخصوص تکیے کی
توڑ موڑ میں چھپی ہوتی ہے
جب تکیے اور گردن میں
سمجھوتہ ہو جاتا ہے
تو آدمی چین سے
سو جاتا ہے

ندا فاضلی

ہاتھ پھیلاتی ہے' وہ چھ سو روپے ماہوار پر اسی کے ایک شاگرد کو پڑھانے کی بات کرتی ہے۔ استاد مان گیا اور بولا۔ "چلو پھر میں اس کی دیہاڑی نہیں کاٹوں گا۔" استاد کو میں نے سات پشتوں کے احسان کی دعا دی اور اگلے دن ندیم کو لے گئی اسکول۔ ارے ایسا ذہین کہ فر فر سب سنا دیا۔ ماسٹر جی نے اسے داخلہ دے دیا۔ میں نے انہیں پوری بات بتا دی۔ وہ بولے۔ "آپ کو آئندہ آنے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ بچے کے ذہن پر برا اثر پڑے گا۔ دوسرے بچے اسے چین سے جینے نہیں دیں گے۔" سسرے ماسٹر کی بات دل پہ سبل کی طرح لگی مگر میں اپنے جذبات پی گئی۔ ندیم کا داخلہ ہو گیا اور وہ 400 روپے۔" یہ کہہ کر سانوری پھر سے برے برے منہ بنانے لگی۔

"اری' یہ تو بڑی نیکی کا کام ہے۔ چل' ہم سب مل کے تیرے 400 روپے پورے کر دیں گے۔" سانوری نے عجیب خالی خالی نظروں سے نیلو کی طرف دیکھا جس نے آج میک اپ برائے نام کیا تھا پھر بھی اس کے چہرے پر ڈھیروں خوبصورتی جمع ہو گئی تھی۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس قسم کا بے حد جذباتی سا ماحول دیکھ کر نغمہ نے اپنے گریبان میں سے وہ 400 روپے نکالے اور چپ چاپ ان دونوں کے سامنے رکھ دیئے۔ لمحے بھر کو حیرت کا لپکا سا سانوری کی آنکھوں میں نظر آیا پھر وہ اٹھی اور دھمو کے بے دھمو کے نغمہ پر برسانے لگی۔ نغمہ سر نیچے کیے پٹے چلی گئی تو نیلو کو بڑی حیرانی ہوئی کہ نغمہ جیسی چنڈال اتنی شانتی سے کیونکر مار کھا رہی ہے؟

''رک جا سانوری...... بس کر آج تو دن ہی بڑا رنجیدہ اور ملکہ جذبات ٹائپ ہے۔ یہ نغمہ ایسی سعادت مندی سے کاہے کٹ رہی ہے؟ رک...... ٹھہر ذرا......'' نیلو کی بات سن کر سانوری کے بے تکے انداز سے چلتے ہوئے ہاتھ یکا یک تھم گئے۔

''کیوں ری نغمہ' کیا بات ہے' کیا ہوا ہے؟ تو چوری کب سے کرنے لگی؟'' نیلو نے اس کا سر اوپر اٹھایا تو وہ رو رہی تھی۔

''وہ نور جہاں باجی ہے نا' بوڑھی ہو گئی ہے' پہلے ہی پیٹ بھر کے بدصورت تھی' میک اپ کرے تو شکل پر منوں کے حساب سے پھٹکار برسنے لگتی تھی' بس وہ......'' نغمہ نے اپنے آنسو پونچھ کر کہا۔

''اسے کیا ہوا ہے؟'' سانوری نے پوچھا۔

''بیمار ہے بے چاری' ہفتے بھر سے نظر نہیں آئی تو میں اس کے گھر چلی گئی۔ معدے میں زخم ہو گئے ہیں غریب کے' اوپر سے اب بھیک بھی کوئی نہیں دیتا تو بڑی فاقہ کشی سے زندگی گزرتی ہے اس کی' بس اسی کو دینے لگی تھی یہ پیسے چرا کے۔''

''اری حرام کی جنی...... مجھے بتا دیتی' چوری کیوں کی؟'' سانوری اس پر الٹ پڑی۔

''مجھے معلوم تھا کہ تو اتنی کنجوس مکھی چوس ہے کہ پیسے دینے والی نہیں تھی اسی لیے......'' نغمہ نے بڑی سچائی سے کہا۔

''ہاں جیسے تو' تو بڑی سخاوت کی اولاد ہے سوریا...... بھونکتی رہتی ہے......'' سانوری کو پھر طیش آ گیا۔

''تم دونوں پھر لڑنے لگیں؟ تو یہ بتا' تیری کمائی کہاں جاتی ہے؟ گل چھرے اڑاتی ہو گی؟'' نیلو نے نیا نکتہ اٹھایا۔

''میرے پاس چار بلڈنگز ہیں' وہاں خوب حرامیوں کا ڈیرہ ہے' یہ جولڑ کے کام کرتے ہیں اوپر آفس بوائے اور پیون بولتے ہیں لوگ انہیں' بس انہوں نے میرا رزق چھین لیا۔ آئے دن ہاتھ روموں میں لے جاتے تھے سور کے پلے...... تو ان کے مالکوں کو خبر ہو گئی' رنگے ہاتھوں پکڑی گئی' بس سب کی سب بلڈنگوں میں داخلہ بند ہو گیا۔'' نغمہ نے بڑے غضب کے دکھ اور شرمندگی سے کہا۔

''تو کتیا...... تو یہ کرتی ہی کیوں تھی؟ صرف بھیک مانگتی۔ ایسے لچھن ہوں گے تو' تو ہم سب کا رزق کھوٹا کر دے گی۔''

''تو گھروں میں اور بس اسٹاپوں کی بھکارن ہے۔ دھندہ تو خیر' وہاں بھی مندا ہے مگر یہ دفتروں میں بھیک مانگنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ عزت ہر وقت خطرے میں ڈالنی پڑتی ہے۔''

''چل' زیادہ بک بک نہ کر' تجھے چوری کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اماں سے کہہ دیتی' مجھ سے کہہ دیتی' پر چوری نہ کرتی۔'' نیلو یکدم سنجیدہ ہو چکی تھی۔

''اماں سے کہ تجھ سے' کسی سے بھی مانگتی تو واپس کہاں سے کرتی؟ اسی وجہ سے مجھے یہ چوری زیادہ آسان معلوم ہوئی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ یہ سسری سانوری ایدھی بننے میں لگی ہے' دوسرے کے بچوں کی فیس جمع کرانے کو جوڑتی ہے پیسے۔''

تینوں ایک دم چپ ہو گئیں۔ ریشم اور الماس بھی آ گئیں اور اس رات پانچوں نے جیسے جاگ کے



گزارنے کا فیصلہ کر لیا' سردی کی وجہ سے وہ خوب اچھی طرح رضائیوں میں گھس کے بیٹھ گئیں اور ایک دوسرے پر آڑی ترچھی پڑ کے جیسے داستانِ امیر حمزہ کی منتظر ہوئیں۔

''چلو' سویرے ہم سب باجی نور جہاں کے پاس چلیں گے اور انہیں کچھ پیسے دے دیں گے۔ رگڑ رگڑ کے مرنا تو اب ان کی قسمت ہے پر جو ہم سے بن پڑا' وہ ہم کریں گے۔'' نیلو نے صلح دی۔

''سانوری' تو بچوں سے بڑا لگاؤ رکھتی ہے' کیوں ری؟ یہ ندیم کی فیس بھرنے کی اچھی نوکری پکڑی تو نے؟'' الماس نے کہا۔

''بچے نہیں جانتے کہ ہیجڑا اور مرد کیا ہے' وہ تو بس یہ جانتے ہیں کہ ان سے کون اچھی طرح پیش آتا ہے' بس اسی لیے مجھے بچوں سے بڑا پیار ہے۔'' یہ بات سن کر نغمہ ایک دم سے کھل کھل کر ہنس دی۔

''اری' یہ بات اس نیلو سے پوچھ۔ آج کل کے بچے سب جانتے ہیں' بڑے تیز ہو گئے ہیں کم بخت' ایسے ایک دن نیلو کے پیچھے پورے غول کے غول پڑے کہ کتنی ہی گلیوں میں بے چاری عزت بچاتی پھری' کم بختوں نے تالیاں بجا بجا کے آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ مانو کتوں کی پوری پلٹن تھی جو نیلو کے پیچھے لگی۔ کتنے ہی محلے اس غریب نے ان حرامی بچوں کی وجہ سے بدلے ہیں۔''

''انہیں بس کھیل چاہیے ہوتا ہے۔ ہمارے زمانے میں بے چارے کتے کے گلے میں پتھر بھر کے ایک ڈبہ ٹانگ دیتے تھے پھر پورے محلے میں اسے وہ ہنکاتے کہ بس۔ سچ پوچھو تو گلی کے کتوں نے بھی بچوں سے ہمیشہ پناہ مانگی ہے۔ اب جانے کتے تو بلدیہ کی وجہ سے کچھ کم ہو لیے تو ایک دن انہیں کھیلنے کو میں مل گئی' سسروں نے وہ ناک میں دم کیا کہ بس۔ اس سے تو اماں کے زمانے اچھے تھے جب

ہیجڑوں کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ بچوں کو چپکے چوری اغوا کر کے لے جاتے ہیں اور سسروں کو ہیجڑا بنا دیتے ہیں پر اب نہیں ڈرتے۔ اب تو ان کا بس چلے تو وہ ہمیں اغوا کر کے لے جائیں۔'' نیلو نے کہا۔

''کبھی اماں سے پوچھوں گی کہ کیا یہ بات صحیح ہے؟'' نغمہ نے کہا۔

''صحیح ہو نہ ہو' اب تو ہیجڑے بے حساب پیدا ہو رہے ہیں' سارا شہر بھرا پڑا ہے۔ جدھر دیکھو' ہیجڑے ہی ہیجڑے......''

''دنیا بڑے زوروں سے گناہوں اور سیاہ کاریوں میں ڈوب رہی ہے' تب ہی گھروں میں آئے دن ہیجڑے جنے جا رہے ہیں۔ اس ملک پر خدا کی مار پڑ رہی ہے' پر لوگ اپنے کالے کرتوتوں سے باز نہیں آ رہے۔'' ریشم بولی۔

''پر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ قدرت ان لوگوں کے گناہوں کی سزا ہیجڑا پیدا کر کے کیوں دے رہی ہے؟ ہماری زندگی اجیرن ہو جاتی ہے' وہ تو خوب چین کی نیند سوتے ہیں۔'' الماس بولی۔

''چین کی نیند تو اس مرد کو کبھی نصیب نہیں ہو سکتی جس نے ہیجڑا جنا ہو۔ یہ تو' تو سوچتی ہے' ان سے پوچھ جا کے کہ ان پہ کیا گزرتی ہے؟'' سانوری بولی۔

''جو بھی کہو' قدرت کا انصاف اور سزا دینے کا طریقہ ہے بڑا عجیب' سزا بھلے ہی ہمارے ماں باپ کو دی جاتی ہے مگر زندگی ہماری بھی کسی سزا سے کم نہیں ہے۔'' نغمہ نے بھی جیسے سوچنے کی کوشش کی۔

''اب یہ رائے زنی چھوڑو اور نیلو' آج تو اپنی کہانی سنا۔ ہمیشہ دامن بچا لیتی ہے۔ تو کیسے گھر میں جنمی اور یہ اماں کے قبیلے تک کیسے پہنچی؟'' ریشم نے نیلو کی دکھتی رگ پر پاؤں دھر دیا۔ نیلو ایک دم چونکی اور کمرے میں مدھم روشنی میں اس کا بنا میک اپ کا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چہرہ کسی بھوتنی سے مشابہ معلوم ہوا جب اس کا سارا منہ انجانے فکروا ندوہ سے اٹ گیا۔ کچھ دیر اس طرح خاموشی رہی جیسے سب نیلو کی منتظر ہوں اور اس وقت الماس اور ریشم کی حیرت دیدنی تھی جب نیلو نے اپنی زندگی کی کہانی کا ورق الٹا۔

''ابا محلے کے مدرسے میں استاد تھا۔ غریب بستی تھی۔ مدرسے کے برابر میں دو کمروں کا ایک گھر تھا جہاں میرے ماں باپ اپنے دو بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ میری پیدائش کے بعد وہ جگہ چھن گئی یا ہمیں بے دخل کر دیا گیا۔ آج تم لوگوں نے لوگوں کے گناہوں کی بات کی ہے تو مجھے میرے ماں باپ کے گناہ یاد آ گئے۔ میرا ابا مدرسے میں پڑھایا کرتا تھا اور اماں خود کو ظاہر تو بڑی پیرنی کرتی تھی' لیکن وہ بڑی سخت دنیادار اور موج مستی سے زندگی جینے والی عورت تھی' جانے ابا کو معلوم تھا یا نہیں معلوم تھا' وہ سنیما میں پکچر دیکھنے بھی جایا کرتی تھی۔ دن بھر میرے دونوں بہن بھائی مٹی دھول میں' کیچڑ کھانچوں میں کھیلا کرتے اور اماں سیر سپاٹے کرتی پھرتی۔ کمزور ایمان کی عورتوں سے دس بیس روپے ہتھیانے کو ایک مٹکے میں پانی بھر کے رکھتی اور انہیں بوتلوں میں بھر بھر کے دیتی' انہی پیسوں سے وہ سیر سپاٹے اور بگڑے نفس کی خواہشوں کے اہتمام کرتی۔ اس بات پر ابا اور اماں کے درمیان آئے دن دنگا فساد ہوتا۔

ایک دن ابا اور اماں میں خوب زوروں کا رن پڑا۔ ابا مدرسے گیا تو وقتِ مقررہ سے پہلے لوٹ آیا۔ اماں ایک قصائی کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی۔ بظاہر ابا نے یہ بات چھپا لینے کو ہلہ اس طرح سے نہیں مچایا کہ آواز باہر جاتی مگر اس نے اماں کی خوب دھڑنتی لگائی پھر بھی پاس پڑوس کے لوگوں کو خبر ہو گئی۔ لوگوں نے اور اُن کی عورتوں نے معاملہ رفع دفعہ کرانے میں کافی محنت کی۔ ابا بے بسی سے بس یہ کہتا رہا کہ یہ عورت رحمٰن کے گھر میں شیطان ہے اور اسے شوہر اور بچوں کا کوئی خیال نہیں۔ یہ قصہ تمام ہوا' دونوں چند ہی دنوں میں پھر بے شرمی سے ساتھ رہنے لگے۔ اماں نے اپنے چھن نہیں بدلے اور جس روز ابا مدرسے سے اس طرح نکالا گیا کہ کافی پبلک جمع ہو گئی۔ ابا کی خوب دھلائی ہوئی تو سمجھو دونوں برابر ہو گئے۔ اب یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ دونوں میں سے کون بڑا شیطان ہے؟''

''ہائے دیا...... ابا کو مدرسے سے کیوں نکالا؟'' نغمہ نے لقمہ دیا۔

''بولتی بہت ہے' چپ کر کے سن' سب بتاتی ہوں۔'' نیلو نے اپنی گفتگو اور بیان کو بریک کرنے پر نغمہ کے ایک چپت رسید کی۔

''نکالا یوں گیا کہ ابا جانے کب سے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ بدفعلیاں کر رہا تھا اور ایک دن اس کی نیت ایک بچی پر خراب ہو گئی' بچی نے اپنے گھر جا کے یہ سب بات اپنی ماں کو بتا دی' بس پھر کیا تھا' ابا نے بہتیرا کہا کہ یہ اس پر الزام ہے اور بچی کے ساتھ یہ کام کسی اور نے کیا ہے مگر محلے کے ایک پڑھے لکھے صاحب دونوں کو ہسپتال لے گئے' وہاں جا کے ابا کو یقین ہو گیا کہ اب ان کے جھوٹ کا پول کھل جائے گا' اب تو ابا نے بڑی معافیاں مانگیں مگر معافیاں دینے والی بات تھی ہی نہیں' سو مدرسے سے نوکری گئی۔ جگہ چھوٹی اور بدنامی ایسی ملی کہ جینے کو جگہ نہ بچی۔ اب اماں اپنے ہتھیار لے کر میدان میں اتریں۔ ابا دنیا سے نظریں نہیں ملا سکا۔ وہ اماں جیسی چنڈالنی سے کیا کہتا' کیسے سامنا کرتا۔ اماں نے فی الفور ابا کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا اور جواز بتایا کہ اس کے اپنے بچے بھی اس شیطان کی ہوس کا نشانہ بن سکتے ہیں' سو ابا بری طرح پھنس چکا تھا اور وہ ہار اماں اور اس کے دونوں بچوں کو چھوڑ کے چلا گیا۔ اماں تو جیسے بڑی ستی ساوتری تھی' پوری رنڈی تھی حرام کی جنی...... اس کے پیٹ میں پہلے ہی گناہ کا بیج پل رہا تھا' وہ یہ بات جانتی تھی مگر اس نے ابا کو نہیں بتایا اور جب اماں کے ایک یار نے اسے رہنے کو ٹھکانہ دے دیا تو وہ سمجھو' پوری طرح رکھیل بن گئی......'' کمرے میں بڑے زوروں کی خاموشی اور سناٹا برس رہا تھا۔ چاروں خواجہ سرا دم سادھے' سانسیں روکے نیلو کی یہ لرزہ خیز داستان سننے میں منہمک تھے اور رات دھیرے دھیرے اپنے سفر پر رواں دواں تھی۔

''اور پھر جب وقت پورا ہوا تو اماں تیسری بار ماں بن گئی اور پیدا ہوئی تمہاری یہ نیلو......''

''مبارک ہو نیلو......'' نغمہ نے بڑی سادگی سے کہا تو نیلو اس پر الٹ پڑی۔

''چپ کر چھنال...... مبارک باد دے اپنے جسم کو جو تجھے اب تک بیاہنے نہیں آیا' چھمک چھلو......'' نیلو نے بڑے زور کی تالی بجائی تو کمرے میں ارتعاش پیدا ہوا اور سب ہونق بنے اسے دیکھنے لگے۔ نیلو کا لہجہ ایسا خونخوار تھا کہ نغمہ بھی پوری طرح سہم گئی۔

''بہت ہی بک بک کرتی ہے' چل نیلو' تو اپنی بات پوری کر۔'' ریشم نے معاملہ رفع دفع کر کے بات آگے بڑھائی۔

''میں جنمی تو اماں نے یہ دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ میں لڑکا ہوں یا لڑکی؟ ہیجڑا تو یوں بھی کسی کے دماغ میں نہیں آتا اور یوں مجھے پوٹلی سی بنا کر وہ ایک سنسان سی گلی کے کونے میں چھوڑ آئی۔ اگلے دن اس نے محلے والوں سے کہہ دیا کہ بچہ مرا ہوا پیدا ہوا تھا' رات ہی کو دفنا دیا اور مجھے پالا ایک اکیلے فقیر نے جو اس رات وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس نے نہ صرف مجھے وہاں سے اٹھایا بلکہ اماں کا پیچھا کر کے لوگوں سے سب حالات پتا کر لیے۔ فقیر بوری والا نے مجھے پالا اور کچھ ہی دنوں بعد اپنی بوری کے ایک کنارے پر مجھے بھی لٹا لیا یوں اس کی ملنے والی بھیک میں اضافہ ہو گیا اور میرے جیون کی جوت جلنے لگی۔ کچھ ہی سالوں میں فقیر بوری والا کو معلوم ہو گیا کہ میں ہیجڑا ہوں' اب وہ مجھ سے بھیک مانگنے' اپنے ہاتھوں' پیروں کی تھکن اتروانے' مالش کروانے اور اپنی ان دیکھی خواہشوں کو پورا کرنے کا گھناؤنا کام کروانے لگا۔ سمجھو' اس کی زندگی اب موج سے گزرنے لگی۔ میں دن رات اللہ سے یہ دُعا مانگا کرتی کہ اس حرامی کو جلدی موت مت دینا۔ تم سب سوچو گی کہ مجھے تو اس کی موت کی دُعائیں مانگنا چاہیے تھی اور میں اس کی زندگی کی دُعائیں مانگ رہی تھی؟ اصل میں' میں اسے بے بسی سے مرتے دیکھنا چاہتی تھی' جانے میری زندگی کہیں بھی ہوتی تو ایسی ہی دوزخ ہوتی پھر بھی میں سمجھتی ہوں' میرے ماں باپ دنیا کے بدترین انسان تھے اور اس سے زیادہ حرامی یہ فقیر تھا۔ شکر خدا کا' میں لڑکی نہ پیدا ہوا ورنہ یہ بوری والا فقیر میری بوٹیاں نوچ نوچ کے خود بھی کھاتا اور دوسروں کو بھی کھلاتا۔ قدرت نے اگر کوئی انصاف کیا تو وہ یہی ہے ورنہ سوچو' لڑکی ہوتی تو کیا گت بن رہی ہوتی اس بے چاری کی۔'' پھر خاموشی چھا گئی۔ سب یہ جاننے کو بے چین تھے کہ پھر نیلو بوری والا سے نکل کر اپنے قبیلے تک کیسے پہنچی؟

''بس ایک دن اماں' اپنی ٹولی کے ساتھ گزر رہی تھی۔ میں ہوٹل سے روٹی لینے کو جاتا تھا' یوں سمجھو جیسے مچھلی کو پانی نظر آ گیا' میں نے اس میں چھلانگ لگا دی اور اماں کے ساتھ قافلے میں شامل ہو کر یہاں تک پہنچ گئی۔ بوری والا' میری ماں اور میرا باپ اب بھی زندہ ہیں اور مجھے یقین ہے' وہ ایسی عبرت ناک





Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حالت میں ہوں گے کہ خدا کی مار ہو ان جیسوں پر......'' اتنا کہہ کر نیلو چپ ہوگئی اور کچھ توقف کے بعد بولی۔ ''میں تم لوگوں کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

نیلو کو کچن میں خاصی دیر ہوگئی تو الماس نے جا کر دیکھا' نیلو بلک بلک کر ہچکی سسکیوں میں رو رہی تھی۔ الماس نے اسے گلے لگایا تو وہ پھوٹ پڑی۔ پل کے پل میں یہ دلدوز منظر سارے خواجہ سراؤں کی چونچالوں اور سرمستیوں سے سیراب ہوا اور اسی ماحول میں جب نغمہ نے یہ کہا کہ میں ایک پولیس والے کے گھر میں پیدا ہوئی تو جیسے ماحول میں لامتناہی خوف در آیا۔

''اوئی اللہ......! پولیس......''

''ہاں' پولیس اور وہ بھی خوب رج کے رشوت خور اور بڑھک باز...... انور محمود نام ہے اس کا۔''

''اب بھی ملتا ہے تجھے؟'' سانوری بولی۔

''نہیں' اب میری پہنچ نہیں اس تک' کہیں پولیس لائن کے کوارٹر میں بڑا افسر بن کے بیٹھتا ہے۔ میں ایک دن یونہی یادوں کی جوت جگانے کو وہاں جا گھسی تھی تو وہاں لوگوں نے بتایا کہ جب میرے باپ کو یہ خبر ہوئی تھی تو کم بخت حرامی نے اپنے علاقے کے تھانے دار سے میری تفتیش کرائی' تھانے دار نے مجھے تھانے بلایا اور خوب ڈرایا دھمکایا' بار بار مجھ سے پوچھتا تھا کہ میں اس افسر کا کون ہوں؟ مارے غصے اور جوش میں میں نے اپنا رشتہ بتا دیا۔ وہ خوب دیر تک جانے کیا کیا سوچتا رہا پھر اس نے رات بھر میری بوٹیاں نوچیں اور عزت کی دھجیاں اڑا کے' ڈرا دھمکا کے واپس بھیج دیا۔ اس کم ذات کی میرے باپ سے کوئی دشمنی تھی' اس کمزور آدمی نے اس دشمنی کی آگ مجھ سے بجھائی اور اپنی مردانگی کو تسکین پہنچائی۔ بڑے عجیب ہیں اس دنیا کے لوگ'

خیر' میں جب پیدا ہوئی تو میری ماں نے مجھے نرس میرے باپ کو ایک الگ کونے میں لے کان میں یہ خبر سنائی کیونکہ پیدائش کے وقت میری حقیقت کھل گئی تھی۔ میرے باپ کو پہلے ہی نہیں آیا کہ ایک پولیس والے کے گھر خسرہ کیسے جنم لے سکتا ہے؟ اس کو لگا کہ ایک اور مرد پولیس والے کو قدرت نے بیچ سڑک کر دیا ہو' سو فوری طور پر میرے باپ نے مجھے ایسی عورت کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا جس اُس وقت میرے باپ کے تھانے میں قید یوں میں نے دنیا میں آتے ہی یہ ایک نیک کیا کہ اس لڑکے کو میری وجہ سے رہائی مل گئی بھی وہ بہت ہی شریف لڑکا تھا' تنویر نام تھا اس کی ماں حمیدہ خاتون نے مجھے خوشی سے نہیں بے دلی سے پالا۔ میرے باپ نے کبھی میری لی مگر شروع میں وہ عورت پولیس لائن میرے باپ کے گھر جایا کرتی تھی۔ وہاں میرا مجھے دیکھ کر اداس ہو جاتی۔ آخر جب میں پانچ کا تھا تو میری پرورش کرنے والی ماں سے باپ نے یہ کہا کہ اب اس بچے یعنی مجھے وہ آیا کرے۔ اس نے میرا نام مجید رکھا تھا کیو میری زبان خوب چلنے لگی تھی اور پولیس والے کہ کہیں اس کا بھید کبھی کھل گیا تو میرے بہن بھائیوں پر برا اثر ہوگا اور یوں حمیدہ خا قدرت سے ملی ہوئی ہوشیاری کی وجہ سے باپ سے محض اس لیے تعلقات بنا کے رکھنا چا کہ وہ پولیس والا تھا اور مستقبل قریب میں ا بیٹے تنویر کے ساتھ اگر پھر کوئی ایسا واقعہ پیش انہیں میرے باپ سے تعلقات کی وجہ سے خواری اور اذیت نہ جھیلنا پڑے گی تو خاطر ہوئیں اور دل مسوس کے لوٹیں پھر بھی



کی پھر ایک بیٹے کی رہائی کے بدلے میں جو ال لیا تھا' یہ کافی مہنگا سودا تھا لہٰذا انہوں نے میرے باپ کو خط لکھا کہ کیا وہ مجھے کسی یتیم ہیجڑوں کی ٹولیوں کے حوالے کر سکتی ہیں۔ یں اور کسی نامعلوم خوف کی وجہ سے میرے لے وہ خط پھاڑ دیا تھا۔ اری' تو جانے' ان میں موبائل تو ہوتے نہیں تھے' سو اس خط وہ ایڈریس بھی پھٹ گیا جہاں تنویر کی ماں تھی اور عالی شان' رعب دبدبے کا مارا انور ہیجڑے بیٹے سے ملنے تو آنے سے رہا' سو خاتون کو بڑی کوفت ہوئی کہ ایک مدت تک جواب نہ ملا اور ایک دن وہ اپنے بیٹے تنویر سے ہی تھی کہ ''اسے نوکر بنا کے رکھنا بھی مشکل ہے' لوگ جانے کیا کیا تماشہ بنائیں گے۔ تم اس محلے سے نکلو اور دوسرے محلے میں چل رہو۔ وہاں اسے ہیجڑوں کے حوالے کر دیں یں تو کیا زندگی بھر چھاتی پر مونگ دلوائیں یں بھی اسکا باپ کوئی خرچہ پانی تو بھیجتا نہیں۔ اور نے ہیجڑا پیدا کیا پھر بھی ایسے گھمنڈ سے کرتا ہے جیسے اس سے بڑا کوئی مرد ہی نہیں۔''

''اماں...... ! پولیس والوں کے لیے کسی کا بھی نکالنا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔'' تنویر نے کہا تو ماں کے ارادے سے اس لمحے تو ٹھنڈے پڑ سوچ بچار کے بعد بولی۔ ''جو پتا پڑ بھی گیا تو یں گے' کہیں بھاگ گیا' ہیجڑے اٹھا لے گئے تو لگتا ہے' وہ کبھی بھی پوچھنے نہیں آئے گا۔ تو کوئی خبر لی نہیں اس نے۔'' حمیدہ خاتون وسوسوں میں تھیں مگر ساتھ ہی اس قسم کے عمل بھی کرنا چاہتی تھیں اور غریب کر نہیں پا یں۔ بہر حال حمیدہ خاتون نے ڈرڈراتے بے پر عمل کر لیا۔ اس وقت میری عمر قریب

دس تو ضرور رہی ہوگی۔ ایک دفعہ محلے کی ایک لڑکی کی سالگرہ میں ناچی تھی میں۔ اری' نہ پوچھ' کیسا مزہ آیا' تب ایک گھڑی کو دل بھر آیا تھا۔ جانے ہماری سالگرہ اور وہ موا بر تھ ڈے کیوں نہیں ہوتا نہ ہی کوئی یاد رکھتا ہے نہ ہی کسی نے کبھی بھی یاد رکھنا چاہا' بس یوں ہی اوروں کی سالگراہوں میں ناچ ناچ کے خوش ہو لیے۔''

''چل نگوڑی' بلاوجہ دل خراب کرتی ہے۔ اری' ہماری تو شادیاں بھی نہیں ہوتیں۔ اوروں کی ہوتی ہیں تو کیا اس پر ماتم کریں؟'' جھٹ سے سانوری بولی۔

''شادی نہیں ہوتی' نہ ہو۔ وہ تو ہو بھی نہیں سکتی پر سالگرہ تو ہو سکتی ہے؟'' نغمہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''اور یہ کس نے کہا کہ ہماری شادی نہیں ہو سکتی؟ میں تو تم سب کو شادی کر کے دکھاؤں گی' ہاں۔'' ریشم کا یہ سب سے چُچی ٹاپک تھا۔ وہ کب چپ رہنے والی تھی۔

''جو تم سب اسی طرح بیچ بیچ میں بولتی رہیں تو آج نغمہ کی کہانی ختم نہیں ہوگی۔ اوری مرد جلی' تو بتا' شادی کیا بنا نکاح کے ہو سکتی ہے؟ تیرا نکاح کون پڑھائے گا؟ بکواسی نہ ہو تو۔'' الماس نے جل کے کہا۔

''چل ری نغمہ' تو اپنی بکھان شروع کر۔ یہ کتیائیں تو اسی طرح بھونکتی رہیں گی۔'' سانوری سے رہا نہ گیا۔

''کتیا کس کو بولا؟'' ریشم نے ایک زور کا طمانچہ سانوری کے سیدھا منہ پر دے مارا۔ لو جی پھر کیا تھا' چپ چپاتے دنیا جہان کی سنجیدگی سمیٹ کر جو چوپال قصے کہانیوں کے لیے بجی تھی' اس میں یدھ شروع ہو گیا اور یہ جاننا تک دشوار ہو گیا کہ کون' کس کا دشمن ہے؟



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عجب بھوتنیوں کی طرح لڑے سب کے سب اور تھوڑی دیر میں پوری نزاکت کے ساتھ ہانپا کیے۔ جب اوسان بحال ہوئے تو نغمہ بولی۔

''اس محلے میں پہلے سے ایک جمال نام کا خواجہ سرا ایک چھوٹی سی کھولی میں براجے تھا۔ حمیدہ خاتون اور تنویر کو یہ بات شروع شروع میں معلوم نہ تھی' سو میری بڑھتی ہوئی عمر کا سب سے پہلا رنگین منظر یہی تھا کہ میں نے چھپ چھپ کے تنویر کو نہاتے اور کپڑے بدلتے دیکھا۔ بس پھر یہ منظر مجھے سمجھو کہ بڑی بھاری لطافت دینے لگا۔ میری تربیت ہی کب تھی جو شیطانی جذبے اٹھتے تھے' ان کی تسکین ہو رہی تھی ورنہ اماں کی نگرانی میں ایسی اوچھی اور اتری حرکتیں بھلا کیونکر کرتی میں؟ ایک دن حمیدہ خاتون نے مجھے دیکھ لیا اور سمجھ گئیں کہ ان کے گھر میں کس ڈرامے کی شروعات ہونے جا رہی ہیں۔ خوب مار لگائی' لال پیلا کر دیا۔ جمال خواجہ سرا جانو' ایسے کسی موقع کی تلاش میں ہی تھا۔ میں رونے گھگھیانے کو باہر نکلی۔ سمجھو' حمیدہ خاتون نے دروازے سے دھکا دیا۔ قدرت کے بھید نرالے۔ جمال خسرہ اس وقت اس گلی سے گزر رہا تھا' بس آناً فاناً مجھے اپنی کھولی میں لے گیا۔ حمیدہ خاتون جانے کچھ دن پریشان رہی ہوں' مجھے نہیں معلوم کیونکہ اسی رات جمال مجھے لے کر اس محلے سے چل پڑا تھا۔ وہ اپنی پرانی موٹی بھینس روبینہ باجی کے گھر لے آیا اور مجھے اس کے گھر چھوڑ کے فی الفور واپس ہو لیا تاکہ اس پر کسی کو شک نہ ہو۔ یوں سمجھو کہ یہ جمال آپا جسے روبینہ نے بڑے تپاک سے جمال بانو کہا تھا' حمیدہ خاتون کی طرح بلاوجہ ہی پریشان ہوا۔ کبھی مجھ جیسے میرے پولیس والے باپ نے پلٹ کر نہیں پوچھا۔ ویسے ہی حمیدہ خاتون کے سر سے بھی بلا ٹلی۔ اب جمال آپا ہر ہفتے پابندی سے روبینہ موٹی سے میری خیر خیریت اور اپنے حصے کے پیسے لینے آیا کرتی تھی کیونکہ مہینے بھر میں روبینہ باجی نے مجھے دھندے پر بٹھا دیا تھا۔ پر تم تو جانو ہو' ہمارے ہاں اس ڈر سے معصوم اور کم سن خسروں کو روڈ پر اور فقیروں کی طرح مانگنے کے دھندے میں نہیں لایا جاتا کہ ڈر ہے کہ کہیں یہ نہ کوئی سمجھ لے کہ بچہ اغوا کیا ہوا ہے۔ سچ پوچھو تو ہمارا نام خواجہ سرا نہیں بلکہ ڈر ہونا چاہیے تھا۔ ہر طرف ڈر ہی ڈر ہے حالانکہ کوئی نہیں پوچھنے والا کہ بچہ کس کا ہے؟ یہ چونچلے تو ان کے ہیں جو بچے بڑے ہو کر مرد بنتے ہیں۔ یوں پولیس والے جی دار مرد کا نطفہ حمیدہ خاتون سے جمال بانو اور جمال بانو سے روبینہ موٹی تک پہنچا' وہاں سے اماں کے قبیلے میں داخل ہو گیا اور مل گئی نصیب سے تمہاری ٹولی۔ نہ کبھی پولیس والے نے خبر لی۔ ساری زندگی بس میرے تصور سے ڈرتا رہا۔ نہ حمیدہ خاتون لوٹیں۔ وہ پولیس والے انور سے اور میری واپسی دونوں سے ڈرتی رہیں نہ پولیس والے کی واپسی ہوئی نہ میری' بس ایک ڈر ہے جو سب کے بیچ میں پھانسی کا پھندہ بن کے لٹکتا رہا۔''

نغمہ کی طولانی داستان کا آخری لفظ سمجھو' اس رات جیسے ادا ہو گیا۔

''ایک بات تو بتا نغمہ' تو روبینہ باجی کو اس کے منہ پر بھی روبینہ موٹی کہا کرتی تھی؟'' نیلو نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''چل باؤلی...... بھلا خسروں میں ایسی بدتہذیبی کہاں۔ جان سے مار ڈالتی وہ موٹی' بس روبینہ جی کہوں تھی۔'' نغمہ نے ہاتھ نچا کے ایک ہلکی سی تھپ نیلو کے گال پر لگائی۔

''تو یہ بول نا کہ تجھے بھی ڈر نے پکڑ رکھا تھا؟'' الماس بولی اور پھر سب ایک دوسرے کو چپ چاپ دیکھا کیں اور سب کی سب ایک دوسرے کو ہاتھ مار مار کے خوب ہنسیں۔



''چل ری سانوری...... اب تو بھی بک دے جو بیتی۔ نہیں تو صبح تیرے پیٹ میں بڑے ...وں کا درد اٹھے گا۔'' نغمہ نے کہا۔

''آج یہ راز بھی کھول ہی دے کہ اس رات تو ... چڑھ کے اس کی عزت سے کھیلنے کا ناٹک ...ں کرے تھا؟'' الماس نے بہت دن سے دل ...دبی بات کہہ ڈالی۔

''میں تم سب کی طرح ہیجڑا پیدا نہیں ہوا۔ مجھے ...ا بنایا گیا ہے۔'' سانوری نے زبان کھولی تو پہلے ...جملے پر سب کی چیخیں نکل گئیں۔ ''ہائے...... ...وہ کیسے؟''

''ابا سے ایک غلطی ہو گئی۔ اس کی لڑائی بازار ...ں ایک قصائی سے اتنی بڑھی کہ سمجھو دونوں ایک ...رے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ ابا کی پرچون ...ی بھری پری دکان تھی حیدرآباد کی بڑی مصروف ...ارکیٹ میں۔ محبوب نام تھا میرے باپ کا۔ اس کی ...اللہ داد قصائی سے ان بن ہو گئی' خوب ہاتھا پائی ہوئی' ...ا بازار امڈ آیا اور یوں بڑے زوروں کا مجمع لگا۔ ...س تھانے تک بات پہنچی۔ ایک ہفتے تک تو دونوں ...ئیں بند رہیں پھر ایک ایسی کشیدہ صورت حال ...ں دکانیں کھل گئیں' بازار دو حصوں میں بٹ گیا' ...ارے قصائی ایک طرف اور باقی دکاندار ایک ...طرف۔ کچھ لگائی بجھائی کرنے والے دونوں طرف ...ی آگ کو کبھی ٹھنڈا نہ پڑنے دیتے اور دکانداری ...سے زیادہ ایک دوسرے کے بخیے ادھیڑنے کا ...دھار زیادہ ہوتا۔ گاہک بے چارے تماشہ دیکھتے ...ں کو پانچ منٹ میں سودا لے کر دکان سے ہٹ جانا ...تھا' وہ آدھا آدھا گھنٹہ کھڑا یہ تو تکار اور بحث ...کیا کرتا۔ جب میں پانچ سال کا تھا' تب سے بھی ...ابا مجھے دکان لے جایا کرتا تھا۔ میرا نام سلمان ...ابا مجھ سے اتنی محبت کرتا تھا کہ ساری مارکیٹ کو

## سوچ کے سارے در بند ہیں

اب نہ تیرا خیال ہے
نہ تیری یاد ہے
غمِ دوراں میں الجھی ہے کچھ اس طرح زندگی
نہ پہلے سے جذبات ہیں
نہ وہ پہلی سی بات ہے
خاموشی میں ڈوبے ہوئے
لفظ سارے زہر خند ہیں
سوچ کے سارے در بند ہیں

روحان دانش...... کراچی

یہ بات معلوم تھی۔ سمجھو' ابا کی جان مجھ میں قید تھی۔ پوری تین بہنوں کے بعد پیدا ہوا تھا میں۔ اللہ داد کو بھی یہ بات معلوم تھی۔ لڑائی کے واقعے کو ایک سال بیت گیا اور کسی حد تک دشمنی کی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ ابا بھی اپنی کاروباری مصروفیات میں سب کچھ وقتی طور پر بھول گیا۔''

''اری...... یہ تو بتا' یہ اتنی بڑی لڑائی ہوئی کیسے تھی؟'' نیلو نے اسے ٹوکا۔

''ابا روزانہ دو کلو گوشت اللہ داد قصائی سے منگایا کرتا تھا۔ ایک دن اماں نے یونہی کہہ دیا کہ گوشت دو کلو نہیں لگتا۔ ابا سن کے چونکا اور اگلے دن ابا نے وہ گوشت اپنی ترازو میں تول لیا' پورا آدھا پاؤ کم نکلا۔ اللہ داد بولا کہ بس اُسی دن ایسا ہوا مگر ابا کہے تھا کہ یہ ہمیشہ سے کم تول رہا ہے' اس کی بھری دکان میں جب ابا نے یہ احتجاج کیا تو اللہ داد کی گاہکی خراب



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہونے لگی۔ سارے گاہک اپنا اپنا گوشت دوسری جگہوں پر تلوانے لگے' سب کا ہی کم نکلا۔ ابا نے سمجھو' اللہ داد کی قسمت کھوٹی کردی تھی۔ جواب میں اللہ داد نے بھی ابا پر دو نمبر مال رکھنے کا الزام لگایا اور یوں یہ تو تکار آدھا کلو گوشت سے ہوکر ساری زندگی خاندانوں اور پورے بازار میں پھیل گئی۔ اللہ داد پولیس والوں کو مفت گوشت بھیجا کرتا تھا لہٰذا انہوں نے بات رفع دفع کرنے میں اسی کا ساتھ دیا' بس پھر یہ دشمنی سمجھو' کبھی ختم نہیں ہوئی۔ ایک دن میں اسکول سے واپس آ کر کوئی چیز لینے گھر سے نکلا' ٹھیک دوپہری تھی' سارا علاقہ سنسان پڑا تھا۔ اللہ داد جانے اس موقع کی تلاش میں منصوبہ بندی سے تاک میں تھا یا یہ حادثہ تھا' اتفاق تھا۔ وہ دوپہر میں ضروریات سے فارغ ہونے اور کھانا کھانے اپنے گھر آیا کرتا تھا۔ بس اس کی جو مجھ پہ نظر پڑی' دشمنی جاگ اٹھی۔ مجھے اٹھا لے گیا' ویران رستوں سے ہوتا ہوا وہ مجھے ایک ہیجڑے کے گھر لے گیا اور جلدی جلدی اسے جانے کیا سمجھایا کہ کوئی دس پندرہ منٹ بعد میں کراچی والی بس میں بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے ڈرا دھمکا اور چیزیں کھلا کھلا کے چپ کرا لیا گیا پھر یہاں کراچی لایا گیا اور اماں کے سامنے ان کی موجودگی میں ہیجڑا بنایا گیا مجھے۔ کتنے ہی دنوں تک میرا زخم ٹھیک نہیں ہوا اور جب ٹھیک ہوا تو میں اماں کے لیے اس کی سانوری بن چکی تھی.....''

''کیوں بکواس کرتی ہے حرافہ.....؟ اماں ایسی ظالم تو نہیں ہیں۔ وہ تو بڑی مہربان ہیں۔'' الماس نے غصے سے کہا۔

''اس وقت اماں کی جوانی کا چراغ بجھ رہا تھا اور انہیں میری ضرورت تھی پھر جس طرح مجھے لانے والے چھیمو خسرے نے اماں کو جھوٹی کہانی سنائی تو اماں نے یہ ظلم ہوتے گوارہ کرلیا۔''

''کیا کہانی سنائی جھوٹی پرکالا؟'' اب ریشم بھڑکی۔

''اس نے کہا تھا کہ میری ماں چاہتی ہے کہ میری یہ شناخت بدل دی جائے کیونکہ میرا سوتیلا باپ میرے خون کا پیاسا ہے اور جو میں اپنے سوتیلے باپ کے ہاتھ لگ گیا تو وہ مجھے مار ڈالے گا اس لیے میری جان بچانے کا یہی ایک راستہ ہے کہ مجھے ہیجڑا بنا کے میری پہچان بدل دی جائے اور مجھے جیون دان دے دیا جائے اور اس طرح اماں' چھیمو خسرے کی باتوں میں آ گئیں' یوں مجھ سے میری مردانگی چھین لی گئی.....'' وہ کچھ دیر یاسیت سے چپ رہی پھر بولی۔

''کبھی کبھی میرے اندر کا مرد جاگ اٹھتا ہے۔ اس رات میں ریشم کی چھاتی پر اسی وحشت میں سوار ہوا مگر بے بسی سے گر پڑا.....'' اور پھر آناً فاناً سانوری عین سلمان کی شکل میں پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔ سب اس کے دکھ کو محسوس کرنے لگے اور ماحول جیسے اس درجے ملول اور سوگوار ہوگیا کہ اب وہاں کبھی کوئی قہقہہ' کوئی ہنسی کی آواز نہ گونجے گی۔ نغمہ نے خاموشی سے اٹھ کر کچھ دیر بعد بے چارگی سے جلتے بلب کو بجھا دیا اور پھر سارے گھر میں بدہیئت سسکاریاں ماتم کناں ہوگئیں۔ جانے یہ رات کبھی ختم ہوئی کہ نہیں' اندھیرا سب کچھ نگل گیا۔

صبح ہوتے سب نے دیکھی مگر کچھ اماوس ایسے ہوتے ہیں جو ہزاروں برس سے اپنے چاند کے انتظار میں سیاہی سے سر پھوڑتے رہتے ہیں مگر نہ چاند نکلتا ہے نہ اجالا ہوتا ہے اور نہ رات ختم ہوتی ہے جیسے سانوری..... اور جیسے..... بھلا ناموں کی کنی سے کہانیوں کا انت ہوسکتا ہے؟ دور کہیں کویلیا بلبلا کی مگر خشک پانیوں میں ہلچل نہ مچی۔ کچھ موسم ایسے بھی ہوتے ہیں اور کچھ چہرے بے شناخت' اپنی اصل سے بچھڑے ہوئے' اَن کہی داستانوں کی طرح.....



ایڈیسن ادریس مسیح

# لاجو دیدی

شگفتہ شفیق کا خیال

میں نے رسمِ وفا نبھائی ہے
یہ مری عمر کی کمائی ہے

**اس عجیب عورت کی کہانی جس نے عشق کے ہاتھوں زیست کی جہنم کاٹی تھی**

مجھے لاجو دیدی بہت پسند تھیں اور یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت تھی کہ میں نے اپنی ساری زندگی میں لاجو دیدی سے زیادہ ڈھیٹ عورت کبھی نہیں دیکھی۔ عجیب عورت تھی بالکل مٹی کا مادھو..... ساس پو پلا منہ بھر بھر کر گالیاں بکا کرتی' نندیں الگ بے عزتی کرتی رہتیں' شوہر کے تو جوتے ہی اس کے سر پر ٹوٹتے تھے مگر مجال ہے' اف بھی کر جائیں۔ جب دیکھو' سر جھکائے' کبھی لمبا جھاڑو پکڑے دہلیز دھو رہی ہیں' کبھی

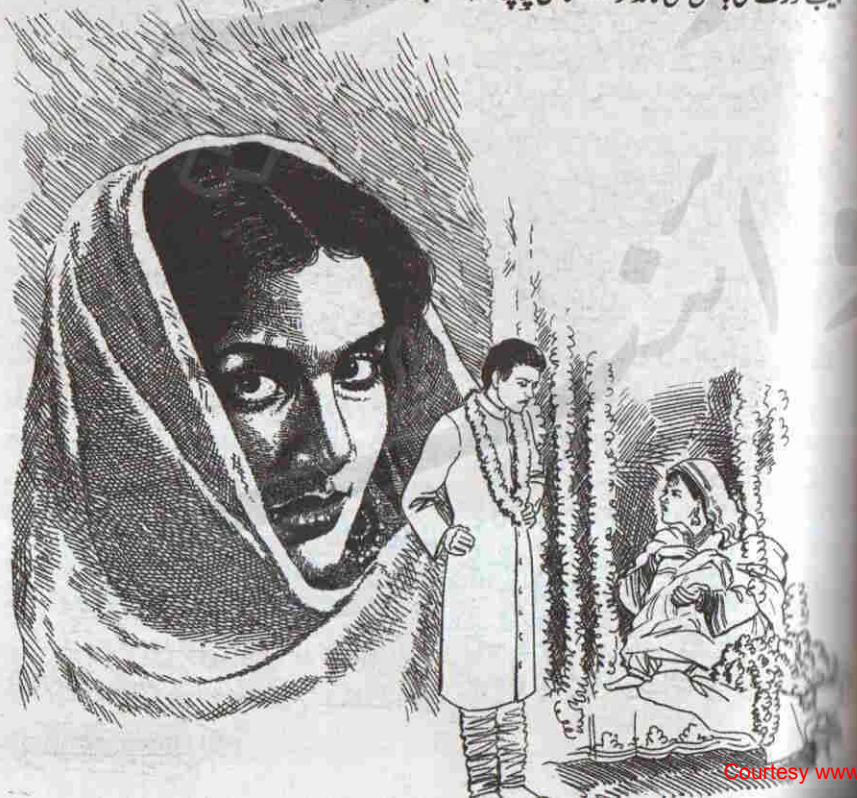

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھت پر کپڑے دھودھو پھیلاتیں، ابھی لال مرچیں سکھا رہی ہیں، ابھی چاول چُن رہی ہیں، دال گھوٹ رہی ہیں۔ میں جب بھی گزرا کرتا، چوپٹ کھلے دروازے سے کچھ نہ کچھ کرتی ہی نظر آتیں۔ ایک کمرے کا تو گھر تھا جس کے سرخ فرش کو گلنگے، کتھے کی گلکاریاں مزید رنگ گئی تھیں کونوں پر سے۔

لاجونتی دیدی سے مجھے کوئی خاص ہمدردی تھی۔ تائی اماں کہتی ہیں کہ میں نے ان کے بچوں کو بدتمیزی سکھائی ہے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں دیدی کو بھی تھوڑی سی بدتمیزی، کم از کم غلیل سے کنکر مارنا تو سکھا ہی دوں تاکہ جب بھی اُس کی کالی بھینس جیسی ساس گلی میں کھڑی سبزی خریدے تو وہ دروازے کے پیچھے چھپ کر اس کے موٹے ننگے پیٹ پر ایک روڑا ہی کھینچ ماریں، پیٹ کا مٹکا پھوٹے، تھوڑی دبلی ہوں تو ذرا اٹل کر پانی وانی ہی پیا لاکریں۔ ہم دن بھر سنتے، لاجو دیدی کو پکار پڑتی رہتی تھی یا پھر لعنت پھٹکار......

میری اماں کہا کرتی تھیں۔ وہ لوگ ہندو ہیں، ان کے یہاں نہیں جایا کرتے۔ وہ چھوٹے بچوں کو کاٹ کر بھگوان کو بلی چڑھاتے ہیں۔ شروع شروع میں، میں ڈر گیا تھا، جھٹ میرے ذہن میں کالے پتھر کی بنی مورتی در آتی جس کی لمبی زبان سے خون ٹپک رہا ہوتا اور آنکھیں وحشت سے ابلی پڑتیں۔ رفتہ رفتہ یہ تصور بھی زائل ہوتا گیا اور میں نے اماں کی بات کو اہمیت دینا چھوڑ دیا کہ ایسا کہاں ہوتا ہے بھلا اور اگر ایسا ہوتا تو بھلا حیدر چاچو روز اوپر منڈیر پر باز ور کھے لاجو دیدی کی سب سے چھوٹی نند سرلا سے کیوں باتیں کرتے رہتے اور میں بیسنی روٹی کھاتے چھت کی سیڑھیوں پر بیٹھا کرتا تھا۔ اس کی چوکیداری کے بدلے میں مجھے بھی ایک روٹی اور کبھی پاپڑ ملا کرتے تھے۔

لاجو دیدی بیسنی روٹیاں اور پاپڑ بنایا کرتی تھیں۔ ہفتے میں دو مرتبہ سائیکل پر ایک کانے انکل آیا کرتے تھے اور یہ مال تھیلیاں بھر بھر لے جایا کرتے۔ اس دن لاجو دیدی کے گھر سے کھانے کی اشتہا بھری خوشبو آیا کرتی تھی۔ اس دن ان کے گھر سے لاجو دیدی کو پکارتی غصے بھری آوازیں بھی ذرا کم ہی آتیں۔

لاجو دیدی کا لمبا سا قد تھا، مردوں جیسا وہ اکثر گلابی رنگ کی کاٹن کی ساڑھی باندھا کرتیں اور کانوں میں موتیے کی کلیاں، اُن کی سانولی رنگت، سرمئی آنکھیں عجیب غم انگیز سا تاثر دیتی تھیں لیکن جس دن ذرا وہ کاجل، سرمہ لگا کر دنداسہ ملتیں تو بس آنکھیں لو دینے لگتیں، گمان گزرتا، لاجو دیدی کی کوئی بہن آ ٹھہری ہیں ان کے ہاں، اُن کی آواز بھی بہت خوبصورت تھی، میٹھی میٹھی کوملتا کا سندر احساس لیے۔ صبح صبح جب وہ چھوٹی گھنٹی ہلا ہلا کر بھجن پڑھا کرتیں تو میں بھی شرٹ کے بٹن بند کرنا بھول جاتا، کبھی بوٹ کے تسمے بند کرنا۔ امی کو سخت چڑ تھی لاجو دیدی سے اور اس کے بھجن سے...... جب تک وہ گاتیں، یہ بکتی جھکتی رہتیں۔

اُن کے اور ہمارے گھر کی ایک ہی دیوار تھی، چھوٹے چھوٹے گھر تھے، کوشش کر کے بھی ادھر کی باتیں اُدھر چھپی نہ رہ سکتیں۔ ہمیں سب پتہ چلتا رہتا تھا۔ لاجو دیدی کی شیکھر سے سگائی کو نواں برس تھا مگر اب تک گود خالی تھی۔ گھر والے ہر طرح کی دوا دارو کر کے اب تھک ہارے تھے مگر شیکھر بھی برداشت والا تھا اور نہ اس کی ماں تو لاکھ سر پٹختی کہ ''نکال باہر کرے اس کمبخت کو، تینوں ٹائم کھا کے بس پڑی رہے ہے۔ نحوست کی ماری، جو بچہ نہ پیدا کر پائے، وہ بھلا عورت کس کام کی......''

یہ تمام باتیں سن کر لاجو دیدی خاموش ہی رہتیں، چپ چاپ سب سنتیں۔ مجھے بڑا غصہ آتا۔ حد ہوتی ہے، میرا دوست کہتا تھا، گالی کھا کر بے



غیرت لوگ چپ رہتے ہیں۔ غیرت مند آدمی بولتا ہے۔ مجھے جب ماجد کے بھائی نے گالی دی تھی تو میں نے جبھی تو بڑا سا پتھر مار کر اس کا سر پھاڑ دیا تھا...... اور ایک یہ ہیں، بہری کہیں کی، سنتی ہی رہتی ہیں۔ واقعی بے غیرت ہیں...... میں نے اپنی زندگی میں لاجو دیدی سے زیادہ بے غیرت عورت کبھی نہیں دیکھی تھی۔

لاجو دیدی کو شیکھر انکل سے عشق تھا، بچپن میں ہی ان کی بات پکی ہوگئی تھی مگر جوان ہو کر شیکھر انکل کے خیالات بدل گئے تھے، وہ سگائی کرنا ہی نہیں چاہتے تھے...... ہائیں...... جس نے سنا، ٹھٹھول میں اڑا دیا۔ ''ایسی بھی کیا لاجا کہ تم بیاہ سے انکاری ہو بیٹھے ہو؟ آج کل تو لونڈے ہاتھ بڑھا منہ سے بَر مانگ لیا کرتے ہیں۔'' بات آئی گئی ہو جاتی، سے کچھ اور سرک جاتا، ہر چار، چھ مہینے بعد شیکھر انکل کی ما کو بارات سجانے کا بخار چڑھتا۔ شام کی چائے میں اسے لیے لیے بیٹھتیں، خوشامدیں کرتیں، منصوبے بناتیں۔ لاجو دیدی کے حسن بے مثال خصوصاً بڑی آنکھوں کے وہ وہ قصیدے پڑھتیں کہ شیکھر تلملا کر رہ جاتا۔

''تو اماں......! میں کیا کروں، اس کی آنکھ اگر یہ بڑی بڑی ہے تو کون سا مجھے اس کی آنکھ سے دیکھنا ہے؟''

''تو بس ہاں کر دے، آنگن چمک جاوے گا میرا، جیتے جی بہو کا ارمان پورا ہو جاوے تو چار دن بچے کھلا لوں تیرے اور بھلا کیا ہوں گے مجھ بڑھیا کے ارمان......'' شیکھر کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

اماں پوچھتی۔ ''تجھے جو کوئی اور بھا گئی ہو تو بھاڑ میں جائے لاجونتی...... بتا مجھے، ہاتھ پیر جوڑ کے لے آؤں گی، تیری خوشی میں ہی خوش ہوں بیٹا......!''

شیکھر چپ بیٹھا ہاتھوں پر آتا پسینہ پونچھتا رہتا

### میری نظر سے

سرسید احمد کو کسی بھی پہلو سے دیکھا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا سا پتھر ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا ہو۔ اس نے جو لہریں اٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں۔ خواہ وہ ہمیشہ اس سمت میں نہ ہوں جو سرسید کو پسند کرتے تھے۔

خالدہ ادیب خانم

پھر اچانک اٹھ کر باہر نکل جاتا۔ رات دوسرے پہر آتا، بنا کچھ کھائے پیے ہی سو رہتا۔ صبح منہ اندھیرے ہی چائے کی پیالی سڑک کر نکل پڑتا۔

پیچھے اماں پریشان رہتی۔ ''رات میں بھی بنا کھائے سو رہتا تھا، صبح بھی بغیر ناشتے کے گیا۔ اچھا بھگوان کرم کرے گا۔ آج شلغم گوشت پکا لیتی ہوں، بہت پسند ہے اسے۔''

اور پھر کئی دنوں تک بات یوں دب جاتی مگر ادھر لاجو دیدی کے کمپاؤنڈ میں بات زیادہ دن دبی نہ رہتی تھی۔ ہر دوسرے کو کھد بدھ لگی ہی رہتی۔

''کیوں بھئی مادھوی، لاجو کو کب تک بیاہو گی؟'' لاجو کی ماں مادھوی بے چاری کیا کہتی، یہ سوال تو خود اس کو اندر ہی اندر ڈستا رہتا تھا۔ لاجونتی سولہویں سے نکلی تھی، لمبا سرو قد، چڑھتی جوانی، سلونی رنگت، کئی آہیں بھرتے تھے تو کئی نیم بسمل تھے، پر لاجو تو ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتی تھی کجا کہ کسی ایرے غیرے کے نام کی نتھ پہنے۔ وہ بہت چھوٹی تھی جب سے ہی سنتی آئی تھی کہ شیکھر اس کے بابو جی کے دوست کا بیٹا ہے۔ وہ اسی سے بیاہی جائے گی۔ پہلے پہل بھلا کیا اہمیت دیتی، پر ایک مرتبہ جب وہ سب بچپن میں دیوالی پر آئے تھے لاجو نکڑ پہ ٹھیلے پر کھڑی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیٹھے لچھے کھا رہی تھی۔ شیکھر بھی آن کھڑا ہوا تھا۔ کتھئی شلوار سوٹ میں کالی رنگت پر سامنے کا ٹوٹا دانت..... لاجو جو ہنسی تو ہنستی ہی چلی گئی اور پھر ہنستے ہنستے ہی بولی۔ ''بندر..... کالا بندر.....''

شیکھر سے بھی جو بن پڑا' کہا اور پیچھے دوڑا پر لاجو کہاں ہاتھ میں آنی تھی' آگے پیچھے دوڑتے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے تو سامنے بچھی چارپائیوں کی قطار پر نئی چادریں بچھی تھیں اور حقے کی سیلی مہک میں تازہ گڑ کی باس بھی شامل تھی۔ لاجو ٹھٹک کر رک گئی۔

''یہ ہے اپنی لاجو.....'' بابو جی نے پیار سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

''ارے..... یہ تو بڑی ہوگئی اور سندر بھی۔ سچ کہوں بھیا' میں نے جب سے تم سے شیکھر کے بر کی بات کی تھی تو کیا معلوم تھا' یہ چوہیا سی ایسا رنگ نکالے گی بھئی' بہت کرپا ہے بھگوان کی۔'' یہ بات سن کر لاجو شرما سی گئی اور جلدی سے نمستے جھاڑ کر اندر اپنے گھر کی طرف بھاگ نکلی تھی۔

''پگلی..... تیرا سسرال آیا بیٹھا ہے۔ کیا کدکڑے بھرتی ہے۔ چپکی بن کے ایک طرف بیٹھ رہ۔ لے یہ دھنیے کے پتے الگ کر کے دے۔'' ماں نے سرگوشیوں میں خبر لی اور دھنیے کی چنگیر اس کے آگے کر دی۔ وہ بے چاری کیا جانتی کہ سسرال کیا بلا ہے' سو بس سر نیہوڑائے جتی رہی۔ ذرا دیر میں عورتیں اسے اپنے پاس بلاتی تھیں' باتیں کرتیں' کوئی روپیہ ٹکا بھی رکھ دیتی تلی پر۔ لاجو کو یہ سب بہت عجیب اور نیا لگ رہا تھا۔ وہ تو من ہی من میں پسینے میں بھیگتی ہتھیلی میں دبے روپوں کا حساب کرتی رہی تھی۔

رات کو جب مہمان رخصت ہوئے تو ماں نے سب روپیوں کا حساب مانگ لیا۔ لاجو جانتی تھی' اس نے بھی پورے پانچ روپے اپنے اندر الگ سے چھپا رکھے تھے۔ لاجو نے سوا دو روپے ماں کی ہتھیلی پر رکھے تو ان کا منہ لٹک گیا۔

''ہوں..... اونچی دکان' پھیکا پکوان۔ مکھی چوس کہیں کے۔ چل بٹیا..... ! یہ تو ہی رکھ لے۔'' لاجو دیدی کی تو جیسے لاٹری ہی نکل آئی تھی۔ ''اور سن' تو نے شیکھر کو بندر کیوں بولا بھلا؟''

''بندر ہی تو لگتا تھا ماں.....!'' مزے سے چاول کھاتے کھاتے پھر اس کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

''اوں ہوں..... ایسا نہیں بولتے۔ تیرا بیاہ ہوگا اس سے۔ تیرے بابو جی نے بات کر رکھی ہے۔''

''ہائے ماں.....! اس سے کیوں؟ میں نہ کروں اس سے بیاہ ویاہ۔''

اماں ہنستے ہنستے دہری ہوگئی تھیں۔ ''او بے شرم' اپنے منہ اپنے بیاہ کی بات نہیں کرتے۔''

وقت نے پھیرے لیے تو لاجو اب جوان کھڑی تھی۔ ماں کے کہے کے مطابق' اب وہ اپنے بیاہ کی بات کبھی نہیں کرتی تھی مگر باقی سب کرتے تھے۔ اپنے ساتھ شیکھر کا نام سن سن کر اسے اب عادت ہو چکی اس نام کی۔ اس نے خیالوں میں ہی اس کو اپنا پتی پرمیشور مان لیا تھا۔ تین چار بار اسے دیکھا بھی تھا۔ ایک مرتبہ چاندنی ماسی کی بارات پر پھر ایک دفعہ بڑی پوجا ٹھہری تھی کمپاؤنڈ میں اور ایک دفعہ کاغذن کے مندر میں اور لاتعداد مرتبہ سیاہ رات میں اپنی خوابوں کے چمکتے جزیروں میں' خوب قد کاٹھ نکالا تھا اس کالے بندر نے۔ وہ رانوں پر پھنسی پھنسی جینز اور بازوؤں پر تنگ پڑتی ٹی شرٹ پہنتا تھا۔ بال گردن تک بڑھا رکھے تھے اور داڑھی مونچھ ندارد..... دائیں کان میں چھوٹی سی مندری تھی۔ لاجو دیدی تو اب شیکھر جی پر قربان ہوگئی تھیں۔

ہولی' دیوالی پر لاجو کے لیے سسرال سے بڑے اچھے اچھے جوڑے آیا کرتے تھے۔ سکھیاں بالیاں



رشک کرتیں مگر بیاہ کا معاملہ تو مسلسل کھٹائی میں تھا۔ واہ' واہ' کرتی زبانیں اب ہاہا کرنے لگ گئی تھیں تو لاجو کی ماں خود ہی بیٹی کے سسرال جا پہنچی تھی۔

''لاجو ہم پر کوئی بوجھ تو نہیں' پر تم بھی جانو ہو' بدھر کا انگ ہو' اُدھر ہو سجے ہے۔ سارا کمپونڈ باتیں کرتا ہے۔ کوئی مسئلہ ہے تو کہو' ہم آپس میں کر گزریں گے۔''

''ناہیں بہن.....! مسئلہ کیا ہوگا' تم فکر ہی نہ کرو' ہم دیکھتے ہیں' جلدی ہی کچھ خبر دیں گے' تم تیاری رکھو۔''

''لاجو کے پتا جی بھی گھلے جاتے ہیں' بیماری نے مانو جڑ پکڑ لی ہے' ان میں سانس کا کیا بھروسہ کب نہ آئے' اپنی جندگی میں بٹیا کے ہاتھ پیلے کر دیں تو سکھ شانتی رہے گی ذرا۔''

اب شیکھر کی ماں نے رٹ پکڑ لی مگر شیکھر.....

پھر لاجو دیدی کے پتا جی بس یونہی اچانک بہت خاموشی سے مر گئے پھر کوئی سات آٹھ ماہ بعد شیکھر کے پتا جی دبئی سے آئے تو اس کی ایک نہ چلی' بہت سادگی سے بیاہ ہوگیا۔ شروع میں تو چاؤ چونچلے ہوتے ہی ہیں مگر شیکھر کی ماں نے تو حد ہی کر دی تھی' لاجو کو بالکل ہتھیلی کا چھالا بنا لیا تھا' کھانا پانی تک مسہری تک پہنچا دیا جاتا تھا۔

چھٹے مہینے میں پہلی بار یہ پوچھا گیا۔ ''گود کب ہری ہو رہی ہے؟'' بے چاری کیا جواب دیتی' آٹھویں مہینے میں ٹونے ٹپانے شروع۔ لاجو دیدی آدھی رہ جاتیں جب ساس ہر کسی کے آگے بے اولادی کا رونا روتیں مگر کبھی پلٹ کر کچھ نہ کہا' بس چپ چاپ پتیلیاں مانجھتی رہتیں۔

شیکھر کسی پرائیویٹ فیکٹری میں صفائی کا کام کرتا تھا مگر گھر آتے ہی خود بابو بن جاتا' ٹانگیں پسار کے لمبے صوفے پر پڑ رہتا اور ٹی وی پر گھٹیا درجے کی فلمیں دیکھتا رہتا۔ ماں اس عرصے میں آس پاس ہی رہتی۔

''شیکھر..... کیا بات ہوئی بیٹا؟ میں حسرت ہی نہ لے جاؤں تیرا منا کھلانے کی؟ ذرا غور تو کیا ہوتا' اب بھی کچھ نہیں گیا تو کہے تو.....''

''اماں.....! کئی دفعہ کہہ چکا ہوں' جب میں ٹی وی دیکھ رہا ہوں' میرے پاس نہیں آیا کر۔ پہلے ایک ہی رٹ تھی تیری' شادی کر لے' اب شادی کر تو لی اور کیا کروں؟''

شیکھر کے لیے یہ کیا کم غضب کی بات تھی کہ فلم کے دوران ماں کی موجودگی میں اسے بار بار چینل بدلنا پڑتا تھا۔ وہ وہیں نیم دراز کھانا کھاتا۔ آج کل کھانے میں کبھی نمک بہت ہوتا تھا' کبھی ہلدی۔ لاجو دیدی بے چاری لاتیں کھاتی اور پھر رات جب تلک جاگتی' مٹھیاں بھرتی رہتی۔ وہ دنوں میں ہی مرگھٹ کی بھتنی لگنے لگی تھی نامراد..... گال پچک گئے تھے' آنکھیں گرے کھڈوں میں جا سجائی تھیں اور سانولے ہاتھوں پر نیلی رگیں ابھر آئی تھیں مگر مجال کہ دو روپے کی دوا بھی لی ہو کبھی۔ سردی گرمی بس وکس بام ملا کرتی تھیں ماتھے پر' اوپر سے سوتی کپڑا لپیٹ کر چل سو چل کا نام..... صبح سے رات' رات سے صبح کرتی تھیں۔

ایک مرتبہ ایسی بیماری اور کام کے عالم میں اُن کا مائکہ آ دھمکا مگر وہ اُن سے سب کچھ چھپا گئیں اور ایسا سوانگ بھرا کہ کہنا ہی کیا۔ پر ماں تو ماں ہی تھی ناں' جاتے سے تک ہاتھ پکڑ پکڑ پوچھتی رہی۔ ''تو خوش ہے ناں لاجو؟ مجھ سے کوئی بھول تو نہیں ہوئی ناں؟'' وہ ناں ناں کرتی رہی اور چولہا چکی بھی۔ ماں بس دیدے بھر بھر دیکھتی تھی' لاجو دیدی کا خیال تھا کہ اس طرح بات بگڑے کی' بس اگلے روز سے کانوں میں موتیا پرونے لگیں اور دنداسہ منگا رکھا اکٹھا ہی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھر بھر سرمہ سلائیاں لگایا کرتیں اور آئے گئے سے خوب ٹھٹھول کرتیں مگر کب تک' اندر دیمک لگتی ہے تو کھوکھلا پن باہر جھلکتا ہی ہے۔

اولاد نہ ہونے پر ساس نندوں نے سر پیٹ لیا تھا مگر لاجو دیدی کہاں کس سے مس ہوئیں ڈاکٹر کے جانے پر' بس یہی کہتیں۔

''بھگوان چاہیں گے تو آپ ہی کرم ہوگا۔''

کیسی بھی دلیل دے لو' کتنا بھی گلا سکھا لو' چاہے جواب میں اطمینان سے پر لہجے میں یہی الفاظ سننے کو ملتے اور جلتی پہ تیل کا کام ہو جاتا۔

''آئے ہائے' بھگوان جنے' کیا چاہے ہیں؟ تجھ کم ذات کو باندھ دیا ہمارے کلے..... نہ اگلتے کے رہے نہ نگلنے کے۔ کیا معلوم کیا ٹونہ کروا رکھا ہے جو شیکھر بابو بھی بس کاٹھ کا الو بنے بیٹھے ہیں؟ ایسا بھی کال تو نا ہیں پڑا میرے رام لکھن کے لیے' آج بھی برادری میں بات نکلنے کی دیری ہے بس۔''

اسی کھینچا تانی میں ایک نہ دو' پورے نو برس گزر چکے تھے۔ اب تو ساس بھی ہمت ہار بیٹھی تھی۔ شیکھر بابو پہلے سے کہیں زیادہ چڑچڑے ہو گئے تھے' برتن اٹھا اٹھا پھینکنے لگے تھے' ساس بھی لاجو دیدی کا پکا نہیں کھاتی تھیں' نندیں سب بیاہی گئیں۔ حیدر چاچو بھی ایک بچے کے باپ بن گئے تھے۔ میں اکثر تنگ کرتا۔ ''بتاؤں چاچی کو لاجو دیدی کی نند والی بات؟'' تو وہ سرخ ہو جاتے' کبھی کبھی جوتا اتارنے کا اشارہ دیتے۔

•.....•.....•.....•

وقت بہت آگے نکل آیا تھا۔ شیکھر بابو اب اکثر بیمار ہی رہتے تھے۔ رات رات بھر کھانستے رہتے اور لاجو دیدی بے چاری کانپتی سردیوں میں کبھی سر' کبھی پیر دبایا کرتیں۔ سائیکل والا کاکا انکل اب دو دن بعد پاپڑ اور بیسنی روٹیاں لینے آیا کرتا تھا۔ لاجو دیدی نے گھر کے باہر چارپائی ڈال کر ٹانی اور سپاریاں بھی بیچنا شروع کر دی تھیں۔ گھر کا سارا بوجھ اب انہی کے کاندھوں پر تھا۔ ساس کی زبان کو اب بھی آرام نہیں تھا بلکہ شوہر کے مرنے کے بعد کچھ اور کھل گئی تھی۔

''حرام زادی' کھا گئی میرے رام لکھن کو..... یہ چوڑی چھاتی تھی' چڑیا کی پسلی رہ گئی۔ رام..... رام..... کوکھ جلی' ایک بچہ تو جن نہ پائی' خود سے میرا جنا بھی لے مری بے غیرت' راانڈ' چھنال۔''

مجھے حیرت ہوتی۔ ''اللہ! اللہ! اب تو بولیں لاجو دیدی' اب نہ بولیں تو کب بولیں گی بھلا؟ عمر کٹ گئی گالیاں کوسنے سنتے' تم تو پال گئیں پورے گھر کو' بھلا ہم نہ جانیں شیکھر انکل کی معمولی تنخواہ تو بہنوں کے اللے تللے اور اپنے پان دارو میں اٹھ جایا کرتی تھیں' پاپڑ بیل بیل تم نے دو نندیں بیاہیں' سب دن تہوار' سب تمہارے دم سے ہی تھے' پر تم رہیں سدا کی ڈھیٹ..... بے غیرت..... میرا دوست کہتا ہے' غیرت مند آدمی بولتا ہے۔'' میں گھٹنوں خود ہی خود میں الجھتا رہتا پاگل' بھلا میرے اس طرح الجھنے سے کیا لاجو دیدی کی زندگی کا الجھا ریشم سلجھ پائے گا۔

•.....•.....•.....•

وہ دسمبر ہی کی کوئی شام تھی جب لاجو دیدی کی ساس ننگے پیر بھاگی چلی آئی تھیں ہمارے یہاں۔

''اے بہن فاطمہ.....! ذرا چل کے دیکھیو' لاجو..... دہری ہوئی پڑی ہے رات سے۔''

میری ماں ناک بھوں چڑھاتی اُس کے پیچھے ہولی تھی اور ماں کے پیچھے میں بھی۔ لاجو دیدی سرخ فرش پر بچھی رلی پر چت لیٹی چھت کو گھور رہی تھیں۔

''یہاں درد اٹھا تھا ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ رات سے جی متلاتا ہے' تین بار الٹیاں کر چکی۔'' لاجو دیدی کی ساس بہو کے پیٹ کے داہنے طرف ہاتھ رکھ کر پوچھ رہی تھیں۔ ''کیوں' میں جو سوچوں..... ٹھیک ہے ناں؟''

لاجو دیدی کی ساس کسی خوش فہمی میں تھیں۔ میں نے سنا' امی اسے ڈانٹ رہی تھیں۔

''کیا سوچو تم؟ دکھایا کسی ڈاکٹر کو؟ آج تک دو آنے کی دوا تم لائیں نہیں' ہو کے لیے؟''

''آئے..... دوا کیا لاتی' موئی کبھی راضی نہ ہوئی آنے جانے کو' کہیں' تم پھکر نہ کرو' بھگوان کے ہاں دیر ہے' اندھیر نہیں۔ میری پرارتھنا کا پھل بس ملا ہی ملا۔ کل ہی لے چلوں میں اس کو ڈاکٹرنی کے۔ بس بہت ہو چکے ٹونے ٹوٹکے۔''

اگلی صبح کالج جاتے میں نے پھر دیکھا' لاجو دیدی کے ہاتھ میں بڑا سا جھاڑو' شڑاپ شڑاپ دہلیز دھو رہی ہیں۔ میں رک گیا۔

''کیا ہوا لاجو دیدی؟ اب کیسی ہو؟''

''کرم ہے مالک کا۔ کالج جاتے ہو؟''

''ہاں۔''

''جاؤ' دیری نہ کرو' باؤ شاباش۔'' اور دوبارہ شڑاپ شڑاپ گلی میں مڑتے میں نے پیچھے دیکھا تو گلی میں چارپائی پہ شیکھر انکل کا ڈھانچہ جسم موجود تھا جس پر لمبی چادر تان کے لاجو دیدی ان کا کوموت صاف کرتی تھیں۔ مجھے پہلی بار ان سے کراہیت محسوس ہوئی۔ میں نے اپنی زندگی میں لاجو دیدی جیسی بے غیرت عورت واقعی نہیں دیکھی۔ کون سا تمہارے بعد مورتی بنا کر پوجا ہوگی' کون یاد کرتا ہے' آج مرے' کل دوسرا دن..... ہونہہ..... اس دن کالج کے بعد سائنسی آلات کی نمائش میں گیا' ذرا دیر ہو گئی۔ واپسی شام سانولی ہو رہی تھی۔

لاجو دیدی کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا' جھلنگا چارپائی پر شیکھر انکل کا ڈھانچہ کانپتا تھا اور لوہے کی ٹوٹی ٹانگ والی کرسی پر لاجو دیدی کی ساس ناک سڑکتی تھی اور لاجو دیدی جیسے سر جھکائے اقرارِ جرم کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''میں کیا کروں ماں جی! مجھے تمہارے بیٹے سے عشق ہو گیا تھا' میں بھی بچہ چاہتی تھی' بھلا میں عورت نہیں تھی کیا؟ مگر میں کہاں سے لاتی بچہ؟ تمہارا بیٹا تو بس خالی ڈھول ہے' اسی لیے تو سگائی سے ڈرتا تھا۔''

میرا وجود دھماکوں کی زد پہ تھا۔ لاجو دیدی تو وہ قطعہ زمین تھیں جو ہمیشہ تشنگی کا عذاب سہتا رہا جس پر ایک قطرہ بھی بادل نہ ٹپکا تھا۔ وہ تو اب تک کنواری تھیں۔ الٹا الزام سر لے لیا۔ ہائے لاجو دیدی..... ہائے..... بے چاری' اسی لیے تو کبھی دوا آنے کی دوا لینے نہ گئی ڈاکٹرنی کے اور چپ چپ بے اولادی کے طعنے..... یہ کیا عشق تھا' یہ کیسی قربانی تھی؟ میرے قدم جم سے گئے تھے۔

''لاجو..... اے لاجو رانی.....'' پہلی بار لاجو کی ساس کی ایسی آواز نے ہمارے گھر کی دہلیز پار کی تھی۔ لاجو دیدی تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا' لاجو کی آنکھ میں آج بھی آنسو نہیں تھے۔ میں نے ساری زندگی میں لاجو دیدی جیسی ''باغیرت'' عورت کبھی نہیں دیکھی۔

## کچے دھاگے

کچے دھاگوں سے بُنتے ہو تم کس لیے
اپنے سپنے نئے' تم نہیں جانتے
دُکھ کی بارش کے پہلے ہی قطرے سے سب
رنگ دُھل جائیں گے
خواب رُل جائیں گے

سحر علی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

الماس فاطمہ عابدی

# ہوس کے پجاری

محسن بھوپالی کا خیال

خوں رلائیں گے منظر، مت قریب آ محسن
آئینہ کدہ ہے دہر، دور سے تماشا کر

**ہوس کے ان غلاموں کا ماجرا جو انسانیت کی توہین ہیں**

یہ واقعہ دستگیر' گوہر آباد' بلاک 15 کا ہے جو کہ معاشرے کے لیے عبرت ہے۔ میرا نام الماس فاطمہ ہے۔ میں پہلے بھی بہت سی کہانیاں لکھ چکی ہوں مگر چند سالوں سے کچھ ذاتی مصروفیات کی وجہ سے لکھنا چھوڑ دیا تھا مگر آج پھر ایک مظلوم ماں کے آنسوؤں نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا ہے۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ بچے چھٹی کی وجہ سے گراؤنڈ میں کھیل کود رہے تھے۔ شام کے وقت گراؤنڈ کے پاس اونٹ والا آیا تھا۔ بہت سے بچے اونٹ کی سواری کرنے میں مشغول ہو گئے تھے۔ ایسے میں ایک بچی علشباہ جس کی عمر چھ سال تھی' ماں کے پاس بھاگی ہوئی آئی۔

''امی.....! اونٹ والا آیا ہے' پانچ روپے دو' اونٹ پر سواری کروں گی۔''

ماں نے ڈانٹ دیا۔ ''نہیں.....اونٹ پر نہیں بیٹھنا' گر جاؤ گی۔''

ماں نے یہی سوچا تھا کہ بچی ڈر جائے گی اس لیے پیسے بھی نہیں دیئے تھے مگر پتہ نہیں' کیسے اونٹ والے نے اسے اونٹ پر بٹھالیا تھا۔ بہت سے بچوں نے خود دیکھا تھا کہ اونٹ والا علشباہ کو سواری کرا رہا ہے۔

شام کے سائے ڈھلنے لگے اور پھر مغرب کی اذان ہو گئی۔ علشباہ کی ماں نے جس کا نام صفیہ ہے' اپنے بیٹے سے پوچھا۔ ''عامر.....! بہن کہاں ہے؟''

عامر نے کہا۔ ''علشباہ تو اونٹ کی سواری کر رہی تھی۔'' صفیہ یہ سوچنے لگی کہ میں نے تو پیسے نہیں دیئے تھے پھر اُس نے سوچا۔ 'نانی یا ماموں نے دے دیئے ہوں گے جو کہ قریب ہی رہتے ہیں اور پھر صفیہ نے عامر سے کہا۔ ''جاؤ' بہن کو بلا کر لاؤ' لائٹ جانے والی ہے' اندھیرا ہو جائے گا۔''

عامر نے جا کر دیکھا' وہاں نہ تو اونٹ والا موجود تھا' نا ہی علشباہ۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا' دوستوں سے پتہ کیا' نانی کے گھر گیا' علشباہ وہاں بھی نہیں تھی۔

عامر بھاگا ہوا گھر آیا اور صفیہ کو بہن کی گمشدگی کے بارے میں بتایا۔ آخر وہ ماں تھی' ننگے پیر ہی روتے ہوئے گراؤنڈ کی طرف دوڑی۔ عامر نے جا کر ماموں' نانا اور دیگر عزیزوں کو بتایا' سب لوگ علشباہ کو ڈھونڈنے کے لیے اِدھر اُدھر پھیل گئے مگر اُس کا پتہ نہ چلا۔ مسجدوں میں بھی اعلان ہونے لگے' یہاں تک کہ رات کے سائے ڈھلنے لگے۔ باپ جب کام سے گھر آیا تو اُسے بیٹی کی گمشدگی کا معلوم ہوا' وہ بھی ہراساں ہو کر اپنی بچی کو محلے والوں کے ساتھ ڈھونڈتا رہا' یہاں تک کہ صبح ہو گئی مگر علشباہ کا

**دعا**

دعاؤں کے ساتھ عمل نہ ہو' کردار نہ ہو' اخلاص نہ ہو تو دعائیں بھی زمین کے کناروں سے باہر نہیں نکلتیں۔ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق وہ دعائیں مقبول بارگاہ ہوتی ہیں جن کے ساتھ مسلسل اور پیہم عمل ہو۔ عمل کے بغیر دعا ایک ایسا جسم ہے جس میں روح نہیں ہے اور جب جسم میں سے روح نکل جاتی ہے تو اس کی حیثیت ایک لاش کی سی ہوتی ہے جو کسی کام نہیں آتی۔

بحوالہ: ''کشکول'' خواجہ شمس الدین عظیمی

پتہ نہ چلا۔ محلے کے چند لڑکے گدانی' ہاکس بے کی طرف بھی گئے' وہاں کے اونٹ والوں سے پوچھ گچھ کی مگر کوئی سراغ نہ ملا تو مایوس ہو کر گھر آ گئے۔ آخر ٹی وی چینل سماء اور ایکسپریس پر علشباہ کی تصویر اور ماں کی اپیل آنے لگی۔

صفیہ روتے ہوئے یہی کہہ رہی تھی۔ ''اونٹ والے.....میری بچی مجھے واپس کر دو۔ تمہیں جو کچھ بھی چاہیے' میں دینے کے لیے تیار ہوں' بس میری بچی مجھے واپس کر دے۔''

یہاں میں یہ بتاتی چلوں کہ علشباہ کے والد ایک مزدور ہیں مگر اپنی بچی کی بازیابی کے لیے وہ ہر سودا کرنے کے لیے تیار تھے۔ قصہ مختصر' اس اپیل کے باوجود علشباہ کا کوئی پتہ نہ چلا اور چار دن گزر گئے اور پھر پانچویں دن صبح اخبار میں خبر چھپی کہ ایک بچی کی لاش گلستان جوہر کی جھاڑیوں میں پولیس کو ملی ہے جو ایدھی میں رکھی ہے۔ علشباہ کی نانی نے اخبار میں تصویر دیکھی تو کپڑوں سے پہچانا۔ ''یہ میری نواسی کی تصویر ہے۔''

وہ لوگ ایدھی پہنچے' ایدھی والوں نے بتایا۔ ''بچی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی لاش جناح ہسپتال پوسٹ مارٹم کے لیے گئی ہے۔فون کر کے علشباہ کی میت وہاں سے منگوائی گئی لیکن جب والد اور ماموں نے میت دیکھی تو تڑپ کر رہ گئے‘علشباہ کی آنکھیں نکلی ہوئی تھیں‘چہرہ بھی خراب ہو چکا تھا‘ پوسٹ مارٹم کی وجہ سے جگہ جگہ ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ پھول جیسی معصوم بچی کو مسل کر رکھ دیا گیا تھا۔ ایدھی والوں کو معلوم تھا‘ بچی لاوارث نہیں‘ بچی کی تصویر‘ گھر کا ایڈریس اور والد کا فون نمبر بھی موجود تھا پھر کیوں انہوں نے اُس کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجا؟ اس بات پر تمام اہلِ محلہ اور عزیزوں نے ایدھی کے سامنے احتجاج کیا اور دھرنا دے کر بیٹھ گئے کہ ہماری بچی کا بغیر اجازت پوسٹ مارٹم کیوں کیا؟ اور جب تک ہماری بچی کو اغواء اور قتل کرنے والے کو پکڑ کر ہمارے حوالے نہ کیا جائے گا‘ ہم بچی کی لاش لے کر نہیں جائیں گے۔ آئی جی‘ ڈی آئی جی‘ کورنر صاحب سب جائے وقوعہ پر پہنچ گئے اور اُن سے وعدہ کیا کہ جلد ہی ملزم کو قانون کے کٹہرے میں لایا جائے گا۔

جس وقت علشباہ کی میت ایدھی سے گھر آئی تو تمام محلہ اور علاقہ سراپا احتجاج بن گیا۔ ہر ایک کی آنکھیں اشکبار تھیں‘ ہر ایک کی زبان پر یہی مطالبہ تھا کہ ظالم قاتل کو ہمارے حوالے کردو‘ ہم اس کو زندہ جلائیں گے۔ دو نیوز چینلز یہ تمام منظر ٹی وی پر لائیو ٹیلی کاسٹ کر رہے تھے۔ آخرکار آہوں‘ سسکیوں اور آنسوؤں میں علشباہ کا جنازہ اٹھایا گیا تھا۔ صفیہ کی حالت غیر تھی‘ باپ بھی بہت غم زدہ تھا‘ ماحول پر رنج اور الم کے ساتھ عجیب خوف بھی طاری تھا‘ اسی عالم میں ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ وہ بھی اتوار کا دن تھا‘ وہی چھ بجے کا وقت تھا۔ کہانی کا رخ بدلا‘ محلے میں شور ہوا کہ ندی جہاں چھڑوں کے کوارٹر ہیں‘ وہاں رسیوں سے بندھی ہوئی ایک بچی ملی ہے۔ میں بھی دوڑ کر وہاں پہنچی‘ معلوم کرنے پہ پتہ چلا‘ نمرہ نامی اُس بچی کو ملزم اپنے کوارٹر میں لے کر گیا تھا‘ ندی کے اوپر جہاں اب لیاری کا پل بن چکا ہے‘ وہاں سے تین لڑکے بلال‘ جہانگیر اور علی یہ منظر دیکھ رہے تھے‘ اُن تینوں نے محسوس کیا‘ ضرور کوئی خطرے والی بات ہے۔ بچی واپس نہیں آئی‘ وہ تینوں اُس کوارٹر میں کود گئے‘ ملزم کمرے میں تالا لگا کر کہیں جا رہا تھا کہ اُن لڑکوں نے اسے گھیر لیا مگر فوراً ہی انہیں پتہ چلا کہ وہاں ایک نہیں‘ دو ملزمان موجود ہیں۔ انہوں نے پھر ہمت کی مگر وہ دونوں بڑے مضبوط جوان تھے۔ اُن تینوں لڑکوں سے جان چھڑانے کے بعد باہر کا دروازہ لاک کر کے بھاگ لیے۔ اُن لڑکوں میں سے ایک علی کی جیب میں موبائل موجود تھا‘ اُس نے فوری طور پر ایک سیاسی پارٹی کے پونٹ اور سرکل انچارج کو فون کر کے یہ صورت بتائی تھی‘ وہ فوری طور پر وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے پولیس کو بھی خبر کر دی۔ جوہر آباد تھانے کے ایس ایچ او فوراً ہی موقع پر پہنچ گئے اور کمرے کا تالا توڑ کر بچی کو نکالا۔ اُس بچی نمرہ نے بیان دیا تھا کہ مجھے بشیر نے یہ کہہ کر بلایا تھا کہ تمہارا بھائی ندی میں گر گیا ہے‘ جا کر دیکھو۔ میں ندی کی طرف جیسے ہی گئی‘ چوں کہ بشیر کا کوارٹر بھی ندی کے قریب ہی ہے‘ اس نے مجھے پکڑ کر کوارٹر میں بند کر دیا اور کہا کہ ”اگر تم نے آواز نکالی تو میں تمہیں علشباہ کی طرح قتل کر دوں گا.....“ اس طرح پتہ چلا تھا کہ بشیر ہی نے اُس معصوم علشباہ کو قتل کیا ہے۔ نمرہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ اونٹ والے کو بشیر نے ہی پیسے دیئے تھے کہ علشباہ کو سواری کراؤ۔

ایس ایچ او صاحب نے تمام جگہ ناکہ بندی کر دی تھی تاکہ مجرم پکڑا جائے۔ آخرکار سپرہائی وے سے مجرم بشیر کو اس وقت گرفتار کیا گیا تھا جب وہ فیصل آباد جانے والی کوچ میں بیٹھا ہوا تھا۔



مجرم بشیر نے اقبالِ جرم کر لیا تھا کہ میں نے ہی اونٹ والے کو پیسے دے کر علشباہ کو سواری کرائی تھی۔ اس کے بعد لائٹ چلی گئی۔ علشباہ اکیلی گھر کی طرف جا رہی تھی کہ میں نے اُسے اور پیسوں کا لالچ دیا پھر اُسے کوارٹر میں لے جا کر بند کر دیا اور بے ہوشی کی دوا دے دی تاکہ وہ شور نہ مچائے اور رات گیارہ بجے جب دوبارہ لائٹ گئی‘ میں علشباہ کو اپنے دوسرے ساتھی کی مدد سے بے ہوشی کی حالت میں اسکوٹر پر ندی کے راستے گلستانِ جوہر اس فلیٹ پر لے گیا جہاں ہم لوگ رنگ کا کام کر رہے تھے۔ فلیٹ کی چابی ہمارے پاس تھی‘ وہیں پر میں نے اور میرے ساتھی مجید عرف بھورا نے اُسے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا اور جب ہم نے دیکھا‘ بچی مرنے والی ہے اور سسک رہی ہے تو مجید نے اُس کے گلے پر پیر رکھ کر اُسے مار دیا اور پھر ہم نے اُس کی شکل بگاڑ دی اور آنکھیں بھی پھوڑ دیں تاکہ کوئی اُسے پہچان نہ سکے۔

بشیر کے بیان کے بعد پولیس نے مجید عرف بھورے کو بھی گرفتار کر لیا۔ اُس کا بھی وہی بیان تھا جو بشیر نے دیا تھا۔

حیرت اور افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ بشیر اور مجید دونوں شادی شدہ ہی نہیں‘ صاحبِ اولاد بھی ہیں لیکن یہ ظلم کرتے ہوئے ان کا دل نہیں پھٹا۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے‘ وہ ضرور ان کو سزا دے گا۔ وہ تو مرنے کے بعد بھی سزا دے گا مگر اب دیکھنا یہ ہے کہ انہیں قانون کیا سزا دیتا ہے؟ ویسے ہم تمام اہلِ محلہ کی تو یہی آواز ہے کہ ان ظالموں کو زندہ جلا دیا جائے تاکہ دنیا عبرت حاصل کر سکے۔ کسی بھی معصوم بچی کے ساتھ آئندہ ایسا نہ ہو۔ آج صفیہ کی آنکھوں سے آنسو کم نہیں ہوتے‘ ایک مزدور باپ کی نگاہوں میں حسرت بھرا سوال ہے کہ میری بچی کے قاتلوں کو کیا سزا ملے گی؟؟؟

## شام کے بعد.....

زندگی رک سی گئی ہے مری اُس شام کے بعد
دل بہلتا نہیں میرا کہیں اُس شام کے بعد

آنکھیں ہیں خشک‘ میرے دل میں سمندر ہے رواں
پھول‘ کلیاں سبھی مرجھا گئیں اُس شام کے بعد

کھو گئے راستے‘ منزل کا نشاں بھی نہ رہا
نغمے گم ہو گئے جانے کہاں اُس شام کے بعد

خونِ دل دے کے جو سینچا تھا گلستاں ہم نے
ایسا بکھرا ہے‘ سمٹتا نہیں اُس شام کے بعد

روح گھائل ہے‘ بھلا دل کو سنبھالیں کیسے؟
صبح ہوتی نہیں گھر میں میرے اُس شام کے بعد

کیا بتاؤں میرے اس دل کی تمنا کیا ہے؟
کاش مل جائے وہ آ کر مجھے اُس شام کے بعد

رضیہ ناز



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خلیل جبار

# یہ جھروکا نہ کھولیں

گلنار آفرین کا خیال

غبار غم کا دیارِ وفا میں اُڑتا ہے
مگر یہ اشک مرے کام چشم تر آئے

**اس ڈرائیور کا قصہ جس نے ایک بھٹکی ہوئی مسافر کو منزل دی تھی**

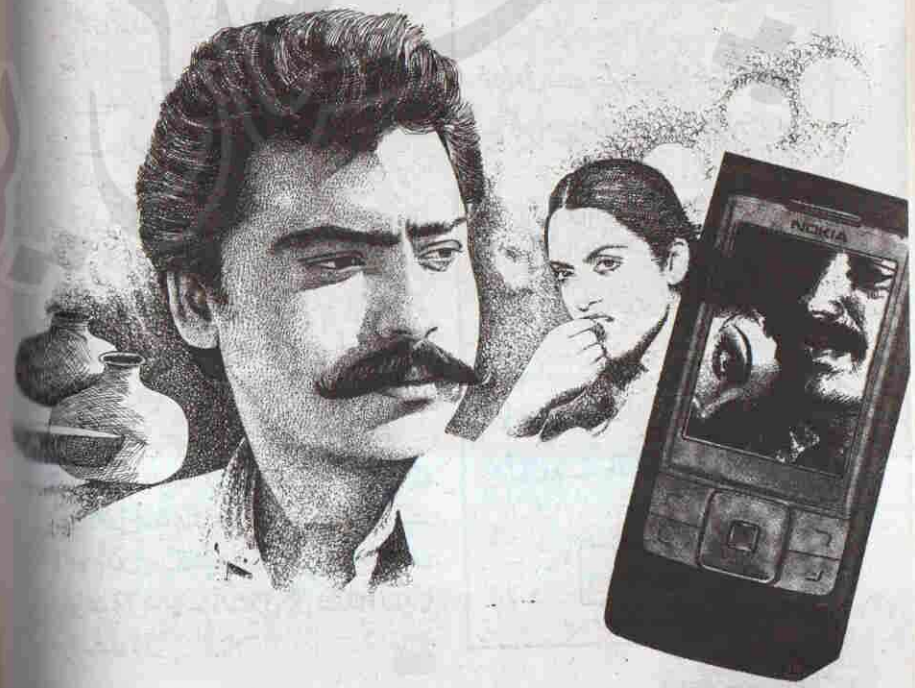



میں ایک بس ڈرائیور ہوں۔ اب یہ میری تقدیر ہے کہ میں ڈرائیور ہوں حالانکہ بچپن ہی سے مجھے تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا لیکن میرا باپ لقمان ایک غیر ذمہ دار اور نشئی شخص تھا۔ وہ علاقے میں موالی کے نام سے مشہور تھا۔ نشہ کر کے کچرے کے ڈھیر پر پڑے رہنا اس کا معمول تھا۔ علاقے کے لوگوں کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ میرا باپ جوانی میں اچھے کردار کا مالک تھا۔ چھوٹوں اور بڑوں کا ادب کرتا تھا۔

باپ کی شادی ہوئی تو اسے میری ماں کی شکل میں ایک جھگڑالو عورت ملی وہ زیادہ تر میکے میں رہتی تھی۔ باپ جب بھی ماں کو گھر لے کر آتا' وہ کچھ دن صحیح رہتی مگر پھر میرے باپ سے لڑ جھگڑ کر میکے چلی جاتی تھی۔ ابا اس کو بہت سمجھاتا تھا مگر وہ کہتی تھی۔ ''میرا سسرال چھوٹ سکتا ہے مگر میکہ نہیں چھوٹ سکتا۔ اگر تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے تو میکے والی گلی میں کرائے کا مکان لے لو۔'' پھر ایک دن ماں اپنے میکے گئی تو واپس آنے کا نام نہ لیا۔

ابا اپنے بوڑھے والدین کو چھوڑنے کو تیار نہ تھے اور بیوی کو بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ وہ سگی خالہ کی بیٹی تھی۔ ان ہی پریشانیوں کی بنا پر اس نے نشہ کرنا شروع کر دیا۔ بوڑھے والدین اپنے بیٹے کی اس حالت پر کڑھتے رہتے تھے چنانچہ ایک سال کے اندر دادا اور دادی دونوں کا انتقال ہو گیا۔ نشے کی لت کی وجہ سے ابا کی نوکری بھی چھوٹ گئی۔ اس عرصے میں دنیا میں میری آمد ہو چکی تھی۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن گھر میں مالی تنگدستی سے میری تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ادھوری رہ گئی۔ گھر کی ذمہ داری مجھ پر آ پڑی تھی۔ ماں بھی اپنے والدین کے انتقال ہو جانے اور اپنے بھائیوں کے روکھے رویے سے گھبرا کر اپنے گھر آ چکی تھی لیکن اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ ابا نشے کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ نشے کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ اسے گھر کی کوئی فکر نہیں تھی۔ ماں نے گھر کا خرچہ چلانے کو مجھے بس ڈرائیور کے پاس اور دو چھوٹے بھائیوں کو بڑھئی کے کام پر لگا دیا۔ وقت گزرتا رہا اور میں کلینر سے کنڈیکٹر اور پھر ڈرائیور بن گیا۔ میرے ڈرائیور بننے سے گھر کے مالی حالات میں خاصی بہتری آ گئی تھی لیکن میرے دل میں تعلیم حاصل کر کے بابو بننے کا جو خواب تھا' وہ پورا نہ ہو سکا۔

مجھے صدر سے لانڈھی روٹ کی بس چلانی ہوتی ہے۔ صبح سے رات گئے تک میں بس چلاتا ہوں۔ بس ڈرائیوری میں مجھے دنیا کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ مجھے نشے کا کوئی شوق نہیں تھا لیکن رات کو جب میں بستر پر لیٹتا تو میرا بدن تھکن سے چور ہوتا تھا۔ ڈرائیوری کی لائن سے منسلک لوگوں نے مجھے بتایا کہ اس تھکن سے بچنا چاہتے ہو تو خود کو نشے کا عادی کر لو چنانچہ چرس بھری سگریٹ اور نسوار کی چٹکی لگانے سے میرے جسم کو سکون مل جاتا تھا۔

ہر کام کے کچھ کاروباری تقاضے ہوتے ہیں' اسی طرح بس ڈرائیوری بھی ہے۔ ڈرائیور کو خود کو بہرا بنا کر رکھنا پڑتا ہے۔ بس کی رفتار ذرا سست ہوئی' مسافر ڈرائیور کو برا بھلا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ بعض نوجوان گالیاں بھی دیتے ہیں اور نہ جانے کن کن خطابات سے نوازنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر ہم بہرے نہ بنیں تو آئے دن مسافروں سے جھگڑا، ہاتھا پائی کی نوبت آ جائے اور روزی کمانا مشکل ہو جائے۔ ہم ڈرائیوروں کی مجبوری ہے کہ بس مالکان کو خوب کما کر دیں۔ مالک ہمارے ساتھ نہیں ہوتا لیکن اس کو اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ ہم کتنا کما لیتے ہیں۔ مالک پورے پیسے مانگتا ہے خواہ دن بھر کمائی ہوئی ہو یا نہیں' اس بات سے اسے کچھ غرض نہیں ہوتی۔ بس میں ٹوٹ پھوٹ کا خرچہ بھی ہمیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اکثر بزرگ بسوں میں بے ہنگم گانوں کے شور سے پریشان ہو جاتے ہیں لیکن یہ ہم ہی جانتے ہیں کہ بس کے لیے گانے کتنے ضروری ہوتے ہیں۔ میں مسافروں کو دیکھ کر گانے چلاتا ہوں۔

لوگ کہتے ہیں کہ ڈرائیور بہت بے رحم ہوتے ہیں۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر ریسیں لگا دیتے ہیں۔ ان کی تیز رفتاری پر بس میں بیٹھے ہوئے مسافروں کی چیخیں نکل جاتی ہیں خصوصاً خواتین' چھوٹے بچے بہت خوف زدہ ہوتے ہیں لیکن ایسی بات نہیں کہ ہم ڈرائیوروں میں رحم نام کی چیز نہیں ہوتی۔ ریس لگانا ہماری مجبوری ہوتی ہے کیونکہ ہمیں نمبر کا ٹوکن حاصل کرنا ہوتا ہے۔

اس دن موسم بڑا خوشگوار تھا۔ پورا دن بڑا اچھا گزرا تھا۔ میرا یہ آخری چکر تھا۔ بس بھر جانے پر منچلے نوجوان بس کی چھت پر چڑھ کر بیٹھ گئے تھے۔ گانوں کی جھنکار میں بس کو میں بہت آہستہ چلا رہا تھا۔ ہماری ہوس کی کھوپڑی نہیں بھرتی۔ یہ لوگوں کا خیال ہے مگر ہم ہی جانتے ہیں کہ دن بھر میں جو بس خالی چلتی ہے' اس کا نقصان ہم اس طرح پورا کرتے ہیں۔

''ابے موالی کے بچے..... بس تیز چلا۔'' ایک نوجوان زور سے چیخا۔

''او حرامی..... تیرا پیٹ کیا اتنا موٹا ہو گیا ہے کہ بھرتا نہیں ہے؟'' موٹی مونچھوں والا آدمی گرجا۔

''ہمیں اپنے گھر جانا ہے' ساری رات تیری بس میں نہیں گزارنی۔'' ایک نوجوان بولا۔

''میاں..... کچھ بھی کرلو' یہ اپنی ہی چلاتے ہیں۔'' ایک بزرگ نے پان چباتے ہوئے کہا۔

اس طرح کے کلمات سننے کے ہمارے کان عادی ہو گئے ہیں اسی لیے ہم پرواہ نہیں کرتے۔ ایسے موقع پر ہم اکثر ٹیپ ریکارڈ کی آواز تیز کر دیتے ہیں یوں یہ آوازیں ہم تک نہیں پہنچ پاتیں۔

ویسے جب سے موبائل آیا ہے' منچلے نوجوانوں کی اکثریت موبائل پر S.M.S کرنے میں مصروف رہتی ہے۔ ایسا لگتا ہے' ان کے نزدیک دنیا کا سب سے اہم کام یہی ہے۔

''ابے بھوتنی کے..... گاڑی کو تیز چلا لے۔''

ایک آدمی نے بس کی باڈی زور زور سے ہاتھ مارنا شروع کر دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے نوجوان بھی بس کو پیٹنے لگے۔ میں ان کی رگ کو جانتا تھا' میں نے بس کی رفتار چند منٹ کے لیے تیز کر دی پھر بس میں خاموشی ہو جانے پر آہستہ آہستہ رفتار بھی کم کر دی۔ مسافروں کو خاموش کرانے کا میرے پاس یہ بھی ایک فارمولا تھا۔ آہستہ آہستہ مسافر اپنی اپنی منزل پر اترتے جا رہے تھے۔ لانڈھی کا آخری اسٹاپ آنے پر باقی مسافر بھی اتر گئے۔ بے اختیار میری نظر لیڈیز کمپارٹمنٹ میں گئی۔ ایک خاتون ابھی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔

''بی بی' یہ آخری اسٹاپ ہے' اس سے آگے گاڑی نہیں جائے گی۔''

''مجھے معلوم ہے' یہ آخری اسٹاپ ہے لیکن مجھے نہیں معلوم کہ کہاں جانا ہے؟'' اس نے انتہائی دکھی انداز میں کہا۔

''جی.....؟'' میں بری طرح چونکا۔ ''رات کا ایک بج رہا ہے' آپ کو جہاں جانا ہے' چلی جائیں، ہمیں یہ بس اڈے پر پہنچانی ہے۔''

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کہاں جاؤں؟'' اس نے کہا۔

''استاد' اسے گھر لے جاؤ۔ رات اچھی گزر جائے گی۔'' کنڈیکٹر نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''بکواس بند کر.....'' میں نے کنڈیکٹر کو جھاڑ پلائی۔



''مجھے تم شریف گھرانے کی لڑکی معلوم ہوتی ہو۔ اپنے گھر چلی جاؤ۔ تمہارے گھر والے انتظار کر رہے ہوں گے۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

اس قسم کی عورتوں کو دیکھ کر مجھے خوف آتا تھا کہ کہیں کسی چکر میں نہ پھنسا دیں۔

''کیا تم رات کو مجھے اپنے گھر پناہ نہیں دے سکتے؟'' اس نے التجا کی۔

''دیکھو بی بی! میں اکیلا آدمی ہوں' میرے گھر میں کوئی عورت نہیں ہوتی اس لیے تم کہیں اور چلی جاؤ۔'' میں نے اس سے جان چھڑانے کو کہا۔

''نہیں' میں تمہارے گھر ہی جاؤں گی' مجھے کہیں اور نہیں جانا۔''

''مان نہ مان میں تیرا مہمان..... یہ کیا بات کر رہی ہو تم؟'' میں نے غصے سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''استاد' کس سوچ میں پڑ گئے ہو؟'' کنڈیکٹر نے مجھے سوچتا دیکھ کر کہا۔

''یار' اس عورت نے مجھے فکر میں ڈال دیا ہے۔ یہ میرے گھر جانا چاہتی ہے۔ میں اس کو اپنے گھر لے جانا نہیں چاہتا۔ جانتے ہو رفیقے استاد کو؟''

''استاد رفیقے کو کون نہیں جانتا۔''

''اس نے بھی ایک عورت پر رحم کھا کر رات بھر کے لیے پناہ دی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صبح کو وہ اور اس کے گھر والے بیدار نہیں ہو سکے تھے' محلے والوں نے جب ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے' تب کہیں جا کر وہ بیدار ہوئے۔ گھر کا سارا سامان بکھرا پڑا تھا۔ وہ عورت گھر میں موجود نقدی اور زیورات لے کر فرار ہو چکی تھی۔ کیا تم بھی یہ چاہتے ہو کہ تمہارا استاد بھی استاد رفیقے کی طرح لٹ جائے؟'' میں نے کہا۔

''میں ایسی نہیں ہوں۔ مجھ پر اعتبار کرو۔'' وہ بولی۔

''کس پر اعتبار کریں' سب دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''مجھے آپ پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو؟'' اس نے کہا۔

''ہاں' مجھے ڈاکٹر بننے کا بہت شوق تھا لیکن گھریلو حالات نے ڈاکٹر کے بجائے بس ڈرائیور بنا دیا البتہ تھوڑا بہت پڑھ لیتا ہوں۔''

''مجھے لگتا ہے' آپ ابھی بھی کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے ہو؟''

''ہاں' اکثر میں رات کو مطالعہ کر کے سوتا ہوں لیکن تمہیں کس طرح پتا چلا کہ میں مطالعہ کا عادی ہوں؟'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''آپ کی باتوں سے اندازہ ہو گیا ہے۔ کیا آپ مجھے اپنے گھر لے کر نہیں جاؤ گے؟ کیا انسانیت یہی سبق دیتی ہے کہ کسی پریشان حال کی مدد نہ کرو؟'' اس نے کہا۔

''پریشان حال کی مدد کرنا فرض ہے لیکن کچھ غلط اور جرائم پیشہ لوگوں نے اعتماد ختم کر دیا ہے۔ کسی کے ساتھ بھلائی کرنا گلے پڑ جاتا ہے۔ انسان کس پر اعتماد کرے؟ ہر انسان دوسرے انسان کو نقصان پہنچانے پر تلا ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ مجھ پر اعتماد کر کے دیکھیں' میں آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گی۔'' اس نے التجا کی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''گلنار.....!'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے گلنار بی بی' میں تم پر اعتبار کر لیتا ہوں لیکن میرے ساتھ کسی قسم کا دھوکہ کیا تو میں تمہارا قبر تک پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ میں جنونی قسم کا آدمی ہوں' اپنا انتقام لیے بغیر نہیں رہتا۔ چاہے انتقام لینے پر مجھے کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو جائے۔'' میں نے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دھمکی دی۔

میں فطرتاً ایسا نہیں تھا لیکن اس کو ڈرانا ضروری تھا تاکہ اگر وہ میرے گھر کسی خراب نیت سے جانا چاہ رہی ہو تو باز آجائے۔

میں اس کو گھر لے آیا۔ میری ماں نے حیرت سے ایک اجنبی لڑکی کو میرے ساتھ دیکھا۔ میں نے ماں کی آنکھوں سے جھانکتا سوال پڑھ لیا تھا۔

''ماں! یہ میرے دوست رضوان کی بہن ہے۔ چند دن یہاں رہے گی۔ اس کا بھائی پنجاب کسی کام کے سلسلے میں گیا ہے' اس کے آنے پر چلی جائے گی۔''

میرے لیے وضاحت کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ میری بات پر ماں کے چہرے پر اطمینان آ گیا تھا۔ کھانا کھا کر وہ ماں کے ساتھ سو گئی اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

رات بھر میں سو نہیں سکا۔ ہلکی سی آہٹ اور دروازہ کھلنے یا بند ہونے کی آواز پر میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتا اور دیکھتا کہ گلنار کہیں اپنا کام دکھا کر بھاگ تو نہیں رہی لیکن وہ بڑے مزے سے میری ماں کی چارپائی پر ان کے ساتھ سوئی ہوئی دکھائی دیتی۔

صبح بیدار ہونے پر گلنار نے میرے آگے ناشتہ لگا دیا۔ میں نے حیرت سے ناشتے کو دیکھا۔ اتنی صبح صبح ہم ڈرائیوروں کو ناشتہ کہاں نصیب ہوتا ہے۔ منہ پر چھینٹے مار کر گھر سے نکل جاتے ہیں اور صدر میں صبح سات، ساڑھے سات بجے کسی پٹھان کی ہوٹل کی چائے اور پراٹھے سے ناشتہ کرتے ہیں۔

''تم نے کیوں ناشتہ بنایا، تم مہمان ہو؟''

''آپ کی ماں سو رہی ہیں اس لیے میں نے ناشتہ تیار کر لیا ہے۔'' گلنار نے بتایا۔

گھر سے ناشتہ کر کے میں گلنار کے ہمراہ باہر آیا۔ وہ اپنی راہ لگی اور میں بس پر آ گیا۔ دن بھر گاڑی چلاتا رہا۔ رات گئے گھر واپسی ہوئی تو گلنار کو گھر میں دیکھ کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔

''ارے' تم تو چلی گئی تھیں؟ میں نے تم کو رات گزارنے کی اجازت دی تھی؟'' میں نے غصے سے اسے دیکھا۔

''ہاں' ہاں' مجھے یاد ہے لیکن میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ آپ ہی بتائیں میں کہاں جاؤں؟'' اس نے کہا۔

''یہ میرا مسئلہ نہیں ہے' اگر گھر نہیں ہے' ماں باپ نہیں ہیں تو کوئی عزیز رشتہ دار ہو گا، اس کے گھر چلی جاؤ۔'' میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔

میں عورتوں کے معاملے میں بہت ڈرتا ہوں۔ عورتوں کے نام پر قتل و غارت بہت ہوتے ہیں۔ اگر گلنار کسی لڑکے کے چکر میں گھر سے بھاگ کر آئی ہے اور وہ لڑکا اسے دھوکہ دے کر فرار ہو گیا ہو گا لیکن اس کے گھر والے مجھے وہ لڑکا سمجھ کر قتل کر سکتے تھے۔ میں کسی بھی صورت اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

''میں کوئی غلط لڑکی نہیں ہوں۔ مجھے چند دن اس گھر میں گزار لینے دیں۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔'' گلنار نے بڑی مسکین سی صورت بنا کر کہا۔ اسے دیکھ کر مجھے جانے کیوں اس پر ترس آنے لگا اور اپنے رویے پر شرمندگی سی ہونے لگی۔

''ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' اب رونا دھونا نہیں' اپنی بات پر قائم رہنا۔'' کہتے ہوئے میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ابھی مجھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ گلنار کھانا گرم کر کے لے آئی۔

''تم نے یہ زحمت کیوں کی؟ ماں کھانا لے آتی۔'' میں نے کہا۔

''ماں جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' وہ دوائی کھا کر سو رہی ہیں۔ مجھے کہہ کر سوئی تھیں' جب تم آ جاؤ تو



کھانا دے دوں۔''

''ٹھیک ہے' تم بھی جا کر سو جاؤ۔'' میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے باتیں کرنے کے موڈ میں میرے پاس بیٹھنا چاہتی ہے مگر میرے روکھے رویے کو دیکھ کر جانے کو پلٹی۔

''چائے بنا دوں؟''

''نہیں، دن بھر خوب چائے پیتا رہا ہوں۔''

میں نے جلدی جلدی کھانا کھا کر کھانے کے برتن سمیٹ کر رکھ دیے اور سونے کے لیے بستر پر لیٹ گیا۔ جب تک مجھے نیند نہ آ گئی' گلنار کے متعلق ہی سوچتا رہا۔ وہ کون ہے' یہاں کیوں آ گئی ہے' آخر اس کے ساتھ کیا بیتی ہے جو وہ اپنے رشتے داروں کے پاس جانا نہیں چاہتی؟ یہی سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی اور صبح بیدار ہونے پر گلنار کے ہاتھوں کا بنا ناشتہ کر کے حسبِ معمول میں بس اڈے پر چلا گیا۔

دن یونہی گزر رہے تھے۔ گلنار کو میرے گھر آئے مہینہ ہونے کو آ گیا تھا' وہ جانے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ماں سے وہ بہت گھل مل گئی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ماں اس کو پسند کرنے لگی ہے اور دبے لفظوں میں مجھ سے بہو بنانے کا ارادہ ظاہر کر چکی تھی۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ وہ دوست کی بہن نہیں ہے بلکہ زبردستی گلے آ لگی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ گلنار مجھے بھی اچھی لگنے لگی تھی' تاہم اس کے بارے میں معلومات نہ ہونے کی بنا پر میں خوف زدہ تھا۔ جس دن سے گلنار ہمارے گھر آئی تھی' میں روزانہ باقاعدگی سے اخبار پڑھ رہا تھا کہ اس کے متعلق کوئی خبر شائع ہو اور مجھے اس کے متعلق درست معلومات حاصل ہوں۔

اتوار کے دن بخار کی وجہ سے مجھے کام کی چھٹی کرنی پڑ گئی۔ ماں سودا سلف لینے بازار گئی ہوئی تھی۔ مجھے چائے کی طلب ہونے پر وہ میرے لیے چائے بنا کر لے آئی۔

''دیکھو گلنار' تمہیں یہاں آئے ہوئے ایک ماہ ہونے کو ہے' تم نے مجھے ابھی تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ یوں میں کسی اجنبی لڑکی کو اپنے گھر پر کس طرح رکھ سکتا ہوں؟ میری ماں کو بھی غلط فہمی ہو گئی ہے' وہ تمہیں میرے دوست کی بہن سمجھ کر تم سے میری شادی کرنے کی خواہش مند ہے۔ میں کسی انجان لڑکی سے کس طرح شادی کر لوں جس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو؟'' میں نے اپنے دل کی بات اس سے کہہ ہی ڈالی۔

''آپ کی جگہ اگر میں ہوتی تو میرے بھی یہی خیالات ہوتے' مجھ سے نادانی میں بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے جس کا خمیازہ بھگتنے کا تصور کرتے ہی میں کانپ جاتی ہوں۔ میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی اور صاف صاف بتاؤں گی کہ آپ اندھیرے میں نہ رہو۔ سب کچھ سننے کے بعد جو بھی آپ کا فیصلہ ہو گا' مجھے منظور ہو گا۔ میں آپ کی احسان مند ہوں کہ جس طرح آپ نے مجھے اتنے دن اپنے گھر رکھا' اس دور میں جب لوگ بے سہارا عورت کو لوٹ کا مال سمجھتے ہیں لیکن آپ کی آنکھوں میں کبھی میں نے وہ چمک نہیں دیکھی جو بدکردار لوگوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔'' گلنار کہتی جا رہی تھی اور میں توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا۔

''میرا نام شبانہ ہے' میں انٹر کر رہی تھی۔ اپنی دوستوں کو موبائل پر باتیں کرتا دیکھ کر میرے دل میں بھی خواہش جاگی کہ میرے پاس بھی موبائل ہونا چاہیے۔ میری سہیلیاں موبائل پر لڑکوں سے باتیں کر کے مفت بیلنس منگواتی تھیں اور لڑکوں کو خوب بے وقوف بناتی تھیں۔ میں نے بھی کسی طرح رقم جمع کر کے سستا موبائل خرید لیا اور اب میں بھی اپنی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سہیلیوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے موبائل پر لڑکوں کو بے وقوف بنا کر بہانے بہانے سے بیلنس منگوا کر خوش ہوتی تھی اور اپنی سہیلیوں پر رعب جمانے کو بڑھا چڑھا کر بتاتی تھی۔ میری سہیلیاں حیرانی سے مجھے دیکھتی رہ جاتیں۔ انہی بے وقوف لڑکوں میں ایک لڑکا جس کا نام ذوالفقار تھا' وہ مجھ سے عشق و محبت کے دعوے کرنے لگا تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ بن دیکھے اسے مجھ سے کیسے پیار ہو گیا ہے؟ ایک دن تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے اس کی کال آنے پر پوچھ لیا۔

''ذوالفقار' تم نے مجھے دیکھا تک نہیں ہے پھر کس طرح مجھ سے پیار ہو گیا ہے؟''

''کیوں' بغیر دیکھے پیار نہیں ہو سکتا؟'' وہ بولا۔

''ایک فلم میں، میں نے دیکھا ہے کہ ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے کو بغیر دیکھے پیار کرنے لگتے ہیں لیکن ایسا حقیقی زندگی میں نہیں ہوتا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اسی لیے میں تمہیں بغیر دیکھے پیار کر رہا ہوں تاکہ فلم والی بات حقیقی ہو جائے۔'' ذوالفقار قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''میں بہت کالی ہوں' بھینس سے زیادہ کالا رنگ ہے' کہیں ایسا نہ ہو مجھے دیکھ کر تمہارے ہوش اڑ جائیں اور تم پیار و محبت سے تائب ہو جاؤ؟'' میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''میرا محبوب ہرگز کالا نہیں ہو سکتا۔ تم ٹماٹر کی طرح سرخ و سفید ہو۔'' اس کی بات سن کر میں بری طرح چونکی۔ اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں ہے پھر وہ کیسے کہہ رہا ہے کہ میرا رنگ سرخ و سفید ہے؟ یہ بات اس نے بالکل درست کہی تھی۔

''ذوالفقار' تم نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے۔''

''کیا جھوٹ بولا ہے؟'' وہ بولا۔

''یہی کہ تم نے مجھے نہیں دیکھا' تم اپنی بات میں خود پھنس گئے ہو۔'' میں نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا۔

''ہاں' تم نے صحیح کہا' میں نے واقعی تمہیں دیکھا ہے نہ دیکھنے کی بات میں نے تفریحاً کہی تھی۔'' ذوالفقار نے اقرار کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یاد ہو گا کہ ایک دن تمہارا رکشہ ڈرائیور تمہیں لینے نہیں آیا تھا اور تم بس اسٹاپ پر گرمی سے بے حال ہو رہی تھیں۔ ایسے میں تمہاری کوئی پرانی سہیلی اچانک اسٹاپ پر آ گئی تھی اور پھر تم باتوں میں مگن ہو گئی تھیں۔ جب وہ جانے لگی تو تم نے اسے اپنا موبائل نمبر لکھوا دیا تھا۔ میں اس وقت تم سے دو قدم پیچھے کھڑا تھا۔ مجھے تمہارا موبائل نمبر یاد رہ گیا جو گھر آ کر میں نے لکھ لیا تھا۔''

''اوہ' تو وہ تم تھے۔ قسم سے' اسٹاپ پر جب تم مجھے گھور رہے تھے' بے اختیار میرا دل چاہ رہا تھا کہ تمہیں اینٹ دے ماروں اسی لیے میں نے تمہاری طرف پیٹھ کر لی تھی۔''

''اچھا ہوا' تم نے مجھے بتا دیا۔ مجھے تم سے ڈر لگنے لگا ہے۔ کیا اب ملاقات ہونے پر بھی اینٹ مارو گی؟'' ذوالفقار نے کہا۔

''اب ایسا کیسے کر سکتی ہوں؟ اس دن کی بات اور تھی' اب بات اور ہے۔''

''خدا کا شکر ہے' میں اینٹ کھانے سے بچ گیا۔'' وہ شوخی سے بولا۔

ذوالفقار اپنی محبت کا اظہار اس طرح کرتا تھا کہ میرے کہنے سے پہلے ہی ایڈوانس میں بیلنس بھیج دیتا۔ ایک ماہ تک ہماری بات چیت موبائل پر چلتی رہی۔ ذوالفقار کی خواہش تھی کہ میں اس سے پارک یا ہوٹل میں ملاقات کروں۔ اس کی خواہش پر میں خوفزدہ تھی لیکن میرے دل میں بھی اس سے ملنے کی شدید خواہش تھی۔ جب اس کا اصرار زیادہ بڑھا تو



ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کبھی جوس، کولڈ ڈرنک پینے کے بہانے کسی لکا اسٹال پر تو کبھی پارک میں ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں۔ عہد و پیمان ہوئے پھر ایک روز اس کے سنہری خوابوں میں گم ہو کر میں نے گھر کی دہلیز پار کر لی۔ وہ شادی کے بہانے مجھے حیدر آباد سے کراچی لے آیا۔ ایک ہفتے تک ہم نے ہوٹل میں قیام کیا' وہ روز مجھے کورٹ لے جا کر نکاح کرنے کا وعدہ کرتا لیکن صبح وکیل کے مصروف ہونے کا بہانہ کر کے واپس آ جاتا۔ مجھے بھی اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ نکاح نہیں کرے گا۔ اسے میرے جسم سے کھیلنے کا شوق تھا' وہ پورا ہو رہا تھا۔ میں نے اسے اپنا مان کر عزت سمیت اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیا تھا۔

ایک رات اس کی کمینگی کا راز مجھ پر کھل گیا۔ وہ سمجھا کہ میں سو رہی ہوں لیکن جان بوجھ کر میں سوئی ہوئی بنی تھی۔ وہ موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ میرے کان اس کی باتوں پر ہی لگے ہوئے تھے۔

''ہاں' ہاں' بڑا بہترین مال ہے' میں خود روز عیش کر رہا ہوں۔ تمہاری طبیعت خوش ہو جائے گی۔ ارے میری جان ..... میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ دو ہفتے تک اس کو اپنے پاس رکھوں۔ ایک ہفتہ ہے میرے پاس جس دوست کو بھی خوش ہونا ہے' وہ آ جائے پھر موقع نہیں ملے گا۔ میری ایک دلال سے بات چل رہی ہے۔ ایک لاکھ روپے میں سودا طے ہو گیا ہے۔ اگلے ہفتے وہ پیسے دے کر مال لے جائے گا پھر تم سوچتے رہ جانا۔ اچھا' اچھا' کل رات ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے' میں اسے بہانے سے تمہارے بنگلے پر لے آؤں گا۔'' ذوالفقار نے کہتے ہوئے کال منقطع کر دی۔

میں اس کے خوف ناک ارادے کو جان گئی تھی لیکن خاموشی سے لیٹی رہی۔ صبح ہوتے ہی اس سے

# غزل

چپ چاپ سہے زخم' شکایت بھی نہیں کی
اس دل نے مرے تجھ سے بغاوت بھی نہیں کی

آسائشیں کچھ حد سے سوا ہوں گی تبھی تو
اس شخص نے جانے کی جسارت بھی نہیں کی

آنکھوں میں بھی لے آیا سوالوں کا خزینہ
پوچھا تو کوئی اس نے وضاحت بھی نہیں کی

دنیا نے مجھے غم کے سوا کچھ نہ دیا تھا
دنیا سے وضاحت کی جسارت بھی نہیں کی

شاہد کی بھی اک بار تو پرچھائیاں آئیں
اے آئینے' تو نے تو حفاظت بھی نہیں کی

شاہد قریشی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہلے کہ ذوالفقار جاگتا' میں باہر نکل گئی۔ رات بھر میں سکون سے سو نہیں سکی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ میں دہاڑیں مار مار کر روؤں۔ میرا سب کچھ لٹ گیا تھا' عزت گئی' گھر سے بے گھر ہو گئی تھی' مجھے گھر والے قبول نہیں کرتے' گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ یہی کچھ میرے ساتھ ہوا تھا۔ سارا دن کراچی کی سڑکوں اور بازاروں میں گھومتی رہی۔ رات کی تاریکی کے سائے منڈلانے پر میری ہمت جواب دے گئی اور میں تھک کر آپ کی بس میں بیٹھ گئی۔ آپ کو دیکھ کر پتا نہیں کیوں لگا کہ مجھے تحفظ دینے والا شخص مل گیا ہے اور یوں میں آپ کے گھر آ گئی۔ یہ ہے میری کہانی۔ اگر پھر بھی آپ کو میری بات کا یقین نہ آئے تو میں اپنے حیدرآباد کے گھر کا پتا دے دیتی ہوں' آپ اپنے طور پر میرے بارے میں تحقیق کر سکتے ہو پھر آپ کا جو بھی فیصلہ ہو گا' مجھے منظور ہو گا۔''

گلنار جو کہ شبانہ تھی' اس کے دیئے پتے پر میں حیدرآباد گیا۔ یہ اتفاق تھا کہ اس محلے میں میرے بچپن کا دوست قاسم مل گیا۔ اس کی زبانی علم ہوا کہ شبانہ بہت نیک لڑکی ہے لیکن کسی سے موبائل پر دوستی ہو جانے پر وہ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ گھر والے کسی صورت راضی نہیں تھے اس لیے وہ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ گھر والے بہت غصے میں تھے' وہ اب کسی صورت شبانہ کی شکل دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ شبانہ کا بھائی نعمان اپنی بہن کے خون کا پیاسا تھا' وہ اسے قتل کر دینا چاہتا تھا۔

شبانہ کے حالات سن کر مجھے اس پر ترس آ رہا تھا کہ اس کی ذرا سی نادانی نے اسے کس حال پر پہنچا دیا تھا۔ اس کے ماں باپ اس کی صورت دیکھنا گوارہ نہیں کر رہے تھے۔ بھائی اس کی جان کا دشمن بن گیا تھا۔ اگر میں اسے گھر سے نکال دیتا تو وہ کسی بھی عصمت فروشی کے دھندے میں ملوث افراد کے ہتھے چڑھ کر ساری زندگی بیتی رہتی۔ اپنا ہمدرد سمجھ کر اس نے اپنے بارے میں مجھے سب کچھ بتا دیا تھا اور پھر میں نے خاصی سوچ بچار کے بعد ایک فیصلہ کر لیا۔ شبانہ کو ایک مضبوط سہارے کی ضرورت تھی اور میں اس کا سہارا بن گیا۔

میری شادی کو چار سال ہو گئے ہیں۔ میں دو لڑکے اور ایک لڑکی کا باپ بن چکا ہوں۔ شبانہ کے ماں باپ جو اس کی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے' وہ بھائی جو اس کو قتل کرنا چاہتا تھا' وہ سب اسے معاف کر چکے ہیں اور میرا بہت احترام کرتے ہیں کہ میں نے ان کی بیٹی کو گھر کی عزت و زینت بنا لیا تھا۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھ جیسے گناہ گار کو اس نے اس نیکی کے قابل سمجھا اور مجھے ایک خوب صورت بیوی کا شوہر بنا دیا ہے۔ میں اس کی خوب صورتی کے سامنے ایک واجبی صورت کا آدمی ہوں۔ حور کے سامنے لنگور والا معاملہ ہے۔ میرا مستقبل شاندار نہیں لیکن میرے بچے پڑھ رہے ہیں۔ ان کی ذہانت دیکھ کر مجھے امید ہے کہ وہ بڑے آدمی بنیں گے۔ یقیناً ان کی کامیابی کے پیچھے شبانہ کی محنت بھی شامل ہو گی۔

البتہ ایک بات ہے' میں جب بھی کسی نوجوان لڑکی کے ہاتھ میں موبائل فون دیکھتا ہوں تو لرز کر رہ جاتا ہوں اور میرے دل سے یہی دُعا نکلتی ہے کہ خدا اس معصوم کلی کو کسی ہوس پرست سے محفوظ رکھے۔ اگر آپ کی کوئی بہن یا بیٹی ہے تو خدارا' اس کے ہاتھ میں موبائل نہ تھمائیں کیونکہ یہ ایسا جدید جھرونکا ہے جس کے ذریعے ہر لچا' لفنگا آپ کے گھر میں جھانک سکتا ہے اور آپ کی عزت سے کھیل سکتا ہے۔ اگر کسی مجبوری کے باعث انہیں یہ فتنہ گر چیز دینا ضروری ہے تو ان پر دشمن کی سی نگاہ رکھیں۔

)(●)(





ندا ہاشمی

# واہ عجیب قینچی

نسرین فکہت سبزواری کا خیال

اپنے بندوں سے تجھے پیار بہت ہے لیکن
ستم انسان کا انساں پہ گوارا کیوں ہے

**سفلی علم اور جادو ٹونے کی کارستانیوں کا شاخسانہ ایک عجیب قصہ**

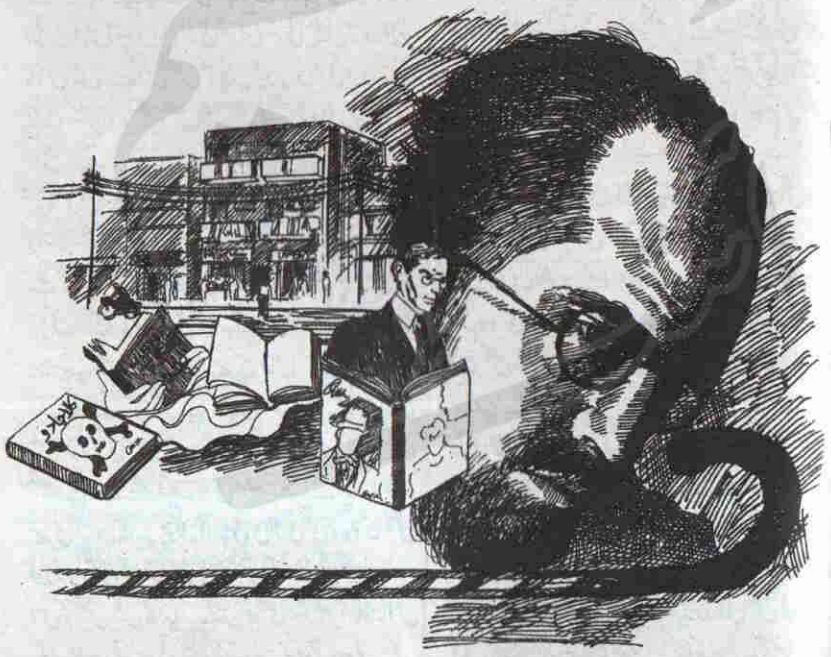



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آج بھی وہ بھیانک حادثہ میرے ہوش اڑا دیتا ہے کہ جس کی وجہ سے میری سب سے عزیز ترین ہستی زندہ درگور ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ ہستی میری سہیلی' میری خالہ زاد بہن نادیہ ہے۔ ہم دونوں ایک ہی عمر کے تھے لہٰذا ہماری دوستی ہونا فطری سی بات تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہماری دوستی گہری ہوتی چلی گئی اور ہم میں سگی بہنوں جیسا پیار ہو گیا پھر ایک ایسا ناگہانی واقعہ پیش آیا کہ میری سہیلی مفلوج ہو کر رہ گئی۔

اس وقت ہم کوئی چودہ یا پندرہ برس کے ہوں گے جب اس حادثہ نے ہماری زندگیوں کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ ہم دونوں بہنیں اپنی خالہ کے گھر جا رہے تھے۔ خالہ جان کا گھر ہمارے گھر سے خاصا نزدیک تھا اسی لیے ہماری اماں نے ہمیں اکیلے جانے کی اجازت دے ہی دی ورنہ ہماری اماں' بچوں کی کڑی نگرانی کرتی تھیں۔ وہ ان ماؤں میں سے نہیں تھیں جنہیں بچوں کی کوئی پروا نہیں ہوتی لیکن وہ کہتے ہیں ناں کہ ہونے والی چیز ہو کر رہتی ہے۔

اُس روز ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ راستہ سنسان تھا اور ہم دونوں خوشی خوشی چلے جا رہے تھے کہ یکا یک ہم دونوں کی نظر ایک قینچی پر پڑی جو سڑک کے ساتھ پڑی تھی۔ میں نے اس قینچی کو اٹھانا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ میری اماں نے یہ سکھایا تھا کہ راہ چلتے کسی بھی چیز کو نہیں اٹھانا چاہیے اور آج میں اماں کی اس بات کو سلام کرتی ہوں کہ اُن کی نصیحت نے مجھے ایک بڑی مصیبت سے بچا لیا تھا۔ میری کزن نادیہ چونکہ لاابالی سی لڑکی تھی' وہ فوراً جھکی اور اس قینچی کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگی مگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکی اور پھر آناً فاناً اس کی حالت غیر ہوتی چلی گئی۔ وہ بے ہوش ہو کر سڑک پر گر پڑی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں حواس باختہ سی ہو گئی اور چلا چلا کر لوگوں کو مدد کے لیے پکارنے لگی۔

کچھ ہی دیر میں ہمارے گرد خاصے لوگ جمع ہو گئے اور پھر نادیہ کو اٹھا کر گھر لایا گیا۔ گھر والے نادیہ کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ انہوں نے مجھے گھیر لیا اور تفتیشی انداز میں پوچھ گچھ کرنے لگے کہ آخر ایسا کیا ہوا؟ نادیہ کی حالت اتنی بگڑ گئی؟ اپنی دانست میں میری سمجھ میں جو کچھ بھی آیا' میں نے گھر والوں کو بتا دیا کہ کس طرح ہم جا رہے تھے' نادیہ سڑک پر پڑی اس قینچی کو اٹھانے کے لیے جھکی اور پھر اس کی حالت خراب ہوتی گئی۔ گھر والوں کا خیال تھا کہ نادیہ کو کوئی دورہ پڑا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے لیکن اصل معاملہ ہمیں شاہ صاحب نے بتایا۔

شاہ صاحب ہمارے محلے میں رہتے تھے اور عبادت گزار' متقی پرہیزگار شخص تھے اور محلے کی مسجد کے امام تھے۔ نادیہ کی حالت کے پیشِ نظر کوئی انہیں بلا کر لے آیا تھا کیونکہ انہیں رُوحانی علوم پر بھی دسترس حاصل تھی۔

شاہ صاحب کے مطابق' نادیہ کی حالت کی وجہ اُس کی ایک معمولی غفلت تھی۔ شاہ صاحب نے نادیہ کو ایک نظر دیکھتے ہی اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کسی شیطانی عمل کے زیرِ اثر ہے۔ شاہ صاحب نے بھی مجھ سے اس حادثہ کے بارے میں پوچھا تو میں نے تمام ماجرہ من و عن کہہ سنایا۔ شاہ صاحب قینچی کا ذکر سن کر چونک گئے کہ جیسے ان پر کچھ آشکار ہو گیا ہو پھر شاہ صاحب میرے ساتھ اسی جگہ گئے جہاں وہ قینچی پڑی ملی تھی' وہ منحوس قینچی اب بھی وہیں موجود تھی۔ شاہ صاحب نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا اور پھر اس قینچی کو اٹھایا' ایک سفید رومال میں لپیٹا اور ایک دھاگے سے باندھ کر اپنے ایک مرید کو تھمائی کہ



یہ قینچی سمندر برد کر دی جائے۔ اس کے بعد وہ پھر گھر لوٹے اور ایک پیالے پر دَم پڑھ پڑھ کر پھونکتے رہے۔ اس سارے عمل کے دوران ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ کوئی غیر مرئی قوت تھی جس کی وجہ سے شاہ صاحب پر بھی نیند غالب ہونے لگتی اور نادیہ بھی بے قابو ہو جاتی لیکن اس کے باوجود شاہ صاحب نے پوری رات بیٹھ کر اپنا عمل مکمل کیا اور علی الصباح نادیہ کو وہ دَم کیا ہوا پانی پلایا۔ وہ زود اثر پانی پیتے ہی نادیہ کا جنون تھم سا گیا اور وہ ایسی پرسکون نیند سو گئی جیسے برسوں سے جاگتی رہی ہو۔ اس دوران گھر کے کسی بھی فرد کو شاہ صاحب سے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ آخر یہ معاملہ کیا تھا؟ سب ہی کو شاہ صاحب کی قابلیت اور علم پر مکمل بھروسہ تھا اسی لیے سب گھر والے خاموشی سے نادیہ کے جاگنے کا انتظار کر رہے تھے جبکہ شاہ صاحب گہری خاموشی اختیار کیے ہوئے خلا میں گھورے جا رہے تھے۔ جب نادیہ کو ہوش آیا تو خدا کے کرم سے وہ بالکل ہشاش بشاش اٹھی تھی۔ گھر والوں نے پہلی فرصت میں شکرانے کے نوافل ادا کیے اور شاہ صاحب بھی اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گئے اور خدا کا شکر ادا کرنے لگے۔ کافی دیر بعد جب وہ سجدہ سے اٹھے تو سب ہی نے شاہ صاحب سے اس واقعہ کے بارے میں دریافت کیا۔

شاہ صاحب کے مطابق' یہ سارا قصہ اس گندے عمل کا شاخسانہ تھا جو اس قینچی پر کیا گیا تھا جسے اٹھانے کی کوشش نادیہ نے کی تھی۔ نادیہ سے پوچھا گیا کہ کیا ہوا تھا؟ تو نادیہ نے کہنا شروع کیا۔ ''جب میں اس قینچی کو اٹھانے کی کوشش میں جھکی تو وہ قینچی اس قدر بھاری ہوتی چلی گئی کہ جیسے زمین اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہو اور اسے چھوڑنے کے لیے تیار ہی نہ ہو اور پھر مجھے اپنے اردگرد کا ہوش ہی نہیں رہا.....''

## استغناء

استغناء سے مراد صرف یہ نہیں کہ آدمی پیسے کی طرف سے بے نیاز ہو جائے۔ روپے' پیسے اور خواہشات سے کوئی بندہ بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ضروریاتِ زندگی اور متعلقین کی کفالت ایک لازمی امر ہے اور اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ استغناء سے مراد یہ ہے کہ آدمی جو کچھ کرے' اس عمل میں اس کے ساتھ اللہ کی خوشنودی ہو اور اس کے طرزِ فکر یا عمل سے اللہ کی مخلوق کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچے۔ ہر بندہ خوش رہے اور نوعِ انسانی کے لیے مصیبت اور آزار کا سبب نہ بنے۔ ضروری ہے کہ بندے کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو کہ کائنات میں موجود ہر شے کا مالک اللہ ہے۔

بحوالہ: ''محبوب بغل میں'' خواجہ شمس الدین عظیمی

شاہ صاحب نے بھی نادیہ کی باتیں سنیں اور ایک لمبی سانس بھر کر گویا ہوئے۔ ''اکثر کمزور ایمان کے لوگ اپنے معمولی فائدوں کے لیے اس طرح کے سفلی عملیات کرواتے ہیں' ایسے عملیات زیادہ تر نئے کپڑوں' کسی قبر کی تازہ مٹی' انسانی ہڈی' انڈوں اور لوہے کی چیزوں پر کر کے بیچ راستے یا چوراہے پر پھینک دیئے جاتے ہیں۔ خدا ایسے عمل کرنے والوں کو ہدایت عطا فرمائے۔'' شاہ صاحب کی دُعا پر سب نے یک زبان ہو کر صدقِ دل سے آمین کہا تھا۔

میں اپنی ماں کی شکر گزار ہوں کہ اُن کی تربیت نے مجھے ایک انتہائی سنگین غفلت سے بچا لیا۔ اس حادثہ کے بداثرات کی وجہ سے نادیہ آج تک پوری طرح صحت یاب نہیں ہو پائی ہے۔ اکثر اسے دورے پڑتے ہیں۔ آپ سب قارئین دُعا کریں کہ وہ مکمل صحت یاب ہو جائے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فوزیہ

# یہ گھر ہمارا ہے

رسا چغتائی کا خیال

بہر صورت ہے ہر صورت اضافی
نظر آتا ہے جو ویسا نہیں ہے

**ایک ایسے خالی ویران گھر کا احوال، جو خالی بھی نہیں تھا**

ہمارے گھر کے سامنے والے مکان میں کچھ عرصہ پہلے ایک فیملی آ کر آباد ہوئی جس کا تعلق حیدر آباد سے تھا۔ میاں، بیوی، دو بیٹے اور تین بیٹیوں سمیت یہ خاندان سات نفوس پر مشتمل تھا۔ بچوں میں سب بڑی دو بیٹیاں تھیں پھر دو بہن بھائی، آخر میں چھوٹا بیٹا تھا۔ ان کی امی کا نام فردوس تھا۔ ہم لوگ انہیں بھابھی کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ بہت اچھے اخلاق کی مالک تھیں اسی لیے جلد ہی ہم لوگوں سے بے تکلف ہوگئی تھیں۔ ہر وقت ان کا ہمارے یہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ان کا چھوٹا بیٹا تو زیادہ تر ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا، اسی وجہ سے بھابھی نے اسے ہمارے گھر پڑھنے بٹھا دیا تھا۔ لاڈلہ ہونے کے باوجود دوسرے بچوں کی نسبت وہ خوشی خوشی پڑھنے آتا تھا۔ چند روز میں ہی وہ ہم سے بہت مانوس ہوگیا تھا۔ اگر کسی بات پر اس کو امی سے ڈانٹ پڑتی تو وہ اس کی شکایت ہم سے کرتا تھا۔ اس کی معصوم باتیں ہمیں بے حد پسند تھیں۔

ان نئے کرائے داروں کے ہاں ہم بھی ہفتے میں چکر لگا لیا کرتے تھے۔ شروع میں بھابھی بھی اکثر آیا کرتی تھیں پھر ان کا بھی آنا کم ہوگیا۔

ایک دن جب شارق آیا تو چپ چپ سا تھا۔ میں نے مذاق میں پوچھا۔ ”لگتا ہے، آج امی سے ڈانٹ پڑی ہے؟“

”نہیں باجی.....! امی نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔“

”پھر کیا بات ہے، منہ لٹکا ہوا کیوں ہے؟“

”باجی.....! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ روز رات کو ہمارے گھر ایک موٹی سی کالی سی عورت آتی ہے.....“

”پھر کیا ہوا تو.....؟“

”کل جب وہ آئی تو مجھے گھور رہی تھیں پھر وہ کہنے لگیں۔ ’ادھر آؤ‘۔ میں اس آنٹی کے پاس نہیں گیا، مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔ میں نے امی کو بتایا تھا امی نے کہا کہ تم خواب میں ڈر جاتے ہو۔ باجی..... آپ بھی اس کالی آنٹی کو دیکھ لیں گی تو ڈر جائیں گی۔“

”نہیں بھئی، میں تو نہیں ڈروں گی، آپ بھی بہادر بچے ہو، آپ بھی مت ڈرنا۔“ میری بات پر وہ خاموش ہوگیا۔

اگلے دن شارق آیا تو اسے شدید بخار ہوا تھا۔



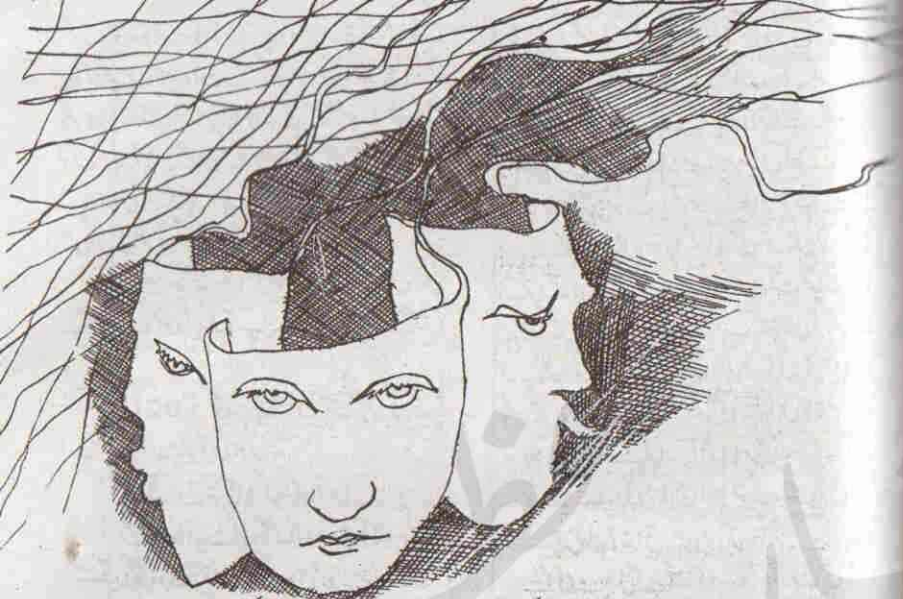

میں نے کہا۔ ”شارق بیٹا.....! جب آپ کی طبیعت خراب تھی تو آپ کیوں آئے؟“

”باجی.....! مجھے گھر میں ڈر لگتا ہے، وہ آنٹی تو دن میں بھی آنے لگی ہیں۔ کبھی امی کے پیچھے کھڑی ہوتی ہیں، کبھی گھر میں اِدھر اُدھر گھوم رہی ہوتی ہیں مگر امی انہیں کچھ نہیں کہتی ہیں۔ آپ امی سے کہیں، وہ آنٹی کو گھر سے نکال دیں، مجھے ان سے بہت ڈر لگتا ہے۔“ شارق کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا اس لیے میں نے ان کی امی سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا لیکن مجھے ان کے گھر جانے کا ٹائم نہ مل سکا۔ اگلے روز شارق کہنے لگا۔

”باجی.....! آپ امی سے بات کریں نا۔“

”ٹھیک ہے، میں آج شام کو ہی تمہارے گھر آتی ہوں۔“ لیکن اس شام ہمارے گھر مہمان آگئے اس کی وجہ سے میرا جانا پھر ٹل گیا۔ دوسرے دن شارق پڑھنے نہیں آیا تو میں سمجھی ناراض ہوگیا ہے۔ میں نے گھر کے کام وغیرہ سے فارغ ہوکر اپنی بہن کو ساتھ لیا اور ان کے گھر پہنچ گئی۔ دیکھا تو شارق سو رہا تھا۔ بھابھی نے بتایا کہ شارق کو رات سے بخار ہے دوا بھی کھائی تھی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ میں نے سوچا، شارق والی بات کا ذکر کروں مگر کشمکش میں تھی کہ نہیں، بھابھی کیا سوچیں۔ میرے چہرے پر تذبذب دیکھ کر وہ کہنے لگیں۔ ”کیا ہوا؟“ میں نے سوچا، شارق والی بات پوچھ ہی لوں۔

”بھابھی.....! کہیں ایسا تو نہیں، شارق کسی چیز سے ڈر گیا ہو؟“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو، وہ ہر وقت مجھے کسی کالی عورت کے بارے میں بتاتا ہے۔ میں سمجھتی تھی، شاید خواب میں دیکھا ہوگا مگر یہ تو مجھے کچھ اور ہی بات لگتی ہے۔ میں ان کے ابو کو پیش امام کے پاس بھیجوں گی تاکہ بچے کو کوئی تعویذ وغیرہ دیں۔“ میں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد گھر آ گئی۔ اس کے بعد شارق ہمارے گھر نہ آیا۔ مجھے کسی کام سے اپنی خالہ کے گھر جانا پڑ گیا۔ ایک ہفتے بعد آئی تو شارق کا خیال آیا مگر ٹائم نہ مل سکا پھر رمضان اور عید کے جھمیلوں میں تو اور بھی وقت نہ مل سکا۔ میں نے اپنے بھائی سے کہا کہ شارق کو لے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر آ جاؤ' وہ بہت یاد آ رہا ہے' وہ ان کے گھر گیا تو پتا چلا کہ گھر پر تالا پڑا ہوا ہے۔ تین چار دن بعد میں نے پھر بھائی کو بھیجا تو پھر تالا ملا۔ میں نے سوچا' شاید یہ لوگ حیدر آباد گئے ہوئے ہیں اس لیے میں نے پھر اپنے بھائی کو نہ بھیجا۔ ایک ڈیڑھ مہینہ یونہی گزر گیا' نہ میں ان کی طرف گئی اور نہ ہی وہ آئیں۔

ایک دن اچانک بھابھی ہمارے گھر آئیں' میں نے ان سے شکوہ کیا کہ آپ اتنے دن سے کیوں نہیں آئیں؟

"کیا بتاؤں' کن پریشانیوں میں گھر گئی تھی؟ اب سکون ملا ہے تو آئی ہوں۔"

"شارق کیسا ہے؟ وہ بھی نہیں آ رہا؟"

"ہم لوگ اب یہاں نہیں رہ رہے' اس لیے وہ کیسے آ سکتا ہے؟"

"آپ نے یہ گھر چھوڑ دیا اور ہمیں بتایا تک نہیں؟"

"گھر چھوڑنے کی بھی وجہ ہے' ہم یہ گھر کہاں چھوڑتے مگر ایسے عجیب وغریب واقعات ہونے لگے تھے کہ ہمیں ایسا کرنا پڑا۔ تمہیں تو پتا ہے' شارق نے ایک کالی عورت کا ذکر کیا تھا' میں نظر انداز کرتی رہی پھر شارق کی مسلسل بیماری اور اس کے بعد تو جیسے واقعات کی شروعات ہی ہو گئی' کبھی گھر کا سامان غائب ہوتا تو کبھی فرنیچر اپنی جگہ سے دوسری جگہ ملتا' حد تو یہ ہے کہ تھری پارٹس والی الماری پہلے کمرے سے دوسرے کمرے میں ملتی' فرج صحن میں رکھا ہوا تھا مگر اب وہ ڈرائنگ روم میں ملتا' الماری کے سارے کپڑے کٹے ہوئے ملتے' فرج میں رکھی کھانے پینے کی اشیاء غائب ہوتیں' رات کو گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا نظر آتا' ایسا لگتا تھا جیسے ہم دوسرے گھر میں آ گئے ہوں' یہاں تک کہ گھر کے در و دیوار کے کلر بھی بدل چکے ہوتے تھے' کبھی دیواریں گہرے کلر کی نظر آتیں تو کبھی ہلکے کلر کی' کبھی سرخ رنگ تو کبھی نیلا رنگ' دیواروں کے یہ مختلف رنگ گھر کے سب افراد نے دیکھے تھے۔ یہ ایسے واقعات تھے جن کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ میرے میاں کھانے میں نمک یا مرچ تیز ہونے یا کم ہونے کی اکثر شکایت کیا کرتے تھے اور میں سوچا کرتی تھی کہ میں تو کھانا بنانے کے بعد چکھتی ضرور ہوں' اُس وقت ٹھیک ہوتا ہے' بعد میں یہ کیوں ہوتا ہے؟ اب سمجھ میں آ گیا تھا کہ یہ کچھ اور ہی چکر تھا۔ ایک دن میری بڑی بیٹی صبا کچن میں روٹیاں بنا رہی تھی کہ کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔ اس نے کہا۔ "ابھی آ رہی ہوں۔" اس نے توے سے روٹی اتاری اور کمرے میں آئی اور مجھ سے پوچھا۔

"امی......! ابھی مجھے کسی نے آواز دی تھی' میں سمجھی تھی' باہر سے کوئی آیا ہے' اس نے مجھے بلایا ہے مگر یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے؟"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے' یہاں تو میرے علاوہ کوئی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"امی......! ابھی ابھی کسی نے میرا نام لے کر پکارا ہے؟"

"ارے بیٹا......! بعض اوقات انسان کو ایسا محسوس ہوتا ہے' تم جاؤ' روٹیاں بناؤ۔" حالانکہ میں سمجھ گئی تھی' ایسا ہوا ہوگا' کسی نے اُسے آواز دی ہو گی۔ ایسے واقعات ہونے کے باوجود جب ہم اس گھر میں ہی جمے رہے تو پھر مجھے خواب میں اکثر کوئی کہتا۔ "اس گھر کو خالی کر دو......" پہلے میں نے کوئی توجہ نہ دی لیکن جب یہی خواب اکثر نظر آنے لگا تو مجھے تشویش ہونے لگی۔ میں نے اس بات کا ذکر اپنے میاں سے کیا' انہوں نے ایک دو لوگوں سے کرائے کے گھر کی بات کی مگر اتنی جلدی گھر کہاں ملتے ہیں' ہماری پریشانی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی'

[میرا] بیٹا شارق دن بدن کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ ایک [رات] میں نے خواب میں دیکھا' کوئی میرے بیٹے کا [گلا دب]ا رہا ہے۔ میری آنکھ اسی وقت کھل گئی۔ دیکھا تو [شا]رق منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ میں نے [اپ]نے بیٹے پر دَم کیا اور خود بھی آیتیں پڑھتی رہی۔ [اگلے] دن شارق کو شدید بخار نے آ گھیرا تھا۔ میں [نے] اپنے میاں سے کہا۔ "خدا کے لیے' چاہے ایک [کم]رے کا گھر ہو' وہیں لے چلیں مگر اس گھر سے [نک]لیں۔" وہ خود بھی یہی چاہتے تھے۔ اس رات میں [سو ر]ہی تھی کہ خواب میں کسی نے کہا۔

"اپنے بیٹے کی خیریت چاہتی ہے تو یہاں سے [نک]ل جا ورنہ بہت نقصان اٹھانا پڑے گا۔" میں گھبرا کر [اٹھ] گئی' وہ رات میں نے جاگ کر گزاری۔

صبح اپنے میاں کو رات والی بات بتائی تو وہ کہنے [لگ]ے۔ "تم ایسا کرو' سامان پیک کرو' میرے دوست [نے] کرائے کا ایک گھر بتایا ہے' وہ اس قابل تو نہ تھا کہ [وہ]اں رہا جاتا مگر اب ایسی صورت میں وہاں جانے [کے] سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔" میں نے جلدی [ج]لدی اپنی بیٹیوں کے ساتھ مل کر سامان پیک کیا اور [اس]ی دن ہم نے یہ گھر چھوڑ دیا۔ جس گھر میں ہم لوگ [گئ]ے تھے' وہ بہت چھوٹا تھا لیکن جب تک کوئی بہتر گھر [نہ]یں ملتا' ہمیں یہیں رہنا تھا۔ اس گھر میں آنے کے [بعد] میرے بیٹے کی طبیعت بھی ٹھیک ہو گئی تھی البتہ کمزوری بہت زیادہ تھی۔"

میں ان واقعات کو سن کر حیران ہو رہی تھی کہ [آب]ادی کے بیچ میں موجود اس گھر میں بھی غیر مرئی [مخ]لوق کا بسیرا ہے؟ ایسا تو صرف ویرانوں کے حوالے [سے] سنا تھا۔ بھابھی کچھ دیر بیٹھی ہم سے باتیں کرتی [رہ]یں اور پھر اپنے گھر آنے کا کہہ کر چلی گئیں۔ وہ گھر [ج]س میں بھابھی رہتی تھیں' آج بھی خالی پڑا ہے۔ [ا]ب دیکھو' اس گھر میں کون رہنے کے لیے آتا ہے [ج]س میں پہلے ہی نادیدہ مخلوق مقیم ہے؟

## اٹھارہ نہیں' بیس

حضرت رابعہ بصریؒ خدا رسیدہ خاتون تھیں۔ دن رات عبادت میں مشغول رہتی تھیں۔ ایک رات وہ کھانا شروع کرنے والی تھیں کہ دو مہمان آ گئے۔ رابعہؒ کے پاس صرف دو روٹیاں تھیں' سوچنے لگیں کہ مہمانوں کے سامنے یہ روٹیاں کیسے رکھوں؟ ٹھیک اُسی وقت ایک فقیر نے صدا دی۔ رابعہؒ نے دونوں روٹیاں فقیر کی جھولی میں ڈال دیں۔ مہمان بھوک سے بے تاب تھے' رابعہؒ کی سخاوت پر جز بز ہوئے۔

تھوڑی دیر بعد پڑوس کے کسی مکان سے ایک خادمہ بہت سا کھانا لے کر رابعہ بصریؒ کے ہاں پہنچی اور کہنے لگی۔ "میری مالکہ نے یہ کھانا آپ کے لیے بھیجا ہے۔" رابعہؒ نے روٹیاں گنیں' اٹھارہ تھیں۔ انہوں نے واپس کرتے ہوئے کہا۔ "تم سے غلطی ہوئی ہے' یہ کھانا مجھے نہیں بھیجا گیا۔"

خادمہ نے بہت کہا۔ "آپ ہی کے لیے بھیجا گیا ہے۔" لیکن رابعہ نہیں مانیں۔ خادمہ کھانا واپس لے گئی اور تھوڑی دیر میں پھر کھانا لے کر آ گئی۔

اس دفعہ رابعہؒ نے روٹیاں گنیں تو بیس تھیں۔ انہوں نے خادمہ کا شکریہ ادا کیا اور روٹیاں رکھ لیں۔ مہمانوں کو تعجب ہوا اور اس سلسلے میں پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟

رابعہ نے کہا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم کھانا' کھانا چاہتے ہو۔ میرے پاس صرف دو روٹیاں تھیں' وہ میں نے فقیر کو دے دیں اور اللہ کی بارگاہ میں دُعا کی۔ "پروردگار! تیری راہ میں اگر کوئی ایک روٹی دیتا ہے تو اس کے بدلے اسے دس روٹیاں عطا کرتا ہے۔ میں نے تیری راہ میں دو روٹیاں دی ہیں۔ مجھے بیس روٹیاں عطا فرما تا کہ اپنے مہمانوں کا پیٹ بھر سکوں۔"

"پیسی رابعہ" ۔ سید امداد علی





Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مسز ثمینہ محمد سلیم

# ایک عقیدہ

شہاب الدین شہاب کا خیال

یقیں نہ ہو تو گماں کے ہزار پہلو ہیں
جو ہو چکا ہے، ہوا ہے مگر ہوا کے نہیں

**عقیدے سے جڑی عجیب کہانی، ممکن ہے آپ اس سے اتفاق نہ کریں**

حضرت امام حسینؓ نواسۂ رسول ﷺ ہیں۔ ہر مسلمان کا یہ پکا اور کامل بھروسہ ہے کہ اگر ان کے توسط سے کوئی دُعا یا منت مانیں تو ضرور پوری ہوتی ہے۔ اگر بالفرض پوری نہ ہو تو اِس میں رَبِ کریم کی کوئی حکومت ہوتی ہے۔

میری باجی رخسانہ کی شادی ۲۰ اگست ۱۹۸۰ء کو

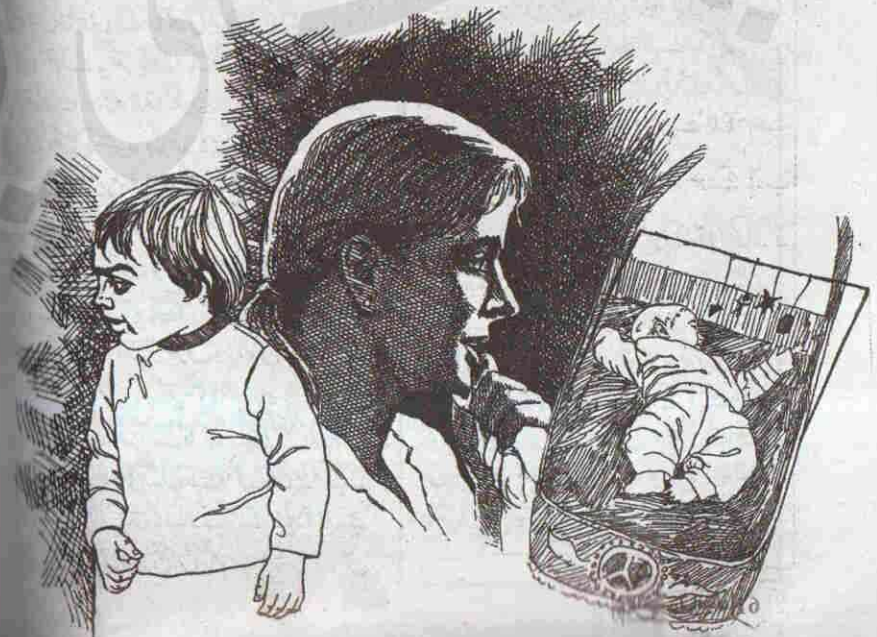

ہوئی۔ شادی کے ایک سال بعد باجی کے گھر ایک بیٹے کا جنم ہوا۔ پیدائش کے وقت بچہ بالکل تندرست تھا مگر وہ صرف تین ماہ زندہ رہا۔ یہ تین ماہ بھی اس کی بیماری کی نذر ہو گئے۔ اللہ کی مرضی جان کر سب رو دھو کر چپ ہو گئے۔ اگلے برس باجی کے گھر ایک بیٹی کی ولادت ہوئی۔ وہ بھی صرف دو ماہ زندہ رہی پھر اس کے اگلے برس باجی کے گھر ایک بیٹا پیدا ہوا مگر وہ صرف ۷ دن میں دنیا چھوڑ گیا۔ تین بچوں کی موت پر باجی نہایت دلبرداشتہ اور چڑچڑی سی ہو گئی تھیں۔ ۱۹۸۵ء میں باجی جب پھر امید سے ہوئیں تو ہماری امی نے ہونے والے بچے کی لمبی عمر کے لیے منت مانی کہ وہ بچے کو ایک برس تک حضرت امام حسینؓ کا فقیر بنائیں گی یعنی ایک سال تک اسے دن میں ایک بار کسی سے مانگ کر کھلائیں گی۔ ۲ فروری ۱۹۸۵ء کو باجی کے گھر ایک بچی کی پیدائش ہوئی۔ باجی نے پورا سال اسے مانگ کر کھلایا۔ ۱۹۸۷ء میں باجی کی گود میں دوسری بیٹی آ گئی۔ امی نے اسے بھی حضرت امام حسینؓ کا فقیر بنایا اور وہ بھی اللہ کے کرم سے سلامت رہی۔

۱۹۸۹ء میں باجی کے گھر جب تیسری بیٹی کا جنم ہوا تو امی اسے بھی حضرت امام حسینؓ کا فقیر بنانے لگیں تو باجی نے کہا کہ امی.....! اسے حضرت امام حسینؓ کا فقیر مت منائیں۔ پورا سال لوگوں سے مانگنا بہت برا لگتا ہے مگر امی نہیں مانیں اور اسے حضرت امام حسینؓ کا فقیر بنا دیا۔ ۱۹۹۳ء میں اپریل کے مہینے میں باجی کے گھر ایک بیٹے کا جنم ہوا۔ باجی نے اس کا نام عبداللہ رکھا۔ بیٹے کی ولادت سے باجی اور بہنوئی بہت خوش ہوئے۔ اب کی بار امی، باجی کے بیٹے کو حضرت امام حسینؓ کا فقیر بنانے لگیں تو باجی نے سختی سے منع کر دیا کہ وہ اپنے لاڈلے بیٹے کو مانگ کر نہیں کھلائیں گی اور جانے کیوں امی بھی یہ کہہ کر چپ ہو گئیں کہ تمہاری مرضی۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا

## صلے علیؐ کے نام سے

زندگی جب ہو پریشاں گردشِ ایام سے
دل سکوں پاتا ہے بس صلے علیؐ کے نام سے
میری تو بس ہے شناسائی دُرودِ پاک سے
میں تو واقف ہی نہیں ہوں درد سے، آلام سے
میں نے تو رحمت کی بس ایک بوند مانگی تھی مگر
اک سمندر آ ملا مجھ جیسے تشنہ کام سے
مورتوں کو رخ کیے تھے دہر کے سارے عباد
عابدوں کی سمت بدلی آپؐ کے پیغام سے
آج پھر مائل ہیں ہم جھوٹے خداؤں کی طرف
آج پھر غافل ہیں ہم فرعون کے انجام سے
قیصر و کسریٰ کے کنگن کل ہمارے ہاتھ تھے
آج جانے کیوں ہیں بے دام سے، ناکام سے
سب کو غلبت حاضری کی ہے مگر سوئے اَدب
یہ نبیؐ کا شہر ہے، چلیے ذرا آرام سے
مدحتِ آقاؐ سے کچھ بچپاں ہے ورنہ شہر میں
جی رہے تھے ہم بھی نامعلوم سے، گمنام سے
نعت گوئی نے بہت ہی خاص ہم کو کر دیا
ورنہ عنایت ہم تو شاعر تھے بہت ہی عام سے

قاری عنایت



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا کہ جیسے ہی عبداللہ تین ماہ کا ہوا' اچانک بیمار ہو گیا۔ اسے تیز بخار اور دست ہوئے۔ پہلے تو محلے کے کلینک سے دوائی لی مگر کوئی فرق نہیں ہوا تب اسے اسپتال میں داخل کرنا پڑا مگر ڈاکٹروں کی لاکھ کوششوں کے باوجود نہ بخار اترا نہ دست کم ہوئے اور تندرست بچہ ایک ماہ میں سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ ہمارے بہنوئی کی بینک میں جاب تھی' وہ بینک کے توسط سے اپنے بچے کا بہتر سے بہتر علاج کروا رہے تھے مگر کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔

اُن دنوں کھارادر' کراچی کے علاقے میں حضرت امام حسینؓ کی نسبت سے ایک اسپتال ''معصومین'' تھا۔ اب اُس اسپتال کا وجود نہیں ہے۔ خیر' باجی کو کسی نے مشورہ دیا کہ بہت اچھا اسپتال ہے' تم عبداللہ کو وہاں لے جاؤ۔ باجی' بچے کو اس اسپتال میں لے گئیں۔ بچے کی طبیعت اتنی خراب تھی کہ اسے فوراً داخل کر لیا گیا۔ ''معصومین'' اسپتال میں عبداللہ کو نو دن ہو گئے مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔ باجی جس وارڈ میں تھیں' باجی کے ساتھ والے بیڈ پر ایک شیعہ عورت اپنی بہن کے ساتھ داخل تھی۔ ایک دن اُس نے باجی سے کہا کہ آج حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا دن ہے۔ میں امام بارگاہ جا رہی ہوں۔ تم بھی چلو۔ باجی نے کہا کہ ویسے تو ہم سنی ہیں' پر حضرت امام حسنؓ و حضرت امام حسینؓ پر تو جان بھی قربان ہے۔ میں ضرور چلتی مگر میرا بیٹا اکیلا ہے' ابھی اِس کے پاس کوئی نہیں ہے۔ باجی نے اسے کچھ پیسے دیئے کہ منت کی پیٹی میں ڈال دینا۔ وہ عورت جب واپس آئی تو اُس نے ایک دھاگہ باجی کو دیتے ہوئے کہا۔

''بچے کے گلے میں ڈال دو۔''

باجی نے ایسا ہی کیا۔ اس عورت نے باجی کو کہا کہ میں تمہارے بیٹے کو سال بھر کے لیے حضرت امام حسینؓ کا فقیر بنانے کی منت کر آئی ہوں۔ مولا چاہیں گے تو تمہارا بیٹا ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ سن کر باجی کو سکتہ سا ہو گیا۔ باجی رو رو کر اللہ اور اس کے رسولؐ سے اپنے کیے کی معافی مانگنے لگیں کہ انہوں نے پہلے ہی عبداللہ کو حضرت امام حسینؓ کا فقیر کیوں نہ بنایا؟ شام تک حیرت انگیز طور پر بچے کا بخار کافی حد تک کم ہو گیا اور دست بھی رک گئے۔ ڈاکٹر بھی اس معجزے پر حیران تھے۔ اگلے دن اللہ کی مرضی اور حضرت امام حسینؓ کی دُعا سے عبداللہ مکمل صحت یاب ہو گیا۔ عبداللہ کے بعد باجی کے کوئی اور اولاد نہیں ہوئی۔

اللہ کا شکر ہے' آج عبداللہ 17 برس کا ہو گیا ہے۔ باجی کی تینوں بچیاں بیاہ کر اپنے گھر چلی گئیں۔ عبداللہ کو صرف ایک سال کے لیے حضرت امام حسینؓ کا فقیر بنانے کی منت مانی گئی تھی مگر باجی آج بھی ہر سال محرم کے پورے مہینے میں عبداللہ کو مانگ کر کھلاتی ہیں۔

ممکن ہے' یہ چھوٹا سا واقعہ پڑھ کر آپ میں سے بہت سے لوگ طنزیہ مسکرا دیئے ہوں اور مجھے کم ایمان و عقیدے کی عورت سمجھ رہے ہوں مگر میں نے جو کچھ دیکھا' وہ بیان کر دیا ہے۔ آپ چاہیں کچھ بھی سوچیں یا سمجھیں مگر مجھے تو اللہ کے نیک بندوں پر عقیدہ اور ایمان ہے کہ ان کے وسیلے سے مانگی گئی دُعائیں بارگاہِ الٰہی میں کبھی رَد نہیں ہوتیں۔ البتہ ان کی قبولیت کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ نواسہ رسول ﷺ حضرت امام حسینؓ پر یقین نہ کرنا بھی میرے نزدیک کفر ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ توفیق عطا فرمائے کہ ہم نبی کریم ﷺ اور آپؐ کی آل سے محبت کریں اور ان پر مکمل بھروسہ کریں۔ (آمین!)





ارم زہرا

# خواب جو بکھر گئے

رسا چغتائی کا خیال

پھاندیے دیوار زنداں کس طرح
پھینکیے طوق و سلاسل کس طرف

**جرم بے گناہی کی سزا کاٹتے ایک معصوم نوجوان کی دکھوں بھری سچی روداد**

''اماں ......! کل شمع کی شادی ہے۔ مجھے نیا سوٹ چاہیے۔'' رضیہ نے لمبی سی چٹیا کو جوڑے کی شکل دیتے ہوئے کہا۔

''بڑی نیا سوٹ بنائے گی تو پھر مجھے بھی آپ سوٹ دلائیں۔'' فریدہ نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے رضیہ کو پھر ماں کو دیکھا۔

''ماں کے پاس تم دونوں کے سوٹ کے لیے بے کار پیسے نہیں' عقل کے ناخن لو۔'' پروین نے ماں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی سائیڈ لیتے ہوئے دونوں بڑی بہنوں کو گھورا۔

''اماں.....! جواب تو دیں' کیا واقعی شمع باجی کی شادی پر ہم پرانے کپڑے ہی پہنیں گے؟'' یہ چوتھے نمبر کی سکینہ تھی جو خاموش بیٹھی ماں کو اب کاندھا پکڑ کر جھنجھوڑ رہی تھی۔

''مجھے کچھ نہیں پتا۔'' بڑی سی سینی میں کول کول پیاز کاٹتی بخت بی بی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پیاز کی ترشی اُن کے اندرونی جذبات سے خوب میل کھا رہی تھی۔

''زینت وشوانی.....! اگر کمرے کی صفائی ہوگئی ہو تو صحن میں آجاؤ' میں صحن کی جھاڑو نہیں لگا رہی' آج کمر میں بہت درد ہے۔'' نسیم منہ بناتی ہوئی اب تخت کے کونے پر ٹک چکی تھی۔

''کیوں' کیوں نہیں کرنی تم نے صفائی؟ یاد ہے ناں' آج تمہاری باری ہے صفائی کی؟'' شوانی غصے سے دھاڑتی ہوئی کمرے سے نکلی تھی۔

''ارے' تم دونوں لڑنا بند کرو' کل شمع کی شادی ہے' ہم کیا پہنیں گے' ابھی یہی سمجھ نہیں رہا ہمیں اور تم دونوں ہمارے دماغ کی دہی نہ بناؤ۔'' رضیہ نے منہ بنایا اور ماں کے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔

''اچھی ماں.....! کچھ پیسے دے دو' میں اپنی سیلری پر تمہیں دے دوں گی۔ میری ساری دوستیں نت نئے ڈریس میں خوب تیار ہو کر آئیں گی اور ایک میں..... وہی چار سال پرانے کپڑے پہن کر جاؤں گی جن کا فیشن بھی اَب جا چکا ہے۔ نہیں بھئی' سب میرا مذاق اڑاتے ہیں۔'' رضیہ نے رونی صورت بناتے ہوئے کہا۔

''ہوں.....'' ہلکی سی ہوں کے ساتھ بخت بی بی نے سر اٹھا کر اپنی ساتوں بیٹیوں کو دیکھا۔ بخت بی بی کے لیے تو اُن کی ہر بیٹی کسی شہزادی سے کم نہیں تھی مگر اگلے ہی لمحے وہ ایک گہری سانس لے کر دوبارہ سر جھکا چکی تھیں۔ ''سبزیاں اور دالیں بھی اتنی مہنگی ہو چکی ہیں۔ غریب کھائے بھی تو کیا؟'' بیگن اور آلو کاٹتی ہوئی وہ اب بیٹیوں سے مخاطب تھیں۔

''ٹھیک ہے ماں.....! اگلے ماہ سے میں اپنی سیلری آپ کو نہیں دوں گی' جب میرا وقت آتا ہے کچھ بنانے کا تو سارے پیسے ختم ہو چکے ہوتے ہیں۔ آخر اتنی محنت سے کماتی ہوں اور اپنے اوپر کچھ خرچ بھی نہیں کر سکتی؟'' رضیہ نے باقاعدہ اپنا سر پیٹا اور بہتے آنسوؤں کو دوپٹے سے پونچھا۔

''کیوں بے کار ماں کو پریشان کر رہی ہو؟ سب کچھ تو جانتی ہو' یہاں پیٹ بھر کھانا میسر نہیں اور تم نئے کپڑوں کی فرمائش کر رہی ہو؟'' پروین نے ماں کے کندھے پر اپنا سر ٹکایا اور بے ساختہ ماں کے گال کا ایک بوسہ لے لیا۔

''یہ کیا بات ہوئی! پانچویں جماعت تک پڑھ پڑھ کر ہم سارے ہی گھر بیٹھتے چلے گئے' نہ اچھی تعلیم میسر ہے' نہ اچھے کپڑے' کھانا تو دور کی بات' میری تو زبان اب سادے کھانوں کی عادی ہو چکی ہے۔ مرغن غذائیں تو شاید ہماری قسمت میں ہی نہیں ہیں؟'' فریدہ نے پروین کو ٹوکا اور آنکھیں دکھائیں۔

''کل مزے دار بریانی اور قورمہ ملے گا ناں' خوب اپنی زبان اور دانتوں کو موقع دینا۔'' شوانی نے ہنستے ہوئے زینت کو آنکھ ماری تو قریب بیٹھی نسیم نے اس کی پیٹھ پر ایک ہاتھ جڑ دیا۔

''باجی رضیہ اپنی زبان کا ویسے ہی اتنا استعمال کرتی ہے کہ میں حیران ہوتی ہوں' ان کا منہ کیوں نہیں دُکھتا؟'' سکینہ نے ساری بہنوں پر ایک نظر ڈالی اور پھر رضیہ کی تنقیدی نظروں سے نظریں ملاتی' زبان دانتوں تلے دبا کر رہ گئی۔

''تم سب اب اپنے اپنے کاموں میں لگو' رضیہ' تم فریدہ کے ساتھ بھائی کے کپڑے دھلواؤ' یونس بھی گھر آتا ہوگا۔ پروین اور سکینہ' باورچی خانے میں



جاؤ اور جلدی سے سبزی بھون کر روٹی ڈال لو' صبح کا آٹا کافی بچا ہوا ہے۔'' بخت بی بی نے جلدی جلدی بیٹیوں کو حکم دیا۔

''جی اچھا ماں.....!'' رضیہ کے ساتھ فریدہ' سکینہ اور پروین بھی اٹھ گئیں۔

''تم دونوں صفائی مکمل کرو۔'' زینت اور شوانی کی طرف وہ کڑی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''اے نواز سولنگی.....! تو کہاں مجھے اکیلا چھوڑ گیا؟ یہ تیری سات بیٹیاں' سات بھنور کی طرح ہیں' میں اکیلی کیسے اِن کو پار لگاؤں گی؟'' آنسو تھے کہ تواتر سے بہے جا رہے تھے۔

خواہشاتِ زندگی کے حصول کا سامان اتنا آسان نہیں تھا۔ مہنگائی اور پھر سات بیٹیوں کا خرچہ' باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔ ایک اکلوتا بھائی' وہ بھی نوکری کے لیے دردر کی ٹھوکریں کھا کر اب گھر لوٹا تھا۔

''سلام ماں.....!'' یوسف نظریں جھکا کے گھر میں داخل ہوا تھا۔

''آج بھی ناکام لوٹا ہے؟'' بخت بی بی کے چہرے پر فکر کے سائے منڈلا رہے تھے۔

''ماں! یہ مزدوری کے کچھ پیسے رکھ لو' کام تو آج بھی نہیں ملا۔'' یوسف نے کچھ نوٹ ماں کی جانب بڑھائے تھے۔

''چل' شکر ادا کر۔'' بخت بی بی نے نوٹ مٹھی میں دباتے ہوئے کہا تھا۔

''ماں.....! مجھے پکا کام کب ملے گا؟ بہت تھک گیا ہوں' اینٹیں اٹھاتا' سیمنٹ کی بوریاں تیسری منزل تک پہنچا پہنچا کر میرا حال برا ہو گیا ہے۔'' یوسف اب ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔

''ہاں' میرے بچے.....! اللہ ہمارے حال پر رحم کرے گا' بس تم ہمت کبھی نہیں ہارنا۔'' بخت بی بی نے اکلوتے بیٹے کی پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

''ماں.....! ہمت کیسے ہاروں گا میں؟ جب تھکتا ہوں تو ساتوں بہنوں کا چہرہ میری نظروں کے سامنے آجاتا ہے اور پھر میں ساری ہمتیں مجتمع کیے کھڑا ہو جاتا ہوں۔''

''ہاں' میرے بچے.....! ہاں' میں سب جانتی ہوں۔ اللہ تمہیں ہمیشہ کامیاب کرے۔'' بخت بی بی نے ایک گہری سانس لی اور یوسف کی پیشانی پر اپنے لب رکھ دیے۔

.....

بڑے سے صحن اور ایک کمرے پر مشتمل گھر میں رضیہ کے رونے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

''یا الٰہی.....! خیر' اس طرح سے کیوں رو رہی ہے؟'' بخت بی بی بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔

''خیریت باجی.....؟'' فریدہ بھی پریشانی کے عالم میں کمرے میں داخل ہوئی۔

''آپی.....! کیا ہوا ہے؟ اس طرح سے کیوں رو رہی ہو؟'' پروین کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

## عظمت

تمہیں کسی کی ذات سے تکلیف پہنچے تو اسے بلا توقف معاف کر دو' اس لیے کہ انتقام بجائے خود ایک صعوبت ہے۔ انتقام کا جذبہ اعصاب کو مضمحل کر دیتا ہے۔ تم اگر کسی کی دل آزاری کا سبب بن جاؤ تو اس سے معافی مانگ لو' قطع اس کے کہ وہ تم سے چھوٹا ہے یا بڑا۔ اس لیے کہ جھکنے میں عظمت پوشیدہ ہے۔

بحوالہ: ''کشکول'' خواجہ شمس الدین عظیمی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کچھ بتائے گی بھی یہ؟" بخت بی بی نے دونوں بیٹیوں کو باری باری دیکھا اور پھر رضیہ کو گھورا جو اوندھے منہ بستر پر لیٹی زار و قطار رو رہی تھی۔

"باجی.....! کیا پریشانی ہے' کیوں اس طرح رو رہی ہو؟" فریدہ نے رضیہ کے کان کے قریب جا کر سوال کیا۔

"ہماری میڈیسن کمپنی کا مالک آج کہہ رہا تھا کہ آٹھویں پاس ورکرز کو وہ جاب سے نکال دے گا۔ کاش' ماں.....! میں میٹرک کر لیتی۔ آج میرے پاس سرٹیفکیٹ تو ہوتا' کہیں یہ جاب میرے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔" رضیہ کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اور سسکیوں نے بخت بی بی کے سینے پر کاری ضرب لگائی تھی۔

"ہائے..... خدا نہ کرے۔" وہ بے اختیار بولیں جبکہ فریدہ اور پروین بھی اپنی اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئیں۔

"اماں.....! اب کیا ہوگا؟ میں تو وہاں فریدہ کو رکھوانا چاہ رہی تھی مگر اب تو اپنی نوکری کے بھی لالے پڑ گئے ہیں؟" رضیہ جیسے مکمل طور پر ٹوٹ چکی تھی۔

"اچھا بچو.....! پانی تو پیو پہلے۔" سکینہ نے پانی کا گلاس رضیہ کی طرف بڑھایا تھا۔ ساری بہنیں اسے دلاسہ دے رہی تھیں جبکہ بخت بی بی متعجب سی رضیہ کو دیکھ رہی تھیں۔

"رضیہ اسی سال تیئیس کی ہو جائے گی' یہ عمر تو شادی کی ہوتی ہے۔ اپنا گھر کب بسائے گی یہ؟ نوکری کے چکر میں یہ اپنے بارے میں سوچتی ہی نہیں ہے لیکن پھر یہ میرا گھر کیسے چلے گا؟ رضیہ اور یوسف کی کمائی سے تو سفید پوشی کا بھرم ابھی باقی ہے۔" بخت بیگم جانے کیا کچھ سوچ رہی تھیں۔

"ماں.....! تم کیا سوچ رہی ہو؟" شوانی نے ماں کو مخاطب کیا۔

"کچھ نہیں۔" بخت بی بی نے ساتوں بیٹیوں کے سراپے پر نظریں ڈالیں اور پھر اگلے ہی لمحے سر تھام کر بیٹھ گئیں۔

"میں تو رضیہ کے بارے میں سوچ رہی تھی یہاں تو یہ ساری ہی تار کا جھاڑ ہو چکی ہیں۔ ان سب ہی کی عمر شادیوں کی ہے۔ کیسے ان کا بیاہ کروں گی؟"

"ماں.....! تم پریشان ہو گئی ہو ناں؟" پروین نے ماں کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔

"میری بچیاں.....! ماں کا دل چاہتا ہے' اس کے جگر کے ٹکڑے ہمیشہ خوش رہیں' انہیں سارے جہاں کا سکھ ملے' ہر آسائش ملے مگر یہ ماں مجبور ہے۔" آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔ اب رضیہ بھی گھبرا کر بیٹھ چکی تھی۔ ماں کی ایسی حالت اُس سے دیکھی نہ گئی۔

"ماں.....! میں کل اپنے باس سے بات کروں گی' انہیں اپنی مجبوری بتاؤں گی تو وہ ضرور مان جائیں گے۔ ماں.....! آپ کی بیٹی آپ کے ساتھ ہے آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔" رضیہ نے بے ساختہ بخت بی بی کو گلے سے لگا لیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں کمرے میں ماں اور ساتوں بہنوں کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔

"اماں.....! میں کراچی جا رہا ہوں۔" یکسر اپنی ذات میں مگن یوسف اپنی دھن میں بولتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

"کیا.....؟ کیوں.....؟ کس لیے؟" سب نے ایک ساتھ ہی سوال کیے جبکہ بخت بی بی سب کچھ بھول کر یوسف کے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کر چکی تھیں۔ "کیوں بچے.....؟"

"اماں.....! میرا دوست شہزاد کراچی سے آیا ہوا ہے' کہہ رہا ہے' یہاں حیدر آباد میں کچھ کام نہیں



کراچی چل میرے ساتھ' وہاں اتنا کام ہے کہ تو کر کر کے تھک جائے گا اور پھر تجھے بہنوں کی شادی بھی تو کرنی ہے؟ یہاں رہ کر تو کچھ نہیں کر سکتا۔" یوسف تیز تیز لہجے میں بتا رہا تھا۔

"اور تو نے ہامی بھر لی؟" بخت بی بی نے بے ساختہ سینے پر ہاتھ رکھا۔

"ہاں ماں.....! میں اب کراچی جا کر قسمت آزمائی کرنا چاہتا ہوں۔ سوچ رہا ہوں' شہزاد کے ساتھ ہی نکل جاؤں۔ وہ مجھے بھی اچھا گائیڈ کر دے گا۔" یوسف کے لہجے میں امید تھی۔

"بھائی! تم ہمارے بغیر کیسے رہو گے؟" نسیم نے بھائی کے گلے لگ کر پوچھا تھا۔

"ارے میری بہنا.....! جب تیرا بھائی وہاں سیٹ ہو جائے گا تو تجھے بھی وہیں بلا لے گا' تم سب پھر وہاں میرے ساتھ ہی رہنا۔" یوسف نے نسیم کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی تھی۔

"نہیں..... میرا دل نہیں مان رہا....." بخت بی بی نے برملا انکار کیا۔

"ارے ماں.....! سمجھا کر' میں کراچی میں پندرہ دن' ایک ماہ گزار لوں تو سب سمجھ آ جائے گا اور اگر بات نہیں بنی تو لوٹ آؤں گا۔ تجھے پتا ہے' شہزاد کے گھر کلر ٹی وی' فریج آ چکا ہے اور اس بار تو اُس نے چھوٹے بھائی کو نئی بائیک بھی دلائی ہے۔"

"اچھا.....؟" رضیہ نے اچھا کو لمبا کھینچا۔

"سچ' میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں اپنی بہنوں کی تمام خواہشات پوری کروں' ہمارے گھر بھی زمانے بھر کی آسائشیں ہوں' نت نئے پکوان پک رہے ہوں' بس ماں.....! ایک بار مجھے قسمت آزمانے کا موقع دے دو۔" یوسف کے لہجے میں التجا تھی۔

"ہاں' ہاں ماں.....! بھائی کراچی چلا گیا تو ہمارے دن پھر جائیں گے۔" رضیہ نے بہت یقین سے کہا تھا۔

"نہیں' میں بھائی کو جانے نہیں دوں گی۔" پروین نے بے ساختہ بھائی کا ہاتھ تھاما تھا۔

"پاگل..... بھائی جائے گا تو ہمیں بھی کچھ سکھ کے دن نصیب ہوں گے۔" فریدہ نے پروین کو ٹوکا۔

"تم خود کیوں نوکری نہیں کرتیں؟ بھائی یہاں بھی تو اتنی محنت کرتا ہے' وہاں بھائی کا خیال کون رکھے گا؟" پروین کے چہرے پر غصہ تھا۔

"ارے بھئی' میں اپنا خیال خود رکھ سکتا ہوں' تم سب پریشان کیوں ہو میرے لیے؟ اماں.....! تم بتاؤ' شہزاد پرسوں جا رہا ہے' اُس کو ابھی جواب دینا ہے؟" یوسف نے سوچوں میں ڈوبی ماں کو مخاطب کیا تھا۔

بخت بی بی نے ایک نظر ساری بیٹیوں کے چہرے پر ڈالی تھی۔ آنگن کے یہ مہکتے گلاب انہیں جی جان سے زیادہ عزیز تھے پھر وہ اکلوتے بیٹے کی جانب مڑی تھیں جو بہت منت و مرادوں کے بعد خدا نے اُن کو عطا کیا تھا۔

"ٹھیک ہے بیٹا.....! تم جاؤ۔" یہ کہتے ہوئے عجیب بے بسی تھی اُن کے چہرے پر۔ "اللہ تمہیں کامیاب کرے۔" یہ کہتے ہوئے وہ گھٹنوں میں سر دیئے بے اختیار رونے لگی تھیں۔

•.....•.....•.....•

"بھائی.....! تمہارا سارا سامان اس میں رکھ دیا ہے۔" رضیہ نے کپڑے کے بڑے سے بیگ کو صحن میں رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا بھائی.....! یہ میرے پاس دو سو روپے ہیں' یہ آپ رکھ لیں' ضرورت کے وقت کام آئیں گے۔" یہ کہہ کر پروین نے جلدی سے بھائی کی جیب میں روپے ڈال دیئے تھے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اور بھائی.....! یہ سب بہنوں کے کل ملا کر ہزار روپے۔ آپ ہماری طرف سے یہ رکھ لیجیے' جانے کہاں ان کی ضرورت پڑ جائے آپ کو؟" سب سے چھوٹی نسیم نے بھائی کی طرف پیسے بڑھائے تھے تو یوسف تڑپ اٹھا تھا۔

"میری پیاری بہنو.....! یہ پیسے تم ہی رکھو' میرے پیچھے اگر تمہیں ضرورت پڑ گئی تو کیا کرو گی؟ بس تم اپنے بھائی کے لیے دُعا کرنا کہ اچھی سی جاب پر لگ جائے۔" یوسف کے لہجے میں محبت بھری اداسی تھی۔

"ہاں' ہاں' ضرور لیکن پھر بھی یہ ہماری خوشی ہے' آپ رکھ لیں بلکہ جب آپ کی نوکری ہو جائے گی تو ہم ساری بہنیں آپ سے سود سمیت پیسے وصول کریں گی۔" شوانی نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"اچھا ماں! اب اجازت دو۔" یوسف نے ماں کو مخاطب کیا جو اپنی سوچوں میں کبھی ماضی کو تو کبھی آنے والے لمحوں کے تانے بانے بُن رہی تھیں۔

"بس بیٹا! اپنا بہت خیال رکھنا' وقت پر کھانا کھانا اور وقت پر سونا۔ کسی سے جھگڑا مت کرنا' بے کار کسی سے الجھنا نہیں' بس اپنے کام سے کام رکھنا۔"

"ارے ماں! میں بچہ تھوڑی ہوں جو آپ یوں مجھے سمجھا رہی ہیں؟" یوسف بے ساختہ ہنسا تھا۔

"اپنی ماں سے رابطے میں رہنا' ماں کا دل پریشان رہے گا' کراچی پہنچتے ہی سب سے پہلے مجھے فون کرنا بچے!" بخت بی بی بے اختیار رو پڑی تھیں۔

"ماں! آپ روئیں نہیں' میں آپ کے آنسوؤں کا مداوا تو بننے جا رہا ہوں' پکا وعدہ' جاتے ہی آپ سے رابطہ کروں گا۔ اچھا رضیہ.....! ایک کام تو کرنا۔" یوسف نے رضیہ کو مخاطب کیا تھا۔ "یہ پیسے تم رکھو' اس سے اپنے موبائل کی بیٹری بدل لینا' نئی بیٹری ڈل جائے گی تو لمبی بات ہو جائے گی۔ جب دیکھو' بیٹری کی وجہ سے تمہارا موبائل بند رہتا ہے۔ پتا چلا' میں وہاں سے کال کروں اور تمہارا موبائل مجھے بند ملے؟" یوسف نے خدشہ ظاہر کیا تھا تو رضیہ نے لپک کر پیسے اُس کے ہاتھ سے لے لیے تھے۔

"بھائی سے پیسے کیوں لیے؟ تمہارے پاس اتنے پیسے نہیں کہ نئی بیٹری خرید سکو؟" پروین نے رضیہ کو آنکھیں دکھائی تھیں اور ساتھ ہی ڈپٹا تھا۔

"کیوں' میرے پاس پیسے کہاں سے آئیں گے؟ ساری تنخواہ تو میں ماں کے ہاتھ پر رکھ چکی ہوں۔" رضیہ نے دوبدو جواب دیا تھا۔

"اچھا پیاری بہنو! اَب میں چلتا ہوں' تم سب اماں کا بہت خیال رکھنا۔" یوسف نے باری باری ساری بہنوں کو پیار کیا تھا اور آخر میں بخت بی بی کے پاس آیا تو وہ بیٹے کو گلے لگا کر رندھی ہوئی آواز میں بولی تھیں۔ "جاؤ میرے چاند! خدا تمہاری حفاظت کرے۔"

"یوسف! جلدی کرو' جانے میں دیر ہو رہی ہے۔" دروازے پر سے آنے والی شہزاد کی آواز پر وہ سب چونکے تھے۔

"اچھا ماں! خدا حافظ! سب اپنا خیال رکھنا۔" یوسف نے پہلے ایک نظر ماں کو اور پھر یکے بعد دیگرے ساری بہنوں کو دیکھا تھا اور تیزی سے نکل گیا تھا۔

•.....•.....•

"اماں! کراچی سے بھائی کا میسج آیا ہے' وہ شہزاد کے ساتھ ہی رہ رہا ہے' کوئی ملیر' سعود آباد کا علاقہ ہے۔" رضیہ نے موبائل اسکرین پر میسج دیکھتے ہوئے کہا۔

"شکر خدا کا' رہنے کا ٹھکانہ تو ملا میرے بچے کو۔ یہ بتا' کوئی نوکری وغیرہ کی خبر نہیں سنائی اُس نے؟"



بخت بی بی نے اداس لہجے میں دریافت کیا۔

"نہیں اماں! فقط ایک میسج ہی آیا ہے اور کچھ نہیں۔ میں تو بھائی کی آواز سننے کو بھی ترس گئی ہوں۔ پورا ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔" رضیہ کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

"کیا بھائی کا میسج آیا ہے' نوکری مل گئی اسے؟" شوانی بھاگتی ہوئی آئی تھی اور اب وہ رضیہ کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے کھڑی تھی۔

"نہیں' نوکری کا کچھ پتا نہیں لیکن بھائی' شہزاد بھائی کے ساتھ رہ رہا ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔" رضیہ نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تھا۔

"اماں! اب بھائی جب کمانے لگے گا تو مجھے تُو دو نئے سوٹ دلائے گی؟" رضیہ نے برجستہ ماں کو مخاطب کیا تھا۔

"اور میں تو لپ اسٹک کا نیا شیڈ لوں گی۔" شوانی جو حد درجہ میک اپ کی شوقین تھی' اُس نے اپنے مطلب کی بات کی۔

"ارے ہاں بھئی' ضرور' پہلے اُسے نوکری تو مل جائے۔ وہ وہاں سیٹ ہو جائے پھر تم بہنیں اپنے ارمان نکالتی رہنا۔" بخت بی بی نے دوپٹہ نماز کے انداز میں سر پر لپیٹا تھا اور مصلے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

•.....•.....•

"شہزاد یار.....! اب تو مجھے کراچی آئے ہفتے سے زیادہ ہو رہا ہے' کوئی بات بنی نہیں۔ یار.....! میں اپنی ساری جمع پونجی لے کر کراچی پہنچا ہوں' اگر کوئی تیرا جاننے والا ہے تو' تُو مجھے اُس سے ملا دے۔ کسی نوکری کا انتظام ہو جائے تو گھر والوں کو کچھ بھجواؤں۔" یوسف کا سر فکرمندی سے جھکا ہوا تھا اور وہ انگلیوں سے چٹائی کرید رہا تھا۔

"تجھے زیادہ تجربہ کس کام کا ہے؟" شہزاد نے اُس کے چہرے پر فکر دیکھ کر پوچھا۔

"یہی مزدوری کا۔" اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

"تو' تُو ایسا کر' تیار ہو جا' میں تجھے ٹھیکے دار صاحب سے ملواتا ہوں' یقیناً وہ تجھے کوئی کام دے دیں گے' میں آج کل اُن کے ساتھ پلاسٹر کا کام کر رہا ہوں تُو ابھی اسٹارٹ میں میرے ساتھ ہیلپر لگ جا' جب تجھے کام آ جائے گا تو ٹھیکے دار تجھے اچھی تنخواہ کے ساتھ کسی دوسری جگہ کام پر لگا دے گا۔"

"ہاں' یہ بہتر رہے گا تو پھر تم مجھے اپنے ٹھیکے دار صاحب سے ملواؤ۔" یوسف کو شہزاد کی بات سن کر جیسے امید کی ایک کرن نظر آئی تھی۔

"ہاں' بس ابھی میں وہیں کے لیے نکل رہا ہوں تو بھی تیار ہو جا۔" شہزاد نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو یوسف بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"ویسے یار.....! تجھے ہر کام کی بہت جلدی کیوں ہوتی ہے؟ دھیرج رکھ میرے یار.....!" شہزاد نے یوسف کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

"بس گھر والوں کی توقعات کا خیال مجھے بے چین کیے رکھتا ہے۔"

"خیر' چل ٹھیک ہے' چل آ جا۔" شہزاد نے آگے بڑھتے ہوئے کہا تھا تو یوسف بھی اُس کے پیچھے ہو لیا تھا۔

•.....•.....•

"ارے اماں.....! مجھے کام مل گیا ہے۔" یوسف نے موبائل اپنے دوسرے کان پر منتقل کرتے ہوئے کہا۔ اُس کے لہجے میں جوش تھا۔

"نہیں اماں.....! کام تو وہی پرانا ہے' مزدوری والا لیکن ایک دن کی مزدوری چار سو روپے بتائی ہے ٹھیکے دار نے اور پندرہ بیس دن کا کام ہے۔ کہہ رہا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا' دل لگا کر کام کیا تو تجھے اور کام بھی دوں گا۔"

"بس دُعا کرنا ماں! میرے لیے' بہنوں کو میری طرف سے پوچھنا۔"

"ہاں' ہاں ماں! بس یہ ہفتہ نکال لے کسی طرح' میں پھر تجھے پیسے بھجواتا ہوں۔"

"اچھا ماں! خدا حافظ! شہزاد کا سارا بیلنس نہ ختم ہو جائے..... یہ لے یار' تیرا بڑا شکریہ۔" یوسف نے موبائل شہزاد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

"اوئے..... چل' کوئی بات نہیں' دوستوں کا شکریہ ادا نہیں کرتے' چل' آج تو چائے بنتی ہے۔ اتنی اچھی خبر تو نے ماں کو سنائی ہے۔" شہزاد نے یوسف کو چکارتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دیا۔

"ہاں' کیوں نہیں' آج چائے میری طرف سے' بلا چھوٹے کو۔"

"اوئے چھوٹے.....!" شہزاد نے ایک چھوٹے اور قدرے موٹے سے بچے کو آواز دی تھی۔

"بچے.....! دو چائے ملائی مار کے....." یوسف نے ٹیبل بجاتے ہوئے کہا تھا۔

"ابھی آیا صاحب.....!"

"اوئے..... سن..... دو پراٹھے بھی ساتھ لے آ' گرما گرم ہونے چاہئیں۔"

"اوئے ہوئے..... تُو تو بڑا فراخ دل ہے۔ چل' جلدی سے چائے پی کے نکلتے ہیں ورنہ ٹھیکے دار کا گزر یہاں سے ہوا تو ڈانٹ پڑ جائے گی۔ پورا دن اسی ہوٹل میں بیٹھ کر وہ چائے پیتا ہے اور سگریٹ پھونکتا ہے۔" شہزاد کی زبانی یہ بات سن کر یوسف کی سٹی گم ہو گئی تھی۔

•.....•.....•

"واہ.....! واہ.....! بھائی کو کام مل گیا۔" پروین نے نعرہ لگایا تھا۔

"اماں.....! اب ہمارے دن پھر جائیں گے۔" نسیم نے اماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"میری طرف سے ایک لمبا والا میسج بھائی کو کر دو۔" سکینہ نے رضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے التجائی انداز میں کہا۔

"لمبا والا میسج' کیا مطلب؟" رضیہ نے حیرت سے سکینہ کو دیکھا۔

"مجھے بھائی سے چُنری والا دوپٹہ منگوانا ہے۔" سکینہ کے بولتے ہی زینت بھی آگے بڑھ گئی۔

"ہاں' میں نے سنا ہے' کراچی میں ایمی ٹیشن جیولری بہت اچھی ملتی ہے' مجھے وہاں سے ایک نگوں والا سیٹ چاہیے۔" زینت کے چہرے پر انجانی خوشی تھی۔

"میں بھی تو سوٹ منگواؤں گی بھائی سے۔" رضیہ جو میسج رائٹ کر رہی تھی' اپنی فرمائش بھی اُس میں لکھنے لگی۔

"تم سب لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے میرے بچے کو پریشان کرنے کی' ویسے بھی ابھی ہمیں پہلے مالک مکان کا قرضہ اتارنا ہے' چار ماہ کا کرایہ چڑھ گیا ہے۔" بخت بی بی نے ڈپٹنے والے انداز میں کہا تھا۔

"اچھا ناں..... یہ ہمارا اور بھائی کا مسئلہ ہے۔ رضیہ باجی.....! بھیج دو میسج۔" فریدہ نے کہا تھا۔

"جو تم لوگوں کو سمجھ آئے' کر لو۔ میں ذرا روٹی ڈال لوں۔" بخت بی بی باورچی خانے کی طرف چلی گئی جبکہ ساری بہنیں اپنی اپنی فرمائشیں رضیہ کو نوٹ کرانے لگیں۔

•.....•.....•

"ارے بھئی' کیا لمبی لسٹ آئی ہے تیرے گھر سے۔" شہزاد نے یوسف کی زبانی موبائل اسکرین پر میسج کی صورت موجود لسٹ سن کر کہا تھا۔



"ارے یار..... اب کون سمجھائے اِن چھوٹیوں کو' ویسے میری اماں نے کوئی فرمائش نہیں کی۔ شاید اس لیے کہ انہیں یہ فکر ستا رہی ہو گی کہ چار ماہ کا مکان کا کرایہ دینا ہے' مالک مکان تنگ کر رہا ہو گا۔" یوسف نے آہستگی سے کہا تھا۔

"میرے خیال میں تو' تُو ہر مہینے ایک بہن کی فرمائش پوری کر دے تو بات کچھ بن جائے ورنہ تو میرے یار.....! بڑی مشکل ہو جائے گی تیرے لیے۔" شہزاد نے مصنوعی شرارت چہرے پر سجاتے ہوئے کہا تو یوسف بھی قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گیا۔

"اچھا' کل ٹھیکے دار صاحب کہہ رہے تھے' تم لوگ کرائے پر ایک بائیسکل لے لو' چھوٹے موٹے کام آسانی سے ہو جائیں گے۔ کام چھوڑ کر پیدل مارکیٹ جانے میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔"

"تو کیا سائیکل کا کرایہ ہم دونوں مل کر دیں گے؟" شہزاد کی بات سن کر یوسف نے فوراً ہی پوچھا تھا۔

"ارے نہیں' سائیکل کا کرایہ ہمارے کھاتے میں نہیں ہے' وہ تو ٹھیکے دار صاحب دیں گے۔"

"پھر تو بڑی اچھی بات ہے' ہمیں پہلی فرصت میں ہی سائیکل لے لینی چاہیے۔ آنے جانے میں بھی آسانی اور وقت کی بچت بھی ہو گی۔" یوسف نے آمادگی کا اظہار کیا تھا۔

"چل تو پھر نکلتے ہیں' بس میں چاہ رہا ہوں تو ٹھیکے دار صاحب کی نظر میں ایک محنتی مزدور کے روپ میں آ جائے تاکہ آئندہ تیرے لیے آسانی ہو جائے۔" شہزاد نے یوسف کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

•.....•.....•

"ارے یار' اگر دو سیمنٹ کی بوریاں اور آ جائیں تو آج کا کام مکمل ہو جائے گا' یہ کام ادھورا رہ گیا تو ٹھیکے دار صاحب آج کی دیہاڑی روک لیں گے۔" شہزاد پیلچہ دیوار سے لگاتے ہوئے بولا تھا۔

"اب کیا کریں؟ استاد کا نمبر ملاؤ۔" یوسف کے چہرے پر ایک دم ہی یاسیت سمٹ آئی تھی۔

"ایک کام کرو' میں تجھے مارکیٹ میں اکرم کی دکان پر اُس دن لے گیا تھا' کیا وہ تجھے یاد ہے؟" شہزاد نے یوسف سے سوال کیا تھا۔

"ہاں' یاد تو ہے۔"

"تو بس تُو اُس سے دو سیمنٹ کے تھیلے پکڑ لے۔ حساب استاد کے کھاتے میں نوٹ کروا دینا۔ جتنی دیر میں تو سیمنٹ لائے گا' میں استاد کو فون کر کے بتاتا ہوں اور اس سامنے والی دیوار کا پلاسٹر کر دیتا ہوں۔"

"ہاں' یہ ٹھیک رہے گا۔" کہہ کر یوسف تیزی سے نکل گیا تھا مگر ابھی وہ کچھ دور ہی گیا تھا کہ اُسے ایک پولیس موبائل نے روک لیا تھا۔ پولیس والوں کو دیکھ کر اُس کی جان نکل گئی تھی۔

"اوئے..... کون ہے تو؟ کہاں سے تعلق ہے تیرا؟" یوسف کا اجنبی چہرہ اور پھر چہرے پر پھیلی گھبراہٹ نے پولیس والوں کو اُس کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔

"یوسف نام ہے میرا' حیدر آباد سے آیا ہوں۔"

## سفارش

ارشاد نبوی ﷺ ہے: "جب کوئی حاجت مند سائل سوال کرے تو اس کی سفارش کرو کہ تم کو سفارش کا ثواب ملے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کی زبان سے جو حکم چاہتا ہے جاری فرماتا ہے۔"

بحوالہ: حاکم بیہقی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہاں کیا کرنے آیا ہے؟"

"صاحب..... نوکری....."

"اچھا..... تو کہاں کرتا ہے نوکری؟" ایک پولیس والے نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر سوال کیا تھا تو وہ اور گڑبڑا گیا تھا۔

"صاحب..... نوکری نہیں' مزدوری کرتا ہوں۔" وہ تھوک نگل کر بولا تھا۔

"کب آیا ہے تو حیدرآباد سے؟" دوسرا پولیس والا بھی آگے بڑھا تھا۔

"دو ہفتے پہلے۔" یوسف نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

"دو ہفتے میں تو نے سائیکل خرید لی؟ واہ..... کیا کام کرتا ہے؟" پولیس والے کی بتیسی نکلی تھی۔

"نہیں..... یہ میری نہیں ہے' کرائے کی ہے۔" یوسف نے بے بسی سے جواب دیا۔

"اوئے..... تو دو ہفتے پہلے حیدرآباد سے کراچی آیا ہے اور تجھے کرائے پر سائیکل بھی مل گئی؟ جھوٹ بولتا ہے سالا..... سب پتا ہے تجھ جیسے لوگ ایسے ہی بہانے کر کے چوری چکاری کرتے ہیں۔ مجھے تو یہ سائیکل چوری کی ہی لگتی ہے۔ بتا' کہاں سے چرائی ہے؟" پولیس والے نے ایک ہاتھ جڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نہیں صاحب..... یہ میں نے کرائے پر لی ہے۔ میں چور نہیں ہوں۔" اَب یوسف گڑگڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا مگر دونوں پولیس والوں میں سے کسی نے بھی یوسف کی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ "چل بیٹھ موبائل میں' اب تھانے جا کر ہی تیری تفتیش ہوگی۔" اور پھر وہ لاکھ منتیں کرتا رہا تھا مگر کسی نے کچھ بھی نہیں سنا اور یوسف کو گھسیٹ کر موبائل میں بٹھا لیا گیا۔

•.....•.....•

قارئین "سچی کہانیاں"..... ناکردہ جرم کی پاداش میں گرفتار یوسف گزشتہ ڈھائی سال سے رہائی کا منتظر ہے مگر وہ بھلا کیسے رہا ہوگا؟ اُس کا تو مقدمہ چل ہی نہیں رہا۔ اُسے تو ڈھائی سال سے کسی عدالت میں پیش ہی نہیں کیا گیا۔ عدالت میں پیشی کے لیے تو بھاری رقم طلب کی جاتی ہے' یہ رقم وہ کہاں سے لائے؟ جیل حکام کی فرمائشیں وہ کیسے پوری کرے؟ سو جیل حکام بھی شاید اُسے بھول چکے ہیں۔ یوسف آج بااثر قیدیوں کا غلام بن کر رہ گیا ہے۔ صبح سے شام تک چند ٹکوں کی خاطر وہ بااثر قیدیوں کی خدمت گزاری میں وقت اس لیے گزار رہا ہے کہ شاید اُسے اسی طرح چند روپے مل جائیں اور وہ اُسے جوڑ جوڑ کر اپنی رہائی کی امید کو حقیقت کا روپ دے سکے۔ اُسے جب بھی اپنے گھر کا خیال آتا ہے تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے' میری ماں کا نام تو بخت ہے مگر یہ بدبختی میری ماں اور میرا کیوں تعاقب کر رہی ہے؟ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟ میری بہنیں جو میری آس لگائے بیٹھی ہیں' معلوم نہیں' کیسے جی رہی ہوں گی؟'

یوسف کی یہ ایک دن کی سوچ نہیں' دن بھر کی مشقت کے بعد رات کو جب وہ اپنے سیل میں بند کر دیا جاتا ہے تو وہ یہ سب کچھ سوچتا ہے اور رات بھر اُس کی سسکیاں اور آہیں سیل کی در و دیوار سے ٹکرا کر واپس آ رہی ہوتی ہیں' دوسری طرف بخت بی بی ہر روز جیل کی اونچی فصیلوں کے دروازے کھلتے ہوئے دیکھ رہی ہوتی ہے۔ اُس کی دُعا تو بس یہی ہے کہ خدایا! اس زنداں کے دروازے وا کر دے۔ میرا بیٹا مجھے واپس دلا دے۔

آج بخت بی بی بیٹے کی رہائی اور سات بیٹیوں کی پرورش کی خاطر کراچی سینٹرل جیل کے سامنے ایک سڑک کے کنارے اپنی چادر بچھا کر بھیک مانگنے پر مجبور ہے۔

اقبال زمان

# ایک ذرا سی بھول

قابل اجمیری کا خیال

چھوڑ جاتا ہے کچھ نقوشِ حیات
حادثہ تو گزر ہی جاتا ہے

**ایک معصوم بچے کے اغواء کی تصویر کشی کرتی چشم کشا کہانی**

یہ منظر ہے شہر کراچی کے علاقے گلستانِ جوہر کے ایک اپارٹمنٹ کا۔ ایک خاتون شاپنگ سے واپسی کے بعد آتی ہیں۔ ایک بہت پیارا سا تقریباً دس ماہ کا بچہ اُن کی گود میں ہے۔ اپارٹمنٹ کا چوکیدار آگے بڑھ کر خاتون کی گود سے بچہ لیتے ہوئے کہتا ہے۔ "باجی! آپ سامان لے کر اوپر چلیں' میں اِسے لے کر آتا ہوں۔" خاتون اپنے سامان سمیت آگے بڑھ جاتی ہیں اور پھر.....؟

بچے کو اغواء کرنے والا چوکیدار لال کریم

اُسی روز مقامی تھانے میں مدعی فیاض احمد نے ایک رپورٹ FIR نمبر 1030 کی صورت درج کرائی ہے کہ میری بیوی جب بازار سے شاپنگ کر کے اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی تو ہمارا بیٹا عبداللہ اُس کی گود میں تھا۔ اس موقع پر میری بیوی کے پاس سامان دیکھ کر اپارٹمنٹ کے چوکیدار جس کا نام لال کریم ہے' نے آگے بڑھ کر میری بیوی سے کہا کہ باجی! آپ اوپر فلیٹ میں چلیں' میں بچہ لے کر آتا ہوں۔ میری بیوی نے بچہ اپارٹمنٹ کے اس چوکیدار کو دے دیا تھا اور خود فلیٹ کی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی تھی۔ اس کے بیل بجانے پر دروازہ میں نے کھولا تھا اور ساتھ ہی اپنے بیٹے عبداللہ کے بارے میں دریافت کیا تھا تو میری بیوی نے بتایا تھا کہ بیٹا بلڈنگ کے چوکیدار کے پاس ہے' وہ بس اُسے لا ہی رہا ہوگا لیکن جب خاصی دیر گزر گئی اور چوکیدار میرا بچہ لے کر نہیں آیا تو نیچے جا کر معلوم کیا۔ اَب معلوم یہ ہوا تھا کہ وہ چوکیدار میرے دس ماہ کے معصوم بچے کو لے کر غائب ہے۔"

بس اِس کے بعد تو فیاض احمد کے گھر رونا پیٹنا شروع ہو گیا تھا اور ساتھ ہی طرح طرح کی باتوں اور خیال آرائی کا سلسلہ بھی.....!

معصوم بچے عبداللہ کے والد فیاض احمد جب



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپارٹمنٹ کے کچھ معززین کے مشورے پر اُن کے ساتھ ہی شاہراہِ فیصل تھانے میں رپورٹ درج کرانے پہنچے تھے تو وہاں اُن کی ملاقات ڈیوٹی پر موجود ڈیوٹی آفیسر سب انسپکٹر سلیم خان سے ہوئی تھی۔ سب انسپکٹر سلیم خان نے یہ روداد سننے کے بعد فوری طور پر اپنے فرائض منصبی انجام دیتے ہوئے ٹیلی فون پر تھانے کے اسٹیشن ہاؤس آفیسر انسپکٹر زوار شاہ کو اس واردات کی اطلاع دی تھی اور اسٹیشن ہاؤس آفیسر نے اپنے اعلیٰ افسران کو تمام واقعہ بتاتے ہوئے مذکورہ چوکیدار کے خلاف زیرِ دفعہ نمبر 364/A پرچہ درج کیا تھا اور اس کی تفتیش سب انسپکٹر سلیم خان کے سپرد کی گئی تھی۔ اِس کے بعد پولیس نے چوکیدار کے شناختی کارڈ کی کاپی، اپارٹمنٹ کی یونین سے حاصل کر کے تفتیش کا آغاز کرتے ہوئے فوری طور پر CPLC سے رابطہ کرنے کے بعد تمام صورت حال سے آگاہ کیا تھا اور پھر اعلیٰ پولیس افسران نے ایک جوائنٹ انویسٹی گیشن ٹیم تشکیل دی تھی جس میں سب انسپکٹر سلیم خان، سید فیض الحسن اور انسپکٹر زوار شاہ وغیرہ شامل تھے۔

تفتیش کا آغاز اس چوکیدار لال کریم کے موبائل میں استعمال ہونے والی sim کی معلومات سے ہوا تھا۔ پتہ یہ چلا تھا کہ اس چوکیدار کے زیرِ استعمال چار sims تھیں جن میں دو زیرِ استعمال اور دو بند تھیں۔ اس سلسلے میں نارا اور نادرا سے اُس چوکیدار کے تمام کوائف جمع کیے گئے تھے اور زیرِ استعمال sim کی tracking سے معلوم ہوا تھا، وہ لال کریم چوکیدار پشاور جانے والی بس میں بیٹھ کر کراچی سے روانہ ہو گیا تھا اور اس دوران میں اس کا اپنے بھائی سے کراچی میں رابطہ بحال تھا جو کہ بلدیہ کے علاقے میں رہائش پذیر تھا۔ پولیس

تفتیشی افسر سب انسپکٹر سلیم خان

نے فوری طور پر پشاور کی پولیس اور دوسرے حساس اداروں سے رابطہ کر کے مجرم کی روانگی کی اطلاع دی تھی اور ساتھ ہی بچے کے والد فیاض احمد کو بذریعۂ جہاز کراچی سے پشاور روانہ کر دیا تھا۔

جب مذکورہ چوکیدار لال کریم پشاور پہنچ کر بس سے اترا تو بس اڈے پر سادہ لباس میں پولیس اہلکار موجود تھے۔ انہوں نے فوری طور پر اسے گرفتار کر لیا تھا اور پھر پشاور پولیس کی انویسٹی گیشن کے دوران مذکورہ چوکیدار نے بتایا تھا کہ بچہ تو کراچی میں میرے بھائی کے پاس ہے جو اِس وقت بلدیہ میں ہے۔ دوسری جانب CPLC کی جانب سے چوکیدار کے بھائی کی sim لوکیشن کبھی بلدیہ ٹاؤن اور کبھی مچھر کالونی آ رہی تھی۔ اب دونوں جانب ہی پولیس اپنے مشن پر کام کر رہی تھی اور پھر کافی جدوجہد



کے بعد جب مذکورہ چوکیدار کے بھائی کو گرفتار کیا گیا تو اس نے انکشاف کیا تھا کہ..... میں نے بچہ ایک عورت کو دے دیا ہے جو کہ مچھر کالونی میں رہائش پذیر ہے۔

اِس بات کا علم ہوتے ہی پولیس نے انتہائی سرعت سے مچھر کالونی کے علاقے مستان چوک کا رخ کیا تھا۔ وہاں پہنچ کر پولیس نے وہاں کی تنگ گلیوں کا سفر پیدل ہی کیا تھا اور سمندر کے کنارے ایک مکان پر پہنچ گئی تھی۔

پولیس نے جب اُس مکان پر چھاپہ مارا تو وہاں سے نا صرف وہ بچہ عبداللہ بلکہ ایک خاتون اور اس کے ساتھیوں کو حراست میں لے کر تھانہ شاہراہ فیصل منتقل کر دیا تھا۔

جب پولیس نے اِس دس ماہ کے بچے عبداللہ کو بازیاب کرانے کے بعد گود میں لیا تھا تو اُن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس طرح انہوں نے ایک بڑی کامیابی حاصل کی تھی اور پھر جب پولیس اُس بچے کو اُس کے والدین کے پاس لے کر پہنچی تو وہ اپنے بچے کو گلے لگا کر خوشی سے رونے لگے تھے اور پھر انہوں نے سجدۂ شکر ادا کیا تھا کہ اللہ نے اُن کا بچہ صحیح سلامت واپس عطا کیا۔ اِس کامیابی پر S.P. گلشن نے تھانے میں فوراً پریس کانفرنس کی اور پولیس پارٹی کو تعریفی اسناد کے علاوہ نقد انعام بھی دیا تھا۔

یہ ساری کہانی پڑھنے کے بعد آپ قارئین یہ ضرور سوچیے گا کہ اِس برے زمانے میں زندگی گزارنے کے لیے کتنی احتیاط اور تدبر کی ضرورت ہے ورنہ تو ایک ذرا سی غلطی..... اور اعتبار آپ کی زندگی کو جہنم بنا سکتا ہے۔

☆☆☆


درد کے صحرا کی شاعرہ اور مصورِ غم

صفیہ سلطانہ مغل

کی پُرسوز شاعری پر مشتمل مجموعہ کلام

امجد اسلام امجد، سلیم کوثر اور ناصر رضا کی آراء کے ساتھ

جس کی اشاعت پر آزاد کشمیر کے طلوعِ ادب اور بلوچستان کی ادبی تنظیم مہرِ ادب کی جانب سے سالِ رواں کا بہترین مجموعہ کلام کا ایوارڈ مل چکا ہے۔

سچی کہانیاں اور دوشیزہ کے قارئین کیلئے خصوصی رعایت

ملنے کا پتہ

صفیہ سلطانہ، فرسٹ فیملی لائن۔ جیکب آباد

Cell:0333-7331943




Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# سفر کہانی

جیتے جاگتے دوڑتے بھاگتے سچے مناظر کی آنکھوں دیکھی روداد

محمد فہیم

## سیلانی ہے فطرت ہماری

آتش کا خیال

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

**متحدہ عرب امارات کی ریاست شارجہ سے جڑے ایک معلوماتی سفر کی روداد**

تقریباً دو سال بعد ماہ رمضان المبارک میں ہم ایک بار پھر عازم سفر تھے۔ منزل مقصود وہی تھی جو پہلے تھی یعنی متحدہ عرب امارات لیکن اس مرتبہ ہم نے اس سرزمین پر قدم رنجہ فرمانے کے لیے بجائے دبئی ایئرپورٹ کے شارجہ ایئرپورٹ کا انتخاب کیا تھا۔ گو ہماری ہم سفر حسب سابق ہماری بیٹی سحر فہیم ہی تھی لیکن ایئرلائن ملائیشین ایئر کے بجائے ایئر عربیہ تھی اور طیارہ A-320 ایئر بس۔ اس ایئرلائن کا انتخاب اس باعث تھا کہ ہم نے اس مرتبہ اس سرزمین پر نزول قدم کے لیے ہم نے شارجہ کو پسند کیا تھا۔ ہمیں عرب ملکوں کے ایئرپورٹس کے عملے کی کارکردگی کا کافی تجربہ تھا اور ہم یہ چاہتے تھے کہ لگے ہاتھوں شارجہ کے عملے کی خبر بھی لیتے چلیں۔

طیارہ فضا کی بیکراں خاموش وسعتوں کو اپنی چیخ و چنگھاڑ سے اتھل پتھل کرتا 600 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے منزل مقصود کی جانب رواں دواں تھا۔ اس روز چوبیسواں روزہ تھا اس لیے جہاز پر فضائی مہمان نوازوں کا دور دور تک پتا نہ تھا کہ زیادہ تر مسافر روزہ دار تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ ایئر عربیہ کے طیاروں میں مفت مہمان نوازی سے اعتراض برتا جاتا ہے حالانکہ عرب اپنی مہمان نوازی کے لیے صدیوں سے مشہور ہیں لیکن اس ایئرلائن نے شاید اس مقولے پر اپنا منشور ترتیب دیا ہے کہ ”کردیتا ہے تعلقات خراب مفت کا کھانا پینا“ چنانچہ پانی سے لے کر چائے اور سینڈوچ تک اپنی مرضی کے مطابق مسافر آواز دے کر طلب کر سکتے ہیں لیکن معقول نہیں بلکہ انتہائی غیر معقول قیمت ادا کرنے پر وہ بھی غیر ملکی زرمبادلہ کے عوض۔ چنانچہ زیادہ تر مسافران فضائی میزبانوں کو زحمت دیئے بغیر ہی اپنا سفر تمام کرنا پسند کرتے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں کسی حد تک معقول قیمت پر بھی آپ کو دوران سفر حاصل ہو سکتی



ہیں۔ بشرطیکہ آپ اپنا ٹکٹ خریدتے وقت ایئرلائن کو اپنی پسندیدہ غذائی اشیاء کی تفصیلات نوٹ کرا دیں لیکن اس کے لیے آپ کو ٹکٹ کے ساتھ ہی یہ معقول قیمت (In Advance) یعنی پیشگی ادا کرنا ہوگی۔

عرب امارات سے کیونکہ پاکستان کے (Route) پر زیادہ تر ہمارا محنت کش طبقہ سفر کرتا ہے جو کہ ان ممالک میں اپنا خون پسینہ دن رات ایک کر کے اپنے وطن عزیز اور اپنے اعزاء و اقارب کے لیے قیمتی زرمبادلہ مہیا کرتا ہے اس لیے وہ اس مختصر سے وقت کے سفر (کراچی سے امارات کا سفر صرف دو گھنٹوں پر محیط ہوتا ہے) میں منہ بند کر کے اپنے قیمتی زرمبادلہ کو ضائع کرنے سے اجتناب ہی کرنا پسند کرتے ہیں۔ اطلاعاً عرض کرتے چلیں کہ عام ایئر لائنز کے برعکس مسافروں کو وقت گزاری کے لیے ان فلائٹس پر اخبارات بھی پڑھنے کے لیے مہیا نہیں کیے جاتے ہاں اگر آپ کو بہت ہی شوق مطالعہ چرائے تو درہم و دینار نقد کے عوض یقیناً یہ شوق پورا کر سکتے ہیں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ایئر عربیہ کے طیارے جدید، کشادہ اور آرام دہ ہیں۔ ہماری قومی ایئرلائن کی طرح فرسودہ نہیں۔ پھر یہ اضافی خوبی کے طیاروں کی آمد و روانگی انتہائی وقت ہوتی ہے اور مسافروں کو آمد یا روانگی کے لیے لاؤنج میں گھنٹوں منہ بسورتے یا اونگھ کر وقت گزارنے کی کوفت اٹھانی نہیں پڑتی۔ سو ہماری روانگی بھی کراچی کے جناح ایئرپورٹ سے بروقت یعنی صبح ٹھیک آٹھ بج کر تیس منٹ پر عمل میں آگئی اور ایک گھنٹہ پچاس منٹ کے سفر کے بعد شارجہ کے مقامی وقت کے مطابق 12 بج کر 35 منٹ پر جہاز کے پہیوں نے رن وے کو چھوا اور فضائی میزبان نے انگریزی، عربی اور ہندی کے بعد تینوں زبانوں میں تمام مسافروں کا اس روکھے پھیکے سفر تمام پر مسافروں کا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی اس خواہش کا اظہار بھی کہ وہ بہت جلد ایئر عربیہ کی کسی اور فلائٹ پر ان کے ہم رکاب ہوں گے.....

ہمارے دل سے بے ساختہ آواز نکلی تھی اللہ نہ کرے!

طیارے سے باہر نکلتے ہی ریگستانی جھلساتی گرم ہوا اور تیز دھوپ نے ہمارا استقبال کیا کہ اس وقت شارجہ میں درجہ حرارت 50 ڈگری سینٹی گریڈ سے تجاوز کر رہا تھا۔ طیارہ مین بلڈنگ سے دور پارک کیا گیا تھا اس لیے مسافروں کے جہاز سے اترنے کے لیے سیڑھی لگا دی گئی جو کہ سلور کی ہونے کی وجہ سے آگ کی طرح تپ رہی تھی' سو سہارے کے لیے جونہی ریلنگ پر ہاتھ رکھا، ایک جھٹکے سے ہٹانے پر مجبور ہو گئے۔ یوں لگا کہ کسی انگارے کو چھو لیا ہو۔ دل ہی دل میں کہا اللہ خیر کرنا کہ شارجہ میں قدم اول ہی بڑا چاں گسل تھا۔ آج کل غریب سے غریب ملک میں بھی ایئرپورٹس پر ٹنل کی سہولت موجود ہوتی ہے یعنی طیارہ ایک ٹنل (سرنگ) سے جا لگتا ہے اور مسافر کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ طیارے سے نکل کر Arrival Lounge میں پہنچا ہے۔ خیر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق' اس چلچلاتی دھوپ میں سیڑھیوں سے اتر کر نیچے کھڑی مسافروں کا انتظار کرتی بس میں جا بیٹھے جس نے ہمیں Arrival Lounge تک پہنچا دیا جہاں پہنچ کر ہمیں نہ صرف مایوسی بلکہ حیرت بھی ہوئی کیونکہ دبئی ایئرپورٹ کے مقابلے پر شارجہ ایئرپورٹ انتہائی بے وقعت لگا۔ مرے پر سو درے محاورے کا مفہوم صحیح معنوں میں اس وقت ہماری سمجھ میں آیا جبکہ ویزہ کی دستاویز کے لیے ایک طویل قطار میں کھڑا ہونا پڑا۔ ہمارے پاس ویزہ کی فوٹو کاپی اگرچہ موجود تھی اور وہاں سات یا آٹھ کاؤنٹرز موجود تھے لیکن صرف ایک پر ہی ایک صاحب پاسپورٹ دیکھ کر اور ویزہ کی کاپی کی موجودگی کے باوجود اپنے کمپیوٹر پر ویزہ کے اجراء کی تصدیق کے بعد ہی دراز



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں سے حکومت کی جانب سے جاری کردہ ویزہ کی اصل کاپی نکال کر مسافر کے حوالے کرتے تھے۔ بدقت تمام اس مرحلے سے فارغ ہو کر امیگریشن لاؤنج میں وارد ہوئے۔ ایک بار پھر شدید مایوسی کا شکار ہوئے کہ وسیع ہال میں موجود درجنوں کاؤنٹرز میں سے صرف دو کاؤنٹرز پر اہلکار موجود تھے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں جانب دیکھنے کے باوجود ہمیں نہ تو کسی کاؤنٹر پر Senior Citizen کا آویزاں بورڈ نظر آیا نہ ہی فیملی اور خواتین کا جبکہ دبئی ایئرپورٹ پر یہ تمام سہولتیں موجود ہیں اور چاق و چوبند عملہ بھی آپ کی خدمت کے لیے کوشاں۔ اس وقت صرف تین کاؤنٹرز پر بیک وقت دو پروازوں کے ذریعے آنے والے مسافروں سے نمٹنے کے لیے دو عرب خواتین اور دو مرد نظر آئے تھے جو ٹھیٹ عربوں کے سے روایتی انداز میں انتہائی خشک رویے کے ساتھ موجود تھے اور ہماری شامت اعمال کہ وہ دو حضرات بھی صرف چند مسافروں کو بھگتانے کے بعد کاؤنٹر سے کوچ کر گئے اور اب ہم صرف دو خواتین کے رحم و کرم پر تھے اور وہ خواتین بھی مسافروں کی حالت زار پر رحم کھانے کے بجائے آپس کی گفتگو میں زیادہ منہمک تھیں۔ ہمیں اپنا گزشتہ دورہ امارات اور دبئی ایئرپورٹ شدت سے یاد آیا جہاں انتہائی خوش اخلاق اور چاق و چوبند عملہ مسافروں کے معاملات حل کر رہا تھا اور ہمیں تو سینئر سٹیزن کی حیثیت سے کچھ زیادہ ہی خوش اخلاقی سے Deal کیا گیا تھا۔ بعد از خرابیٔ بسیار، تقریباً دو گھنٹوں بعد یہاں سے گلوخلاصی ہوئی۔ باہر نکلے جہاں ہمارا بیٹا فرخ ہمارا منتظر تھا۔

☆.....☆

شارجہ کی ریاست متحدہ عرب امارات کی فیڈریشن کی ابوظہبی اور دبئی کے بعد تیسری بڑی ریاست ہے۔ شارجہ کا رقبہ 2600 اسکوائر کلومیٹرز ہے جبکہ کل آبادی 50,000 نفوس پر مشتمل ہے۔ یہ چھوٹی سی ریاست روز بروز اپنی اسٹریٹیجک پوزیشن کی بناء پر دنیا بھر کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتی جارہی ہے کیونکہ یہ مشرقِ بعید (Far East) اور یورپ کے درمیان ایک اہم سینٹر کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی تین بندرگاہیں خالد پورٹ، جمیرا پورٹ اور خورفاکان (Khorfakan) دن رات سامان کی ترسیل کے لیے کام کرتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی امتیازی حیثیت یہ بھی ہے کہ یہ دبئی کے تجارتی مرکز (Hub) اور شمالی امارات کے بیچوں بیچ واقع ہے۔

یہاں ہم آپ کو یہ بتاتے چلیں کہ شارجہ ایئرپورٹ دبئی کے مشہور زمانہ شہر سے صرف 15 منٹ کی ڈرائیونگ (مسافت) پر واقع ہے۔ یہ Open Sky Policy پر عمل پیرا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں آنے والی تمام پروازوں کو بغیر کسی رکاوٹ یا دشواری کے وہ تمام سہولیات باآسانی دستیاب ہوتی ہیں جو International Aviation یعنی عالمی شہری ہوابازی کے مقرر کردہ معیار کے عین مطابق ہوتی ہیں اور انہیں شارجہ ایئرپورٹ پر لینڈنگ اور ہینڈلنگ کی سہولتیں مقابلتاً کم نرخوں پر حاصل ہوتی ہیں۔ یہاں تیل کی بہتات کے باعث طیاروں میں استعمال ہونے والا ایندھن بھی باکفایت دستیاب ہوتا ہے اس لیے تقریباً تمام عالمی ایئرلائنز اس سہولت سے فیض یاب ہونے کے لیے شارجہ اسٹاپ اوور کرتی ہیں پھر یہ بھی کہ دورِ جدید کے تقریباً ہر قسم کے طیاروں کی ہینڈلنگ کی سہولتیں اور صلاحیتیں بھی یہاں موجود ہیں۔

آپ کی اطلاع کے لیے بتاتے چلیں کہ دنیائے ہوابازی میں آج اس قدر اہمیت رکھنے والا



یہ مختصر سا ایئرپورٹ 1932ء میں برٹش ایئرویز نے اپنی ان پروازوں کی سہولت کے لیے تعمیر کیا تھا جو کہ برٹش انڈیا اور آسٹریلیا جانے والی پروازوں کے لیے Stopover کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ واضح رہے کہ اس وقت نہ اتنے بڑے بڑے طیارے استعمال میں تھے نہ ہی وہ اتنی طویل پروازوں کے متحمل ہو سکتے تھے چنانچہ راستے میں آرام ضروری تھا۔ اوور ہالنگ اور ایندھن حاصل کرنے کے لیے Stop over بہت ضروری ہوتا تھا۔

اکتوبر 2003ء میں شارجہ کی حکومت نے اپنی ذاتی ایئرلائن ایئر عربیہ (Air Arabia) کے نام سے متعارف کروائی جو ایک مختصر سے عرصے میں اپنا دائرۂ کار تقریباً پوری دنیا تک پھیلا چکی ہے جس کی وجہ سے حالیہ دنوں میں شارجہ ایئرپورٹ پر مسافروں کی آمدورفت میں ڈرامائی اضافہ ہوا ہے۔ اس ایئرپورٹ پر موجود ڈیوٹی فری شاپس بھی مسافروں کو یہاں آنے پر اکساتی ہیں۔ دنیا کی سب سے ممتاز کیٹرنگ سروسز کمپنی Alph یہاں لینڈ کرنے والی فلائٹس کو Inflight سروسز کی ذمہ دار ہے۔

قصہ مختصر 1932ء میں ایک معمولی سے Stopover ہوائی اڈے کی حیثیت سے تعمیر کیا جانے والا شارجہ ایئرپورٹ، آج اس علاقے کا کارگو حب کہلاتا ہے اور ایک عالم کا مرکزِ نگاہ بنا ہوا ہے۔

☆.....☆

شارجہ کی سرکاری زبان گو کہ عربی ہے لیکن ایک عام شخص ہندی، اردو اور انگلش میں بھی اپنا کام چلا سکتا ہے کہ یہ زبانیں بھی یہاں ذریعۂ اظہار کے طور پر مستعمل ہیں..... شارجہ میں دکانیں کاروبار کے لیے عموماً صبح نو بجے سے دس بجے رات تک دوپہر کے ایک معمولی سے وقفے سے کھلی رہتی ہیں جبکہ سپر مارکیٹیں اور بڑے بڑے مال اور شاپنگ سینٹرز

## حقیقت

فوراً سے بھی بیشتر پیشتر
طعنہ دے جاتے ہیں لوگ
کیوں کسی کے دل کا حال
جانتے نہیں ہیں لوگ؟
لوگوں سے آخر کیا کہیں
کیسے کہیں ہم اے سحرؔ
کہہ بھی ان سے تو آخر کیا کہے سحرؔ
اکثر سچ کہنے سے بھی
بچھڑ جاتے ہیں لوگ

صائمہ سحرؔ

بغیر کسی وقفے کے رات گیارہ بجے تک کھلے رہتے ہیں۔

شارجہ کا موسم بھی دیگر ریگستانی علاقوں سے کچھ مختلف نہیں۔ نومبر سے مارچ تک یہاں درجہ حرارت 26 سینٹی گریڈ دن کے اوقات میں جب کہ 15 سینٹی گریڈ تک رات کے وقت گر جاتا ہے۔ ان مہینوں کو آپ یہاں کے موسم سرما میں شمار کر سکتے ہیں جب کہ سال کے باقی مہینے موسم گرما کے ہیں۔ خاص کر جون تا اگست کے مہینوں میں درجہ حرارت 50 سینٹی گریڈ سے بھی تجاوز کر جاتا ہے۔ موسم گرما کے آرام دہ کپڑوں میں آپ پورا سال گزار سکتے ہیں۔

شارجہ میں سوئمنگ پول اور ساحلِ سمندر پر سوئمنگ سوٹ، شارٹس اور بکینز (Biknis) قابلِ قبول ہوتے ہیں لیکن شہر میں گھومتے ہوئے سخت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ کپڑے جو عریانی کے زمرے میں آتے ہیں، وہ قابلِ جرم ہیں۔ شولڈرز



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور گھٹنے ہر حال میں ڈھکے ہونے چاہییں۔

1998ء میں عالمی ادارے یونیسکو نے شارجہ کو (The cultural Capital of Arab World) کے خصوصی ایوارڈ سے نوازا تھا۔

تیس سال کی اتنی قلیل مدت میں ایک معمولی سی ریاست نے عالمی نقشے پر کس طرح اتنی اہمیت حاصل کرلی؟ اس کا جواب اتنا ہی ہے کہ برداشت، رواداری، قانون کی پاسداری اور حکمرانوں کی وسعتِ قلبی، روشن خیالی اور اپنے ملک کی خوش حالی اور ترقی کے لیے دل و دماغ کھلے رکھنا ہی اس کی وجوہات ہیں۔

☆......☆

جب ہم شارجہ پہنچے تو رمضان المبارک کا آخری عشرہ چل رہا تھا۔ دل خوش ہوگیا یہ دیکھ کر کہ ہمارے ملک کے برعکس شارجہ میں رمضان شریف کا احترام نہیں بلکہ اکرام کیا جاتا ہے۔ مساجد نمازیوں سے بھری رہتی ہیں اور رمضان شریف کا احترام سرکاری طور پر بھی کیا جاتا ہے۔ شہر کو خاص کر چوراہوں کو جا بجا روشنیوں سے سجایا جاتا ہے۔ رمضان المبارک کے سائن بورڈز خصوصی طور پر نصب کیے جاتے ہیں۔ دکانیں اور بازار رات گئے تک کھلے رہتے ہیں اور مختلف کمپنیز اور سپر مارکیٹس اور شاپنگ مال میں رمضان کے حوالے سے خصوصی ڈسکاؤنٹ پر انعامی اسکیموں کا اعلان کیا جاتا ہے۔ غرض کہ جس جانب بھی آپ کی نظر اٹھے، آپ محسوس کریں گے کہ رمضان شریف کے لیے خصوصی انتظامات کیے گئے ہیں۔ ہمارے دل سے دعا نکلی کہ اے کاش...... خداوندِ قدوس! ہمارے حکمرانوں کو بھی یہ توفیق عطا فرما کہ وہ کم از کم اس ماہ کے تقدس کا ہی خیال کرلیا کریں۔

اس روز ہم لوگ ڈریگون کی سیر کے ارادے سے نکلے۔ یہ ایک شاپنگ مال ہے جو ہمارے ہر آزمائش میں پورے اترنے والے دوست ملک عظیم چین کا تعمیر کردہ بظاہر یہ ایک شاپنگ مال ہے لیکن یہ چائنا ٹاؤن کا ایک حصہ ہے۔ مکمل چینی انداز ثقافت اور صنعتی ترقی کا آئینہ دار۔ اتنا طویل و عریض کہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص ایک مرتبہ میں اس شاپنگ مال کی سیر مکمل کرلے۔ یہاں پر آپ چینی ساختہ سوئی سے لے کر ٹرک تک ہر چیز نہ صرف خرید سکتے ہیں بلکہ ان بڑی بڑی مشینوں کی خرید سے لے کر ان کی پیکنگ اور جہاز تک شپمنٹ تک تمام کارروائی مکمل کرواسکتے ہیں۔ یہاں کے وسیع ترین گودام جو چینی مال سے بھرے ہوئے ہیں، طویل و عریض رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں، دیکھ کر آنکھیں حیرت سے کھل جاتی ہیں اور محنت کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ 60 سال پہلے افیون کے نشے میں دھت رہنے والی قوم نے کس طرح محنت میں راحت کے مقولے کو سمجھا، اس راز کو جانا اور آج دنیا بھر میں اپنے آپ کو ایک صنعتی جن کی حیثیت سے منوا لیا۔ اس ڈریگون سپر مارکیٹ سے صنعتی ساختہ مصنوعات بشمول ہیوی مشینری پورے یورپ اور امریکہ کی منڈیوں تک پہنچتی ہیں۔ ڈریگون سے ملحق ایک جدید خوب صورت بستی بھی آباد ہوچکی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دنیا بھر کے ملکوں کے نام سے ٹاؤن آباد ہیں۔ چائنا ٹاؤن چینی طرزِ تعمیر کے مکانات اور فلیٹس پر جبکہ اسی طرح امریکی، برطانوی، اطالوی، ولندیزی طرزِ تعمیر کے مکانات ان ہی ملکوں کے ٹاؤنز کہلاتے ہیں...... قصہ مختصر آپ شارجہ جائیں اور ڈریگون نہ دیکھیں تو سمجھیں کہ آپ نے شارجہ دیکھا ہی نہیں!!

اس دلچسپ سفرنامے میں
محمد نعیم صاحب کا آئندہ ماہ پڑاؤ ابوظہبی میں ہوگا





انور فرہاد

# زندگی لکھ رہا ہوں میں

حامد علی سید کا خیال

زبان رکھتے ہیں پتھر بھی چٹانیں بولتی ہیں
جو چہروں پر لکھی ہیں داستانیں بولتی ہیں

**ہمارے سینئر ترین لکھاری کی بھرپور زندگی کی کہانی اُن کے لفظوں کی زبانی**

نامور شاعر اور نغمہ نگار سرور بارہ بنکوی میرے قریب کھڑے مشتاق احمد یوسفی کی کتاب "چراغ تلے" کی ورق گردانی کررہے تھے۔ "یار کیا زبردست لکھاری ہے۔ تم نے پڑھی ہے یہ کتاب؟"

"جی ہاں، پڑھی ہے اور نہ صرف پڑھی ہے بلکہ بے شمار لوگوں کو پڑھوائی بھی ہے۔" یہ کتاب میں نے سرور صاحب کے کہنے پر ہی منگوائی تھی۔

"ایک نئے طنز و مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کی کتاب بازار میں آئی ہے۔ اپنی دکان کے لیے یہ کتاب ضرور منگواؤ اور لوگوں کو پڑھواؤ۔ بالکل ایک نیا اسلوب ہے، نیا انداز نگارش ہے۔ ایسی شگفتہ اور شستہ تحریریں کہ کتاب ہاتھ سے رکھنے کو جی نہ چاہے۔" سرور صاحب کے کہنے کے بعد میں نے یہ کتاب لاہور کے مکتبۂ جدید سے منگوا کر اس کی متعدد کاپیاں فروخت کردی تھیں اور اب جب وہ میری دکان آئے تو اسی "چراغ تلے" کی ورق گردانی کرنے لگے پھر بولے۔

"میں جس مقصد سے تمہارے پاس آیا تھا، اس کا ذکر کرنا تو بھول ہی گیا۔" میں اُن کی طرف ہمہ تن گوش ہوگیا۔ وہ اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ "بات دراصل یہ ہے کہ کراچی میں میرے ایک دوست کو اپنے اخبار کے لیے ایک نمائندے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے مجھے کسی مناسب بندے کے لیے کہا تھا۔ میں نے انہیں تمہارا نام دے دیا ہے۔"

"سرور بھائی......! وہ کون صاحب ہیں اور اُن کا کون سا اخبار ہے، یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں؟"

"اُن کا نام الیاس رشیدی ہے اور اُن کا اخبار ہفت روزہ "نگار" ہے۔"

"دونوں نام تو آشنا ہیں مگر "نگار" تو فلمی اخبار ہے اور آپ جانتے ہیں کہ فلموں سے میری دلچسپی فلم



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھنے کی حد تک ہے۔ کوئی ادبی' سماجی یا سیاسی نوعیت کا اخبار ہوتا تو.....''

''ارے یار.....! دلچسپی نہیں ہے تو دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔''

''مگر میں کیا لکھوں گا اس اخبار کے لیے؟ مجھے تو فلموں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں؟''

''تمہیں بس یہاں بننے والی فلموں اور فلم والوں کی خبریں بھیجنی ہوں گی۔ تم ہفتے میں ایک دو بار اسٹوڈیو کے چکر لگا لینا جو باتیں معلوم ہوں' انہیں خبریں بنا کر بھیج دینا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے سرور بھائی.....! مگر مجھے ذرا سوچنے کا موقع تو دیں؟''

''سوچنا کیا ہے یار.....! میں نے تو تمہارا نام اس اعتماد کے ساتھ بھائی الیاس رشیدی کو لکھوا دیا ہے کہ تم میری بات رد نہیں کرو گے۔'' انہوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''ایک دو دن میں خبریں تیار کر کے انہیں بھجوا دو۔''

سرور صاحب نے غلط نہیں کہا تھا' میں اُن کی کوئی بات ٹال ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھ پر اُن کے بڑے احسانات تھے۔ نہ صرف ادبی حلقوں میں وہ بڑے اور مربی کی حیثیت سے میری رہنمائی کرتے تھے بلکہ نجی معاملات میں بھی بڑی معاونت کرتے تھے۔ جن دنوں میں شدید بے روزگاری کے کرب سے گزر رہا تھا' انہوں نے TNT ڈیپارٹمنٹ میں بڑی آسانی کے ساتھ مجھے ملازمت دلوا دی تھی۔ اس ڈیپارٹمنٹ کے چیف ایگزیکٹو اُن کے پرستار تھے۔ انہوں نے اپنے ایک سب اسٹیشن میں وہاں کے چیف انجینئر کو فون کیا اور میں بغیر کسی ٹیسٹ یا انٹرویو کے وہاں ملازم ہو گیا۔ ٹیلی گراف کی الف بے سے ناواقفیت کے باوجود ایک سال تک وہاں ملازمت کی اور پھر خود ہی چھوڑ دی۔ اس کے علاوہ بھی سرور صاحب کی نوازشیں بہت تھیں لہٰذا میرے لیے ان کی بات حکم کا درجہ رکھتی تھی جسے ٹالنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

اگلے ہفتے سے میں ''نگار'' کے لیے باضابطگی کے ساتھ فلمی خبریں بھیجنے لگا۔ یہ واقعہ 1960ء کا ہے۔ مہینہ مجھے یاد نہیں رہا۔ میں جوڈھاکے کے ادبی حلقے میں ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر و ادیب کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا تھا' اس میں فلمی صحافی کا بھی دم چھلا لگ گیا۔

اس گفتگو کے دوران چونکہ کتابوں کی دکان کا بھی ذکر ہوا ہے اس لیے اس دکان کے بارے میں بھی بتاتا چلوں۔ یہ دکان ڈھاکے کے بے حد خوبصورت اور ماڈرن نیو مارکیٹ میں تھی۔ ایسوسی ایٹڈ ٹریڈرز کے نام سے دو دکانیں تھیں۔ ایک گھڑیوں کی دکان اور ایک کتابوں کی دکان۔ معروف شاعر نوشاد نوری اِن دکانوں کے مالک تھے۔ نوشاد نوری صاحب نے پارٹنر کی حیثیت سے مجھے کتابوں کی دکان میں شریکِ کار بنایا تھا۔ یہ دکان ادبی کتابوں کی تھی جو ادیبوں' شاعروں کا مرکز تھی اور نوشاد نوری اور انور فرہاد کے حوالے سے وہاں کے ادبی حلقوں میں بہت جلد مقبول ہو گئی تھی خصوصاً شام کے وقت ادیبوں' شاعروں کی آمد و رفت زیادہ ہو جاتی تھی۔ یوں بھی ادب کے حوالے سے کوئی شخص نیو مارکیٹ آئے اور اس دکان میں حاضری نہ دے' یہ ممکن نہیں تھا۔ ایک سال تک کامیابی کے ساتھ چلنے کے باوجود یہ دکان بوجوہ بند کر دی گئی۔

دکان بند ہو گئی لیکن اس دکان داری کے دوران ایک شاعر و ادیب کو فلمی صحافی کا جو دم چھلا لگ گیا تھا' وہ برقرار رہا اور پھر یہ دُم وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتی ہی گئی۔ ایک وقت آیا کہ اس حوالے سے مجھے اُس وقت کے ڈھاکے کے واحد اُردو روزنامہ ''پاسبان'' کے فلمی صفحہ کا انچارج بنا دیا گیا جس پر میں



نے احتجاج بھی کیا جس کے نتیجے میں مجھے ادبی صفحہ کا بھی انچارج بنا دیا گیا۔ اس اخبار کی ملازمت کے دوران میں نے سرور بارہ بنکوی کی پہلی ذاتی فلم ''آخری اسٹیشن'' کی اسسٹنٹ ڈائریکٹری بھی کی۔ اس بارے میں تفصیلی بات آگے کروں گا' پہلے آپ کو فلم جرنلزم کے ابتدائی دور کی باتیں بتا دوں۔

میرے لیے یہ تجربہ بڑا انوکھا تھا۔ میں ابتدا ہی سے ذاتی طور پر الگ تھلگ رہنے والا شخص ہوں۔ اپنی طبیعت کے برخلاف لوگوں سے ملنا جلنا مجھے پسند نہیں۔ فلم والے لوگ میرے لیے بالکل نئے تھے جبکہ اُن کا انداز بھی بہت مختلف' مہینوں میں نے ان کا نظارہ دور دور سے کیا۔ کسی کو یہ نہیں بتاتا تھا کہ میں کون ہوں۔ میں فلم والوں کے لیے بہت آہستہ آہستہ پیاز کی پرتوں کی طرح کھلا۔ فلم والوں کے لیے ''نگار'' بڑی اہمیت کا حامل اخبار تھا۔ جب انہیں معلوم ہو گیا کہ یہ بندہ ''نگار'' کا نمائندہ ہے تو اسٹوڈیو جاتے ہی بہت سے لوگ میرے گرد جمع ہو جاتے۔ اپنی فلموں اور ان کی شوٹنگ کے بارے میں بتاتے' پروجیکشن ہال میں اگر کسی فلم کے رشز چل رہے ہوتے تو لے جا کر دکھاتے' کسی سیٹ پر شوٹنگ ہو رہی ہوتی تو اصرار کرتے کہ شوٹنگ دیکھ کر جایئے گا۔ شوٹنگ کے دوران یا بعد میں فلم سے متعلق لوگ اپنے اپنے مسئلے مسائل بیان کرتے۔ مجھے یاد ہے' ہدایت کار قاضی ظہیر کی ایک بنگالی فلم کی شوٹنگ کے وقفے میں اُس فلم کی ایک عمر رسیدہ کیریکٹر اداکارہ نے رو رو کر مجھ سے کہا تھا۔

''قاضی صاحب ایک شاٹ مجھ سے 52 بار ری ٹیک کروا چکے ہیں پھر بھی وہ مطمئن نہیں ہوتے ہیں۔ انور صاحب.....! میں کوئی نئی یا اناڑی اداکارہ نہیں پھر بھی وہ میری پرفارمنس سے مطمئن نہیں ہو رہے ہیں۔ ہو سکے تو آپ ہی انہیں سمجھایئے۔''

وہ آج کے مقابلے میں بہت اچھا دور تھا۔ رامیٹریل بہت سستا تھا اس لیے اچھے ڈائریکٹر کسی سین کے حوالے سے سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔ جب تک مطمئن نہیں ہو جاتے تھے' ایک ایک شاٹ کو بار بار فلماتے تھے۔ یوں تو ڈھاکے میں متعدد بڑے اور معیاری انگریزی اور بنگالی زبان کے اخبار تھے لیکن فلم انڈسٹری کے لوگ ''نگار'' کو بڑی اہمیت دیتے تھے' سو تھوڑے عرصے کے بعد فلم والوں سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ اردو فلموں میں کام کرنے والے بنگالی اداکار اور اداکارائیں ہمیشہ اس بات کی متمنی رہتیں کہ ان کی کوئی خبر یا کوئی تصویر ''نگار'' میں شائع ہو جائے۔

اداکار ندیم کی پہلی فلم ''چکوری'' بننے اور ریلیز ہونے سے پہلے اداکار عظیم ہدایت کار احتشام اور مستفیض کے لیوفلمز کا خاص ہیرو تھا جسے رحمان کے بعد زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ ''چکوری'' کی شوٹنگ شروع ہونے سے ریلیز کے پہلے تک میں نے اس فلم کی ''نگار'' میں مختلف انداز سے جو کوریج دی' اُس پر عظیم نے ایک بار جل بھن کر مجھ سے کہا۔

''میں اتنے دنوں سے اتنی بڑی بڑی فلموں میں کام کر رہا ہوں' تم نے مجھے وہ کوریج نہیں دی جو بالکل نئے اداکار ندیم کو دے رہے ہو جس کی فلم ابھی ریلیز بھی نہیں ہوئی ہے؟ وہ تمہارا ہم زبان بھائی ہے نا' اس لیے تم نے اسی کا گانا' گانا شروع کر دیا ہے۔''

''ابے نہیں یار.....! میرا ہم زبان بھائی تو ہارون بھی ہے' جلیل افغانی بھی ہے' سہیل بھی ہے' عرفان بھی ہے اور ڈیئر اصغر بھی ہے؟ بات ہم زبان یا غیر ہم زبان کی نہیں' بات تو پرفارمنس کی ہے' فنی خوبیوں کی ہے' بے شک ندیم کی فلم ابھی ریلیز نہیں ہوئی ہے لیکن اس کی اداکارانہ صلاحیتوں نے منہ سے بولنا شروع کر دیا ہے۔ جو لوگ اُس سے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اداکاری کروا رہے ہیں' وہ بھی اس کے ہم زبان نہیں' اس کے باوجود وہ بھی اش اش کر رہے ہیں اس کی ایکٹنگ دیکھ کر۔"

اداکارہ شبنم سے ملاقات ہوتے ہی وہ "السلام علیکم!" کہنے میں ہمیشہ پہل کر جاتی تھی۔ اسی طرح فلمساز و ہدایت کار محمد صادق کے "لبدھک" فلم کا پروڈکشن انچارج آشیش کمار جو چھوٹے موٹے کردار بھی ادا کرتا تھا' مجھے دیکھتے ہی بڑے خلوص سے سلام کرتا۔ "السلام علیکم!" اگرچہ یہ دونوں غیر مسلم تھے۔ مجھے تو آشیش کمار کے بارے میں بہت دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ہندو ہے۔ میں اس کے نام سے بہت دنوں تک ناواقف تھا۔

فلم والوں سے دوستی کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ ان سے اکثر "اندر" کی باتیں معلوم ہو جاتی تھیں جن کی مدد سے مجھے ایکس کلوسیو خبریں بنانے کا موقع مل جاتا تھا۔ اسی طرح مجھے ندیم کی شادی کی خبر ملی تھی جو بڑے ہی خفیہ طریقے پر نکاح کے مرحلے سے گزری تھی۔ میں اُس ہفتے کا پریس میٹر بذریعہ پی آئی اے بھیج چکا تھا لہٰذا ٹیلی گرام کر کے دفتر کو یہ خبر بھجوائی کہ "چکوری" کے ہیرو ندیم کو "چکوری" کے ہدایت کار احتشام کی بیٹی فرزانہ کے ساتھ بے حد خفیہ طریقے پر احتشام مستفیض کے پارٹنر' تقسیم کار اور گلستان سنیما کے مالک انیس دوسانی کے گھر میں نکاح کے بندھن میں باندھ دیا گیا ہے۔ اس تقریب میں چند انتہائی قریبی رشتے داروں نے شرکت کی۔ حسین اعظمی اُن دنوں "نگار" کے سب ایڈیٹر تھے۔ الیاس بھائی کو چونکہ دونوں کے رومانس کا پس منظر معلوم تھا لہٰذا اس خبر کو شہ سرخی کے طور پر انہوں نے ڈسپلے کیا جس کی اشاعت کے بعد گویا ایک طوفان برپا سا ہو گیا تھا۔

یہ شمارہ چھپ کر بازار میں آیا تو میرے صحافی دوست عقیل پرویز نے اس خبر کو پڑھ کر دکھ کا اظہار کیا کہ ندیم نے یہ خبر مجھے کیوں نہیں بتائی؟ وہ بھولا بادشاہ یہی سمجھا کہ ندیم نے خود "نگار" کے نمائندہ کو بتائی ہے۔ وہ سیدھا اخبار لے کر ایف ڈی کے نگار خانے پہنچ گیا۔ اس کے ایک سیٹ پر سرور بارہ بنکوی کی دوسری فلم "تم میرے ہو" کی شوٹنگ ہو رہی تھی اور ندیم فلم کے ہیرو کی حیثیت سے اداکاری کر رہے تھے۔ وقفہ ہوا تو ندیم نے عقیل پرویز کو دیکھ کر ہیلو ہائے کہا جس پر میرے بھولے بادشاہ نے آگے بڑھ کر شکایت کی۔

"ندیم صاحب.....! آپ سے یہ امید نہیں تھی کہ آپ اپنی شادی کی خبر صرف انور فرہاد کو دیں گے؟ آپ نے مجھے اس کی ہوا تک لگنے نہیں دی؟"

"شادی.....؟ کیسی شادی.....؟" ندیم نے چونکتے ہوئے کہا۔ اس پر عقیل پرویز نے "نگار" کا تازہ شمارہ آگے بڑھا دیا۔ خبر پڑھ کر ندیم پر گویا بجلی گر پڑی۔ چند لمحوں تک تو گویا سکتے کا عالم رہا' اس کے بعد اسے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ سیٹ سے آندھی اور طوفان کی طرح نکلا۔ باہر اس کی کار کھڑی تھی۔ (یہ کار کیپٹن احتشام کی تھی۔) کار اسٹارٹ کر کے گویا اڑتا ہوا سسرال پہنچا۔ واضح رہے کہ "چکوری" کی نمائش کے پہلے ہی سے وہ احتشام مستفیض کے بنگلے میں رہنے لگا تھا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ فرزانہ کے علاوہ گھر کے دیگر لوگ حیران پریشان تھے کہ وہ شوٹنگ سے اچانک کیوں واپس آ گیا اور اس طرح اپنے آپ کو کمرے میں کیوں بند کر لیا؟ سب مل کر دروازہ کھلوانے کی کوشش کرنے لگے مگر دروازہ نہیں کھلا۔ اتنے میں نقی مصطفےٰ جو سرور صاحب کو "تم میرے ہو" میں اسسٹ کر رہا تھا' سرور صاحب کے کہنے پر اسٹوڈیو سے پہنچا۔ اس نے گھر کے حیران پریشان لوگوں کو موجودہ صورتِ حال کی وجہ بتائی۔ بڑی دیر بعد بہلا پھسلا کر دروازہ کھلوایا گیا تو ندیم کی بری حالت تھی۔

"میرا کیریئر تباہ ہو گیا..... میں لٹ گیا..... تباہ ہو گیا..... میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں اس وقت شادی بیاہ نہیں کروں گا..... اس طرح میری عوامی پذیرائی ختم ہو جائے گی..... مگر آپ لوگ نہیں مانے"..... "کچھ نہیں ہو گا' ایسا کچھ نہیں ہو گا۔" کہہ کر مجھے بے بس کر دیا مگر ہو گیا نا جو ہونا تھا۔ آپ لوگوں کو کیا ملا' تو میری ڈوب گئی نا؟"

برصغیر میں پہلے یہ بات عام تھی کہ اداکار یا اداکارہ کی شادی کے بعد ان کے پرستاروں کی محبت کا گراف گر جاتا ہے' ان کی مقبولیت کم ہو جاتی ہے جس سے ان کی ساکھ پر ناخوشگوار اثر پڑتا ہے۔ ندیم نے بھی اسی نکتۂ نظر سے فوری طور پر شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ شادی میں آپ ہی کی لڑکی سے کروں گا مگر تھوڑے عرصہ بعد جب فلم انڈسٹری میں میری جڑیں مضبوط ہو جائیں گی لیکن احتشام مستفیض کو شادی کی جلدی اس لیے تھی کہ وہ یہ سنہری زنجیر اس کے پیروں میں باندھ کر اسے اپنے پنجرے میں قید کر لینا چاہتے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو وہ لاہور کی فلموں میں کام کرنے کے بعد ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ انہوں نے بڑی مشکلوں سے ندیم کو بہلایا' پھسلایا اور اس بات کا یقین دلایا کہ ایسا کچھ نہیں ہو گا جیسا تم سوچ رہے ہو۔ ہمارے اثر و رسوخ بہت ہیں' ہم اس خبر کو غلط ثابت کر دیں گے۔ اس کی تردید چھپوا دیں گے جس کی انہوں نے بعد میں بھرپور کوشش بھی کی اور الیاس بھائی کو باور کرانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی کہ یہ خبر غلط ہے مگر انہوں نے اس کی تردید نہیں چھاپی۔ اِدھر اُن دونوں بھائیوں کے گھر میں فوری طور پر ایک خصوصی اہم میٹنگ ہوئی جس میں گھر کے تمام اہم افراد نے شرکت کی اور متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ انور فرہاد کو بلا کر پوچھا جائے کہ اُسے یہ خبر کیسے معلوم ہوئی؟ جبکہ اس خبر کی اشاعت پر اسے قرارِ واقعی سزا بھی دی جائے۔ انہوں نے میری گرفتاری کا پروانہ اپنے دربار کے چند درباریوں کو سونپا۔ اس سے پہلے کہ کوئی 'درباری' مجھے گرفتار کر کے لے جاتا' میرے کچھ مخبروں نے مجھے ساری باتوں سے آگاہ کر کے کہا۔

"خبردار..... جو آپ کسی کے کہنے سننے پر لیوفلمز کے دفتر گئے۔"

میں اتنا اناڑی بھی نہیں تھا کہ وہ بلائیں تو ایسے حالات میں' میں دوڑا چلا جاؤں۔ آخر انہوں نے یہ خبر بھجوائی کہ اگر میں اُن کے بنگلے پر نہیں ملنا چاہتا تو پریس کلب میں ملاقات طے کر لیں لیکن میں نے اُن کی یہ پیشکش بھی قبول نہیں کی۔ کچھ عرصے تک کشیدگی برقرار رہی۔ بھائی الیاس اور ان کے اخبار سے بھی وہ ناراض رہے لیکن اس ناراضگی کے باوجود جب "چکوری" اور ندیم کو "نگار ایوارڈز" ملے تو اُن کا غصہ ختم ہو گیا۔

اب آیئے' آپ کو اپنی اسسٹنٹ ڈائریکٹری کی کہانی بھی سنا دوں۔ میں روزنامہ "پاسبان" کے دفتر میں اپنی ڈیوٹی پر تھا کہ سرور صاحب کے چھوٹے بھائی حفیظ الرحمان میرے پاس آئے اور سرور صاحب کا پیغام دیا کہ آپ کو سرور صاحب نے دو ہزاری اسٹیشن پر بلوایا ہے۔

"کیوں' خیریت تو ہے؟"

"خیریت ہی تو نہیں ہے اسی لیے تو آپ کو بلایا ہے۔" پھر اس کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "اُن کا ایک اسسٹنٹ جو آرٹسٹوں کے مکالمے درست کرواتا تھا' اس کی ناقص کارکردگی پر اُسے نکال دیا گیا ہے۔ اب اُس کی جگہ فوری طور پر آپ کو پُر کرنی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوگی۔"

"مگر میں اخبار کی نوکری چھوڑ کر کیسے جاؤں گا؟"

"آپ صرف ایک ہفتہ کی چھٹی کی درخواست دے دیں' ایک ہفتے کے بعد یونٹ واپس آ جائے گا' آپ ایک ہفتے کے بعد اپنی ڈیوٹی جوائن کر لیجیے گا۔"

وہی حکم حاکم' مرگِ مفاجات والی بات تھی۔ سرور بھائی کا حکم ٹالنا میرے بس کی بات نہیں تھی لہٰذا اُسی شام حفیظ الرحمان نے مجھے ریل پر بٹھا کر دو ہزاری روانہ کر دیا۔ دو ہزاری چنا گانگ سے تھوڑے فاصلے پر آخری اسٹیشن ہے۔ سرور صاحب کی پہلی فلم کا نام بھی "آخری اسٹیشن" اسی حوالے سے رکھا گیا تھا۔ یہاں کوئی ہفتہ' دس دن پہلے سے شوٹنگ جاری تھی۔ ہارون' شبنم' رانی' محفوظ اور جلیل افغانی وغیرہ اس فلم کے کلیدی آرٹسٹ تھے۔ یونٹ یہاں کے ڈاک بنگلے میں ٹھہرا ہوا تھا جبکہ شوٹنگ کا لوکیشن دو ہزاری اسٹیشن تھا۔ شبنم اس فلم میں ایک پگلی کا کردار ادا کر رہی تھی جو انتہائی خراب و خستہ حال میں اسٹیشن پر آوارہ گھومتی رہتی تھی۔ کسی سے کچھ بولتی چالتی نہیں تھی' بس کبھی کبھی کسی شخص کو دیکھ کر پوچھتی۔ "تمہارے پاس بیڑی ہوگی بابو.....؟" اُسے بیڑی مل جاتی تو وہ اس کے کش لے کر اپنے خیالوں میں کھو جاتی۔

اس پگلی کا پس منظر یہ تھا کہ کبھی ایک بے وفا شہری بابو اُس سے اُس کا سب کچھ لے کر واپس چلا گیا تھا یہ کہہ کر کہ وہ بہت جلد واپس آ کر اُسے اپنے ساتھ شہر لے جائے گا۔ وہ اُس کی راہ تکتے تکتے اس حال کو پہنچ گئی مگر وہ نہیں آیا۔ وہ ہر ٹرین کی آمد پر اسٹیشن آ کر اسے تلاش کرتی تھی۔ اس لوکیشن پر ایک کتے کا کردار بھی تھا جسے بطور پرفارمر خصوصی طور پر ڈھاکے سے لایا گیا تھا۔ ایک منظر جس میں یہ دکھایا جانا تھا کہ رشوت کا مال کتے بھی نہیں کھاتے مگر اس منظر کی عکس بندی کے وقت اس اداکار کتے نے بہت مایوس کیا۔ جب کسی طرح مطلوبہ اداکاری اس سے نہیں ہوئی تو مجبوراً اسٹیشن پر گھومنے والے آوارہ کتے سے اداکاری کروائی گئی اور اس نے مطلوبہ شاٹ فلم بند کروا کر سب کو حیران کر دیا۔ وہ رشوت کے مال تک گیا' اسے سونگھا اور پلٹ کر واپس آ گیا۔

ایک ہفتے کے اندر اس لوکیشن کا سارا کام مکمل کر لیا گیا جس کے بعد ہم سب ڈھاکے واپس لوٹ آئے۔ میں نے تو بس یہی سمجھا کہ میرا کام ختم ہو گیا لیکن سرور صاحب نے کہا۔ "فلم کی تکمیل تک یہ شعبہ اب تم ہی کو سنبھالنا ہے۔" لہٰذا ان کا یہ حکم بھی ماننا پڑا لیکن ان کی دوسری فلم "تم میرے ہو" اور تیسری فلم "آشنا" کے موقع پر میں نے بڑی خوبصورتی سے انکار کر دیا۔ خوبصورتی ان معنوں میں کہ میں نے انہیں اپنے سے کہیں بہتر اسسٹنٹ ڈائریکٹر منتخب کرنے کا مشورہ دیا۔ "تم میرے ہو" کے لیے نقی مصطفےٰ کا اور "آشنا" کے لیے عقیل پرویز کا نام تجویز کیا لہٰذا ان دونوں نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ سرور بارہ بنکوی کی آخری فلم "کیمپ نمبر 999" جو بھارت میں جنگی قیدیوں کے موضوع پر وہ بنانے والے تھے لیکن ان کی زندگی نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور یہ فلم اپنے آغاز سے پہلے ہی اختتام پذیر ہو گئی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں کراچی میں منیر حسین صاحب کے ماہنامہ "فلم ایشیا" کی سب ایڈیٹری کر رہا تھا۔ ایک دن دفتر میں فون آیا۔ سرور صاحب بول رہے تھے۔

"تم سے کچھ ضروری کام ہے' میرے گھر پر ضرور ملو۔"

ان کے دیئے ہوئے پتے پر شام کو چھٹی کے بعد پہنچا تو بولے۔ "انور فرہاد.....! میری فلم "کیمپ نمبر 999" کی ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ میں



چاہتا ہوں کہ اس فلم میں تم میرے ساتھ رہو۔ اچھی خاصی تفریح بھی ہو جائے گی۔ فلم کی اچھی خاصی شوٹنگ سمندری سفر کے دوران سمندری جہاز میں ہوگی اور....."

میں ہنسنے لگا۔ مجھے ہنستا ہوا دیکھ کر حیرت سے بولے۔ "ہنس کیوں رہے ہو؟ کیا میری بات؟"

"آپ کی بات پر نہیں' اپنے حالات پر ہنس رہا ہوں۔ یہ ڈھاکہ نہیں ہے سرمد بھائی.....! کراچی ہے۔ میں چھٹی کی درخواست دوں گا تو میری مکمل چھٹی کر دی جائے گی۔ اب میں چھڑا چھانٹ نہیں' بیوی بچے والا ہوں۔ یوں بھی یہاں تن تنہا رہتا ہوں۔ بیوی بچے کو کس پر چھوڑ کر جاؤں گا؟ میری مجبوری کو سمجھ کر میرے انکار کی گستاخی کو معاف فرما دیں۔"

سرور بارہ بنکوی نے میری بیان کردہ مجبوریوں کی وجہ سے کوئی زبردستی نہیں کی۔ یہ مجبوریاں تو واقعی تھیں لیکن ایک بات اور بھی تھی' جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ فلم نگری کا ماحول مجموعی طور پر مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہاں سارے لوگ ہی خراب ہوتے ہیں۔ اچھے بھی ہوتے ہیں لیکن اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو الگ ہی کیٹگری کے ہوتے ہیں جنہیں مجھ جیسا مزاج کا شخص برداشت نہیں کر سکتا۔

میری کہانی کے آغاز میں کئی حوالے سے نقی مصطفےٰ کا ذکر ہو چکا ہے لہٰذا بہتر ہوگا کہ اس کے بارے میں بھی کچھ بتاتا چلوں۔ بے حد ٹیلنٹڈ شخص ہے' بطور مصنف' مکالمہ نگار اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر بڑی اچھی فلموں اور ہدایت کاروں کے لیے کام کیا ہے۔ خان عطاالرحمان کی نگار ایوارڈ یافتہ فلم "نواب سراج الدولہ" کے مکالمے لکھ کر بہترین مکالمہ نگار کا نگار ایوارڈ حاصل کیا تھا۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب "چندا" اور "تلاش" کی سپر کامیابیوں کے بعد ڈھاکہ فلم انڈسٹری میں اردو فلموں کا سیلاب آ گیا تھا۔ سرور بارہ بنکوی کا تعلق بھی چونکہ ان دونوں فلموں سے بطور نغمہ نگار اور اسکرپٹ رائٹر تھا اس لیے ان کی مصروفیات بھی بے حد بڑھ گئی تھیں۔ اسی دوران ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا۔

"انور فرہاد.....! قاضی ظہیر بھی اردو فلم بنا رہا ہے اور مجھ سے کام کروانا چاہتا ہے جبکہ میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے اس لیے تم چلے جاؤ اور اس کا کام کر دو۔" مگر میں خود قاضی ظہیر کے پاس نہیں گیا بلکہ سرور بارہ بنکوی کے حوالے سے نقی مصطفےٰ کو بھیج دیا۔ اُن دنوں وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں عمرانیات میں ایم اے کر رہا تھا۔ میری اس سے بہت اچھی دوستی تھی اور میں جانتا تھا کہ وہ بے پناہ صلاحیتوں کا مالک نوجوان ہے۔ اب تک اس نے عملی طور پر فلم کے لیے کوئی کام نہیں کیا تھا لیکن قاضی ظہیر جیسے تجربہ کار ہدایت کار کو اس نے بہت متاثر کیا۔ نہ صرف اس کی فلم "بندھن" کے خوبصورت مکالمے تحریر کیے بلکہ قاضی صاحب کے اصرار پر اس فلم میں بطور نائب ہدایت کار انہیں اسسٹ بھی کیا۔ اسی فلم سے اس کی مکالمہ نویسی کے ساتھ اسسٹنٹ ڈائریکٹری چل نکلی۔ اس کے بعد اس نے سرور صاحب کے ساتھ بھی کام کیا اور احتشام اور مستفیض کی فلموں میں بھی اپنی فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا جبکہ خان عطاالرحمان کے ساتھ اس کا سمبندھ اتنا پختہ ہو گیا کہ جب تک وہ ڈھاکے میں رہا' ان کا رائٹ ہینڈ بن کر رہا۔ خان عطا کی فلم "سوئے ندیا' جاگے پانی" اور "نواب سراج الدولہ" کے دوران نہ صرف ان کو اسسٹ کیا بلکہ ان سے بہت کچھ سیکھا بھی۔ ڈھاکے سے لاہور آنے کے بعد ہدایت کار فرید احمد کے ساتھ کام کیا۔ اس کے بعد نیف ڈیک کی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملازمت کرلی اور عالمی شہرۂ آفاق فلمیں دکھانے کے شعبہ کے سربراہ کی حیثیت سے مدتوں وابستہ رہا۔ نیف ڈیک ختم ہونے کے بعد کراچی آ گیا جہاں اس کے والدین اور بھائی بہن رہائش پذیر تھے۔ یہاں مختلف نوکریاں کرنے کے بعد یہاں کراچی میں ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل سے وابستہ ہو گیا تھا۔

عقیل پرویز جسے میں نے اپنی جگہ سرور صاحب کے ساتھ لاہور بھجوایا تھا' وہ بھی بڑے کام کا بندہ تھا۔ اسے بھی میری طرح لکھنے کی بیماری اسکول کے زمانے سے تھی۔ بچوں کے پرچوں میں کہانیاں لکھتے لکھتے اخباروں کا رپورٹر بن گیا۔ لاہور کے روزنامہ ''امروز'' اور کراچی کے ''حریت'' اخبار کے لیے طویل عرصے تک فلمی نامہ نگار کی حیثیت سے کام کیا۔ لاہور میں سرور صاحب کی فلم ''آشنا'' کے علاوہ نغمہ نگار یوسف اختر کی فلم ''ساون آیا' تم نہیں آئے'' کی اسسٹنٹ ڈائریکٹری کی۔ عرصہ تک لاہور میں رہنے کے بعد کراچی آ گیا اور اپنا آبائی کام تعمیراتی ٹھیکے داری شروع کر دی۔ یہ دور اس کی نامہ نگاری کے دور کے مقابلے میں زیادہ خوشگوار تھا مگر زندگی نے وفا نہیں کی' شوگر کی بیماری اسے دیمک کی طرح چاٹ گئی اور وہ بھریا میلہ چھوڑ کر عدم آباد سدھار گیا۔ جن دنوں میں اسے سرور صاحب کے ساتھ ''آشنا'' سے آشنائی کے لیے لاہور بھیج رہا تھا' مجھ سے کہنے لگا۔ ''تمہارے کہنے پر میں لاہور جا رہا ہوں۔ اب تم میرے کہنے پر میرا کام کر دیا کرنا' جب تک میں واپس نہیں آتا ہوں' تم ہر ہفتہ نگار خانے کے شب و روز لکھ کر جناب حمید اختر کے نام روزنامہ ''امروز'' کے دفتر بھجوایا کرنا۔'' اور میں کئی مہینوں تک ڈھاکے کی ڈائری ''امروز'' کے دفتر بھیجتا رہا۔ اس ذکر پر یاد آیا کہ میں نے روزنامہ ''جنگ'' کراچی کے فلم ایڈیشن کے لیے بھی کئی مہینوں تک کام کیا تھا۔ یہ 1966ء کی بات ہے۔ بھائی الیاس رشیدی نے اس سال ہونے والی ''نگار ایوارڈ'' کی تقریب میں شرکت کے لیے مجھے کراچی بلوایا تھا۔ یہ تقریب کراچی میں ہونے والی تھی اور اس تقریب کے ساتھ ملکۂ ترنم مادام نور جہاں کی تاج پوشی بھی ہونے والی تھی۔ بہت بڑے پیمانے پر ایوارڈ اور تاج پوشی کی تقریب کی تیاریاں کی گئی تھیں لیکن تقریب کے انعقاد سے پہلے نامور ہدایت کار خلیل قیصر کا لاہور میں مرڈر ہو گیا۔ خلیل قیصر' بھائی الیاس کے بہت ہی قریبی دوست تھے۔ اس سانحہ قتل کے بعد ایوارڈ اور تاج پوشی کی تقریب ملتوی کر دی گئی۔ انہوں نے مجھے بھی بذریعہ ٹیلی گرام آنے سے منع کر دیا تھا لیکن ڈھاکے میں ٹیلی گرام پہنچنے سے پہلے میں کراچی پہنچ گیا۔ بہرحال یہاں نو ہفتے رہنے کے بعد واپس ڈھاکہ گیا۔ اسی دوران نگار کے دفتر میں انعام درانی عرف ڈیڈی سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ اُن دنوں وہ ''جنگ'' کے فلم ایڈیشن کے انچارج بھی ہوا کرتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے۔

''انور فرہاد.....! ''جنگ'' کے لیے بھی لکھو نا؟''

''کیا لکھوں؟''

''تم ہر ہفتہ ڈھاکے کی کچھ فلمی خبریں اور فلموں کی کچھ تصویریں بھیج دیا کرو۔ میں اس کے عوض ایک معقول رقم تمہیں مہینے کے مہینے بھجوا دیا کروں گا۔'' اس کے بعد انہوں نے اپنے لیٹر پیڈ پر یہ ساری باتیں لکھ کر دے دیں۔ واپسی کے بعد میں ڈیڈی کے حسبِ حکم انہیں خبریں اور تصویریں ارسال کرنے لگا جو ہر ہفتہ میرے نام کے ساتھ شائع ہونے لگیں۔ ایک مہینہ گزرنے کے بعد جب معاوضہ کے نام پر کوئی رقم موصول نہیں ہوئی تو میں نے خط لکھا۔

''ڈیڈی جی..... پیسے بھجوایئے۔'' اُدھر سے کوئی



جواب نہیں آیا۔ بہرحال میں نے اپنا کام جاری رکھا۔ اگلے مہینے بھی جب یہی صورتِ حال برقرار رہی تو میں نے بذریعہ خط دوبارہ تقاضہ کیا۔ جواب تو کوئی نہیں آیا البتہ خبروں کے ساتھ چھپنے والا میرا نام اخبار سے غائب کر دیا گیا۔ میں نے اس کے بعد بھی لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے ساتھ خط بھی لکھتا رہا۔ ڈیڈی کو ان کا وعدہ یاد دلاتا رہا۔ جواباً ان کا ری ایکشن یہ ہوا کہ میری خبروں اور تصویروں کی اشاعت بند کر دی گئی۔ اب میں نے یہ ساری باتیں لکھ کر اور ڈیڈی کا دیا ہوا اجازت نامہ جو انہوں نے اپنے لیٹر پیڈ میں مجھے دیا تھا' ''جنگ'' کے مالک و مدیرِ اعلیٰ جناب میر خلیل الرحمان صاحب کو بذریعۂ خط بھیج دیا۔ میر صاحب کی جانب سے ایک ہفتہ بعد اس کا جواب موصول ہو گیا۔

''آپ کا معاہدہ ''جنگ'' سے نہیں' انعام درانی صاحب سے ہوا تھا اس لیے جو کچھ آپ کے ساتھ ہوا' اس کا ذمہ دار ''جنگ'' نہیں' انعام درانی ہیں۔ آپ کی شکایت کے بعد میں نے اکاؤنٹ سیکشن سے معلوم کیا تو پتہ چلا' وہ آپ کے نام سے رقم وصول کرتے رہے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ سے ہمدردی کے اظہار کے علاوہ میں اور کچھ نہیں کر سکتا۔'' مجھے فوراً ہی نگار کے دفتر میں کچھ لوگوں کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔ ''بہت محتاط ہو کر ڈیڈی سے کوئی معاملہ طے کرنا۔'' مگر میں نے اس وقت ایسی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی کہ یہ ایسا کون سا بڑا معاملہ ہے کہ اس سلسلے میں محتاط رویہ اختیار کیا جائے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ بعد کی اطلاعات سے پتہ چلا کہ وہ اسی طرح کی حرکتیں کرتے رہتے تھے۔ میری شکایت پر میر صاحب نے میرے لیے تو کچھ نہیں کیا لیکن ڈیڈی کو فلم پیج کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا۔

بات لکھنے لکھانے کی چل رہی تھی تو یہ بتاتا چلوں کہ لکھنے کی یہ بیماری مجھے لگی کیسے؟ میں یہ نہیں کہوں گا کہ سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری۔ نہیں' ایسا نہیں ہے۔ شاید ورثے میں یہ بیماری مجھے ملی ہے۔ جب میں نے لکھنے پڑھنے کے حوالے سے ہوش سنبھالا تو والدِ محترم کو اُن کے نام مولوی محمد زین العابدین کے ساتھ حلم تخلص کے طور پر استعمال کرتے تھے جبکہ بڑے بھائی غزلوں اور نظموں کے شاعر تھے۔ دونوں کو پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ ابا جی دلی کے دو مشہور مذہبی جریدے ماہنامہ ''آستانہ'' اور ماہنامہ ''مولوی'' کے خریدار تھے۔ بھیا اُس دور کے مشہور ادبی پرچے ''ہمایوں' عالمگیر'' اور ''ادبِ لطیف'' خرید کر گھر لاتے تھے۔ وہ رضا علی وحشت کلکتوی کے شاگرد رشید شاکر کلکتوی کے شاگرد تھے۔ یہ تو تقسیمِ ہند سے پہلے کلکتے کی بات ہے۔ ڈھاکے میں سکونت اختیار کرنے کے بعد بھیا ''نقوش'' بڑی پابندی سے خریدا کرتے تھے پھر جب ڈاکٹر عندلیب شادانی کی ادارت میں ماہنامہ ''خاور'' نکلا تو اس کے آخری شمارے تک اس کے خریدار رہے۔ میرے لکھنے کا سلسلہ ڈھاکے میں 1950ء سے ہوا۔ نصابی کتابوں کے علاوہ میں نے بچوں کے رسالے بھی پڑھنا شروع کر دیئے تھے۔ دلی کا ''کھلونا'' کراچی کا ''بھائی جان'' اور لاہور کا ''تعلیم و تربیت'' بڑے شوق سے پڑھتا تھا اور دسمبر 1950ء سے ''تعلیم و تربیت'' میں میرے اشعار شائع ہونا شروع ہو گئے پھر نظموں کے ساتھ ساتھ نثر بھی لکھنے لگا۔ چھوٹے چھوٹے مضامین کے علاوہ کہانیاں بھی مختلف پرچوں میں چھپنے لگیں۔ کراچی سے بچوں کا ایک پرچہ ''کلیم'' نکلتا تھا۔ اس میں خوب لکھا۔ فیصل آباد سے ایک نیا پرچہ ''معصوم'' کے نام سے نکلا۔ اس کے ایڈیٹر سے خاصی دوستی ہو گئی۔ ہر مہینہ کی 10 تاریخ تک اس میں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جو کچھ بھیجتا' چھپ جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈھاکے میں اس پرچے کو مقبول بنانے میں جو کچھ مجھ سے ہوسکتا تھا' کرتا تھا۔ جب تک یہ پرچہ نکلتا رہا' میرے علاوہ میرے دوست عقیل پرویز وغیرہ بڑی پابندی سے چھپتے رہے۔ ''جنگ'' کے ادارہ سے نکلنے والا پرچہ ''بھائی جان'' بھی ہمارا پسندیدہ جریدہ تھا جسے ہم پڑھتے بھی تھے اور اس میں لکھتے بھی تھے۔ پی وی کی لیجنڈ لکھاری حسینہ معین بھی اُن دنوں بچہ رائٹر تھیں اور ''بھائی جان'' میں اُن کی کہانیاں بھی چھپتی تھیں۔ کراچی سے ''لوح و قلم'' نکلا تو اُس میں بھی لکھنا شروع کیا۔ انوار احسن صدیقی اس کے ایڈیٹر ہوا کرتے تھے اور یہ پرچہ ترقی پسند نوجوانوں کا ترجمان تھا۔

اسکول سے نکل کر جب کالج میں گیا تو ہمارے سینئر کہنے لگے۔ ''ارے بھئی اب تو تم بڑے ہوگئے ہو اس لیے اب بڑوں کے لیے لکھو۔'' لہٰذا بڑوں کے لیے لکھنا شروع کیا۔ ماہنامہ ''ماہ نو'' (اُن دنوں کراچی سے نکلتا تھا۔) پاکستان رائٹرز گلڈ کا پرچہ ''ہم قلم'' جمیل جالبی کے ''نیا دور'' مردان سے تاج سعید کی ادارت میں نکلنے والا ''قند'' صہبا لکھنوی کے ''افکار'' میں میری نظمیں اور غزلیں شائع ہونے لگیں۔ اسی طرح سرور بارہ بنکوی نے جب اپنا ادبی پرچہ ''آب و گل'' نکالا تو اس میں ان کی معاونت بھی کی اور لکھا بھی۔ ڈھاکے سے رائٹرز گلڈ کے زیر اہتمام ایک ضخیم مجلہ ''قلم کار'' کے نام سے نکلا تو اس کے ایڈیٹوریل بورڈ میں بھی شامل تھا اور اُس میں میری غزلیں اور نظمیں بھی شائع ہوئیں۔ اسکول کے زمانے ہی سے ادبی انجمنوں کے زیر اہتمام تنقیدی نشستوں کے انعقاد میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہا۔ اس سلسلے کی آخری اور سب سے اہم کڑی ''انجمنِ ادب'' کی تشکیل و تکمیل تھی جس کا کچھ عرصے جنرل سیکریٹری بھی رہا۔ اس انجمن کے سلسلے میں کچھ غیر معمولی جلسے بھی ہوئے جن میں ''جشنِ بہاراں'' بڑی اہم تقریب تھی۔ تین دنوں تک اس کا انعقاد رہا۔ اس میں شرکت کے لیے کراچی سے نامور ادیب شاہد احمد دہلوی بھی تشریف لائے تھے اور کلاسیکل راگ راگنیوں سے تقریب کی رونق بڑھائی تھی۔

ڈھاکے سے جب اردو ''چترالی'' کا اجرا ہوا تو ایس ایم پرویز صاحب کی جہاں تک ممکن ہوا' میں نے اور زین العابدین نے اُن کی رہنمائی کی۔ آج بھی ڈھاکے ہی میں ہیں اور وہاں کی فلموں کی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ ایس ایم پرویز جو اب مرحوم ہوگئے ہیں' ڈھاکے کی بنگالی فلموں کے ہدایت کار تھے۔ انہوں نے بنگالی زبان میں ''چترالی'' کے نام سے ایک ہفتہ روزہ فلمی اخبار نکالا تھا جو بہت مقبول ہوا پھر ایک وقت آیا جب ''آبزرور گروپ'' کے مالکوں نے چترالی کے حقوق خرید لیے۔ انگریزی اخبار ''پاکستان آبزرور'' کے مالکوں نے انہی کے زیر ادارت یہ اخبار جاری رکھا پھر جب ڈھاکے میں اردو فلمیں بننا شروع ہوئیں تو اس کا اردو ایڈیشن نکالنے کا بھی پروگرام ترتیب دیا گیا۔ یہ اخبار نکلا (اردو چترالی) اور بڑے طمطراق سے نکلا اور پورے پاکستان میں اس نے تہلکہ مچا دیا۔ پرویز صاحب اردو چترالی کے اسٹاف میں مجھے بھی شریک کرنا چاہتے تھے مگر ان کی شرط تھی کہ نگار سے اپنا رشتہ منقطع کرنا ہوگا مگر نگار سے میرا رشتہ اُس وقت تک اتنا مستحکم ہوگیا تھا کہ میرے لیے اسے توڑنا ممکن نہیں رہا تھا۔ میرے انکار کے بعد زین العابدین ایڈیٹر اور نقی مصطفےٰ' عقیل پرویز اور شہزاد منظر بطور سب ایڈیٹر منتخب کر لیے گئے۔

(جاری ہے)



# مسئلہ یہ ہے

## خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' ایک مفید معلوماتی اور مستقل سلسلہ ہے۔ یہ کالم خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں ان کی بھلائی کے جذبے کے ساتھ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اولین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے استفادہ کیا اور ہزاروں لوگوں نے اس مادی دنیا میں آیات قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ حاصل ہوتا رہا' اسی تناسب سے ہر ماہ وصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ گزشتہ کئی برسوں میں ان خطوط کی تعداد اتنی تجاوز کر گئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں جواب دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے اپنے جواب کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا کیونکہ پرچے کے صفحات بہر حال محدود ہیں۔ مجھے اس بات کا بھی احساس رہا ہے کہ لوگوں کے مسائل اور مشکلات بہت زیادہ اور عموماً فوری حل طلب ہوتی ہیں۔ ان کے لیے طویل انتظار ایک اذیت ناک کام ہے۔ انہی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جواب براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا' ان کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپر ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے اور مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں ہے۔ میری دوسری مصروفیات بھی ہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے اور بس۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور اس سے زیادہ قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے۔ صاحبِ استطاعت حضرات اور خواتین سے درخواست ہے کہ وہ ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں' وہ اپنی بساط کے مطابق اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ملک کے دور دراز علاقوں میں بسنے والی اُن خواتین کے جوابات بھی سپر ڈاک ہو جائیں گے جو کسی مجبوری کی بنا پر ڈاک خانے تک نہیں جا سکتیں اور =/300 روپے کا منی آرڈر کر سکتیں۔ یہ ایسی نیکی ہوگی جس کا اجر اس دنیا میں بھی ملے گا اور آخرت میں بھی۔ اب تک صرف ممالکِ غیر میں مقیم حضرات نے ازخود تعاون کیا ہے۔ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو قارئین کے خطوط اور میرے جوابات کو فوری سپر ڈاک کرنے کا ریکارڈ مرتب کرنے اور دیگر متعلقہ امور کو سرانجام دینے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری حل چاہتے ہیں تو برائے کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ لفافے میں بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ کا نمبر ضرور تحریر کریں۔ وہ تمام خطوط جو =/300 روپے ٹوکن منی اور جوابی لفافے کے بغیر موصول ہوں گے' ان کے جوابات حسبِ سابق پرچے میں شائع ہوتے رہیں گے۔ خط ارسال کرنے سے پہلے درج ذیل ہدایات نوٹ فرما لیں۔

(۱) براہِ راست جواب درکار ہو یا کالم کے ذریعے' دونوں صورتوں میں اپنا اور اپنی والدہ کا اصل نام تحریر کریں۔ کالم میں اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو اصلی نام کے ساتھ کوئی فرضی نام بھی تحریر کریں تاکہ مسئلہ اُسی نام سے شائع کیا جائے۔ جان بوجھ کر گمنام اور فرضی چٹھی کے خطوط نہ بھیجے جائیں۔ اپنے مسائل پوری سچائی کے ساتھ پیش کریں۔ غلط بیانی سے ہرگز کام نہ لیں۔ اس سے فائدے کی بجائے نقصان کا زیادہ احتمال ہے۔ (۲) منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ صرف ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔ (۳) اپنا مسئلہ مختصر' واضح اور کاغذ کی ایک جانب لکھیں۔ ایک خط میں دو سے زائد مسائل تحریر نہ کریں۔ (۴) کوئی عمل یا وظیفہ کریں تو نماز کی پابندی کا عہد کریں اور اپنے لیے دُعا کرنے سے پہلے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے دُعائے خیر کریں۔ (۵) صرف خصوصی وظائف کی اجازت درکار ہوگی۔ لفافے کو بند کرنے سے پہلے زیادہ گوند نہ لگائیں' اس طرح خط پھٹ جاتا ہے۔ ایسا ہی ہوتا ہے کہ عام ڈاک سے بھیجے جانے والے خطوط ہم تک نہیں پہنچتے لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ خط رجسٹری ڈاک سے بھیجے جائیں۔ جوابی لفافے پر مکمل پتا واضح اور خوشخط لکھا جائے۔ فوری جواب کے لیے اپنی ڈاک اِس پتے پر روانہ کریں۔

**ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' 110۔ آدم آرکیڈ' شہید ملت روڈ۔ کراچی۔**



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# ماہ ربیع الثانی

**عزیزو......!**

یہ ماہ ربیع الثانی ہے۔ اِس ماہ کی بڑی برکت ہے۔ بعض روایت میں ہے کہ اِسی ماہ کی یکم کو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور دوسری تاریخ کو اَمّاں حوا علیہا السلام کو خلق کیا۔ اِس ماہ کو روزی و رزق کا مہینہ بھی کہا جاتا ہے۔ بزرگوں سے روایت آ رہی ہے کہ اِس ماہ رزق کی کشادگی کے لیے جو کوئی سورۃ الحجر (پارہ ۱۴) لکھ کر اپنے بازو پر باندھے‘ خداوندِ عالم اُس کے رزق کو وسیع فرماتا ہے۔ سورۃ القارعہ (پارہ ۳۰) کے بارے میں بھی یہی وارد ہے مگر سورۃ کو لکھنے کے لیے کسی صاحبِ علم کا سہارا لیں کیونکہ اَعراب کی غلطی کا احتمال رہتا ہے۔ اِس مہینے میں گرم و تُرش اَشیاء کو بطور اجزائے خوراک بنانے سے پرہیز کرنا چاہیے کہ اِن اَیّام میں جسمانی تبدیلی عروج پر رہتی ہے لیکن پانی کا استعمال کثرت سے کرنا چاہیے تاکہ اندر سے بھی صفائی کا عمل تیز تر ہو۔ وضو اگر جسم کے باہری حصے کی صفائی ہے تو پانی کا پینا اندرونی اور نماز و اَوراد کا پڑھنا ذہنی بالیدگی کے لیے ضروری ہے۔ نمازِ تہجد کا اہتمام کرنا رزق کی زیادتی کا باعث ہے مگر اِس ماہ یہ اہتمام آسان ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے آسان کر دیا ہے تو کیوں نا اِس میں سبقت حاصل کی جائے۔



□ سنجیدہ۔ پشاور۔

○ محترم بابا جان! سلام کے بعد عرض یہ ہے کہ میں عرصہ بارہ سال سے آپ محترم سے اپنے تمام مسائل کے لیے وظیفے لیتی ہوں۔ پانچ ماہ قبل میں نے آپ سے شوہر کی نوکری کے لیے وظیفہ مانگا تھا۔ فی الحال وہ آغا خان لیبارٹری میں کام کرتا ہے لیکن گزارہ نہیں ہوتا۔ میرے پاس میری ساس اور بیمار دیور بھی رہتے ہیں جبکہ میرے چار بچے بھی ہیں۔ بابا جی! آپ نے مجھے اچھی سی نوکری کے لیے وظیفے میں سورۃ طٰہٰ کی آیت نمبر ۶۹ پڑھنے کو کہی تھی۔ وہ وظیفہ میں نے تین بار کیا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ چوتھی بار شروع کیا تو میرے شوہر کو اغوا کاروں نے اغوا کیا اور دس دن تک اپنے پاس رکھا۔ بابا جی! انہوں نے ہم سے شوہر کی رہائی کی چار لاکھ روپے لیے ہیں۔ بابا جی! خدا گواہ ہے کہ ہمارے پاس اپنے گھر میں دس ہزار روپے بھی نہ تھے‘ ہم بہت غریب لوگ ہیں‘ یہ چار لاکھ روپے ہم نے مختلف لوگوں سے قرض لے کر دیئے اور اپنے شوہر کو آزاد کرایا۔ بابا جی! برائے کرم مجھے کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ میرے شوہر کو اچھی نوکری مل جائے اور ہمارے اچھے دن آ جائیں۔ میں دُرود شریف بہت پڑھتی ہوں اور پیر کے دن روزہ رکھتی ہوں۔

☆ بیٹی سنجیدہ! تمہارے حالات جان کر بہت دکھ ہوا حالانکہ تم نے بہت کم لکھا ہے مگر میں سمجھ سکتا ہوں کہ تم لوگ کن پریشانیوں سے گزرے ہو گے۔ بہر حال اللہ بڑا کارساز ہے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار ترجمہ کے ساتھ سورۃ ق پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ انشاءاللہ‘ سب خیر ہو گی۔

□ خالد الفوادۃ۔ سعودی عرب۔

○ بابا جی! السلامُ علیکم! میری عمر اُس وقت چار سال کی تھی جب میرے ابا جی اور امی عمرہ کے ویزے پر سعودی عرب آئے تھے اور میرے ابا جی کو یہاں نوکری مل گئی تھی اور ہم یہاں سیٹ ہو گئے تھے۔ اب میرے ابا جی اور امی جی یہاں سعودی عرب میں فوت ہو چکے ہیں۔ میرا کوئی بہن بھائی‘ عزیز رشتہ دار پاکستان میں نہیں ہے۔ میرا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ مجھے ابا جی اور امی جی‘ بہن بھائی کی تلاش ہے جو مجھ دُکھی انسان کو سہارا دے سکیں۔ میں اُن کی خدمت کروں گا۔

☆ بیٹے خالد! تمہارا خط پڑھا۔ صرف ایک نصیحت کروں گا کہ والدین ہمیشہ ساتھ نہیں رہتے یا کوئی بھی رشتہ اتنا پائیدار نہیں کہ ہمیشہ ساتھ نبھائے سوائے رَبّ العزت کے‘ وہی ہمارا وارث ہے۔ تمہارے اردگرد ایسے بے شمار لوگ ہوں گے جن کا خیال رکھ کر تمہیں دائمی اطمینان اور خوشی ملے گی۔ تم بہت پاک سرزمین پر رہتے ہو جہاں جانے کی تمنا لیے لوگ دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ بیٹے! اللہ کے بندوں کی خوب مدد کرو‘ تمہیں تنہائی یا خالی پن کا بالکل احساس نہیں ہو گا۔

□ کنول۔ کراچی۔

☆ بیٹی کنول! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ کوشش کرو کہ ہر وقت باوضو رہو۔ بکثرت سورۃ النّاس اور سورۃ فلق پڑھا کرو۔ بعد نمازِ عشاء ایک بار سورۃ ملک ضرور پڑھو ترجمہ کے ساتھ۔ مدت ایک ماہ ہے۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

□ طلعت فاطمہ۔ لاہور۔

○ بابا جی! پہلی بار آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ اس سے پہلے صرف آپ کا کالم بہت شوق سے پڑھتی تھی۔ بابا جی! میرے شوہر غصے کے بہت تیز ہیں اور غصے میں وہ بہت گندی زبان استعمال کرتے ہیں‘ بعد



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں شرمندہ ہو کر معافی بھی مانگتے ہیں مگر بابا جی! اب ان کے کہے ہوئے الفاظ مجھے مہینوں اذیت دیتے ہیں کیونکہ میں یہ مانتی ہوں کہ انسان غصے میں وہی کچھ بولتا ہے جو اس کے دل میں ہوتا ہے۔ میں اپنی کیفیت بیان نہیں کرسکتی مگر میں بہت مشکل میں ہوں' مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں؟

☆ بیٹی طلعت......! تمہاری کیفیت میں سمجھ سکتا ہوں مگر میں تمہاری سہولت کے اعتبار سے تمہیں صرف یہ کہوں گا کہ درگزر کر دیا کرو۔ یہ سوچا کرو کہ تمہارے شوہر کی تربیت میں بے انتہا کمی رہ گئی اور یہ تربیت صرف ماں کرتی ہے۔ زبان قابو میں رکھنا مومن کی نشانی ہے اور بیٹی......! صبر کرنے والوں کا درجہ بہت بلند ہے۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ دنیاوی فائدے مت دیکھو جو یہاں اپنے اوپر جبر کرے گا صرف اللہ کی رضا کی خاطر' اس کے آخرت میں درجے بلند ہوں گے اور یقین رکھو' دنیا کی زندگی صرف دو دن کی ہے لہٰذا صبر کرو۔ بکثرت توبہ استغفار کیا کرو اور بات صرف ضرورت کے تحت کرو۔ اپنے گھر اور شوہر کو پوری توجہ دو' یہ تمہارا فرض ہے۔ پابندی سے نماز ادا کرو اور مطمئن رہو' سب اچھا ہوگا۔

□ ثمرہ' کوئٹہ۔

○ بابا جان! میں بہت محنت کرنے کے باوجود ہمیشہ صرف اتنے نمبر لے پاتی ہوں کہ پاس ہو سکوں۔ گھر میں سبھی مذاق اڑاتے ہیں۔ امتحان سے پہلے مجھے لگتا ہے کہ مجھے سب آتا ہے مگر پیپر دیکھ کر سب بھول جاتی ہوں۔ بتایئے' میں کیا کروں؟

☆ بیٹی ثمرہ......! اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ کوشش کیا کرو کہ جو کچھ یاد کرو' اس کو لکھ لیا کرو۔ سارا سارا دن مت پڑھا کرو بلکہ روزانہ ایک وقت مقرر کر لو کہ دو گھنٹے یا تین گھنٹے پابندی سے پڑھو گی۔ انسان کا دماغ ایک حد تک چیزیں یاد کرسکتا ہے۔ بہت بوجھ ڈالنا مناسب نہیں۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بکثرت نصر من اللّٰہ فتح قریب پڑھو۔ انشاءاللہ' ضرور کامیابی ہوگی۔ نہار منہ 5-4 بادام چبا کر ضرور کھایا کرو۔

□ شاہد علی۔ چکوال۔

○ بابا جی! دو خط ڈال چکا ہوں مگر آپ کی طرف سے جواب نہیں آیا۔ میں بہت پریشان ہوں۔ میری والدہ اور میری بیوی میں ایک منٹ نہیں بنتی حالانکہ میری بیوی' بہو بعد میں' پہلے سگی بھانجی ہے پھر بھی ہر طرف لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔ میری شادی کو 3 سال ہو گئے ہیں اور ایک دن بھی سکون کا نہیں گزرا۔ میں کسی کی طرف سے بھی نہیں بول سکتا' خاموش رہ رہ کر اب میرا دماغ پھٹنے لگا ہے۔ ہوسکتا ہے' کسی دن دونوں کو چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں۔ خدارا...... اس مسئلے کا حل بتایئے۔

☆ بیٹے شاہد! تمہارا خط مبہم ہے۔ تم نے وجہ نہیں لکھی کہ تمہاری والدہ اور بیگم کیوں لڑتی ہیں؟ سبب کیا ہے؟ دوسری اہم بات یہ کہ اگر ماں کو چھوڑ کر چلے جاؤ گے' تب بھی رشتے میں کوئی دراڑ نہیں آئے گی مگر بیوی کو تنہا کرو گے تو رشتہ پائیدار نہ رہے گا۔ بہتر یہ ہے کہ شہر سے دور نوکری کر لو' اس طرح اپنا فرض بھی پورا کرو گے اور گھر کی خواتین کو تمہاری غیر موجودگی میں اپنے غلط رویئے کا احساس ہوگا۔ فرار کمزور لوگوں کی نشانی ہے۔ طاقتور انسان ذمہ داریوں سے کبھی نہیں بھاگتا بلکہ ڈٹ کر ہر مشکل کا سامنا کرتا ہے پھر گھر کی خواتین کم عقل ہوتی ہیں' انہیں نرمی اور محبت سے سمجھانا چاہیے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو' نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ چلتے پھرتے یَا رحمٰن کا بہت وِرد کیا کرو۔

□ رابعہ حسن۔ پنڈی۔

○ بابا جان! میں ایک پڑھی لکھی لڑکی ہوں۔ تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ ایک اچھے اسکول میں انگلش اور کیمسٹری کی ٹیچر ہوں۔ میرا مسئلہ بھی وہی ہے جو بہت سے گھروں کا ہے یعنی شادی کا۔ لوگ دیکھنے آتے ہیں' پسند بھی کرتے ہیں مگر جب میرے بڑے معلومات کراتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ جو کچھ بتایا گیا' وہ جھوٹ تھا۔ کوئی اپنی تنخواہ غلط بتاتا ہے' کوئی کرائے کے گھر کو اپنا گھر کہتا ہے اور اس بار تو حد ہی ہو گئی' ایک صاحب نے اپنے مذہب کے حوالے سے بھی جھوٹ بول دیا۔ بابا جان! ماضی میں کون کیا تھا' یہ تو لڑکی والوں کا حق ہے کہ پتہ کریں۔ سامنے تو سب اچھا ہی نظر آ رہا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مجھ پر بندش ہے۔ میں اب بہت پریشان رہنے لگی ہوں۔ آخر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟

☆ بیٹی رابعہ! تمہارا مسئلہ پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ صورتِ حال دراصل وہ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔ بیٹی! سمجھو' تمہارا مکان ہے جو تم بیچنا چاہتی ہو اور اس سلسلے میں تم نے ایجنٹ سے بات بھی کر لی ہے' وہ اپنی سی کوشش کر بھی رہا ہے مگر اس دوران تم کسی اور ایجنٹ سے بھی بات کر لو' گھر پر برائے فروخت کا اشتہار بھی چسپاں کر دو اور مختلف اخباروں میں اپنی طرف سے فروخت کا اشتہار بھی دے دو۔ ایسی صورتِ حال میں ہر چلتا پھرتا شخص تمہارے گھر کا خریدار بن کر آئے گا' کچھ لوگ تو صرف یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اگر وہ اپنا گھر بیچنا چاہیں تو کیا قیمت ہونی چاہیے' جائزہ لیں گے۔ اس تمام عمل سے اس گھر کی فروخت مشکل ہو جائے گی بلکہ قیمت بھی بہت گر جائے گی۔ اتنی لمبی تمہید صرف اس لیے باندھی کہ بیٹیاں سانجھی ہوتی ہیں' اُن کے گھر صرف انہی لوگوں کو رشتہ لانے کی اجازت ہونی چاہیے جو معاشرتی اور دینی اعتبار سے ہم پلہ ہوں۔ یہی بہتر ہے۔ اپنی والدہ سے کہو' اس بات پر خاص توجہ دیں۔ بچیوں کو ہر آنے والے کے سامنے پیش کرنا بہت غلط ہے۔ تم نماز کی پابندی رکھو اور نمازِ عشاء کے بعد ایک بار سورۃ احزاب ترجمہ کے ساتھ ضرور پڑھو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ زید بابر۔ ناروے۔

○ بابا جی! کوشش کروں گا کہ کم الفاظ میں اپنی بات بتا سکوں۔ میری لکھائی بھی اچھی نہیں اور اردو بھی کمزور ہے۔ آپ کا کوئی ای میل بھی نہیں ورنہ رابطہ آسان ہو جاتا۔ میرا اصل مسئلہ جاب کا ہے۔ میں جس ہوٹل میں کام کرتا ہوں' وہاں کے سینئر منیجر مجھے بہت تنگ کرتے ہیں۔ وہ انڈین ہیں' ہر وقت موقع نکال کر مذہب پر بحث کرتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ باقی اسٹاف بھی انہی کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ سب گورے یعنی نارویجین ہیں۔ میں کافی اپ سیٹ رہنے لگا ہوں۔ امی کہتی ہیں کہ جاب چھوڑ دو مگر یہ جاب بہت اچھی ہے اور سیلری بہت بہترین ہے' بس ماحول سے پریشان ہوں۔

☆ بیٹے زید! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ تمہاری اردو کمزور ہے اور میری نظر لہٰذا ای میل کا تو سوال ہی نہیں۔ اب تو خط بھی مشکل سے پڑھے جاتے ہیں۔ بہرحال جب تک اپنے بچوں کے کام آسکا' خوشی ہوگی۔ فیصلہ مشکل ہے مگر یقین رکھو' بہت مطمئن رہو گے اور کامیابی ملے گی۔ والدہ کی بات مان لو' اُن سے دُعائیں لو اور کہیں اور جاب کی کوشش کرو۔ تمہیں جلد کامیابی ملے گی۔ ایک نصیحت اور مان لو' نماز ضرور ادا کیا کرو' خوش رہو گے۔

□ شمائلہ۔ لاہور۔

○ بابا جی! میں بہت بدنصیب ہوں' بچپن میں والدین ایک کے بعد ایک کر کے چلے گئے۔ چچا نے پالا پھر اپنی جان چھڑانے کے لیے انتہائی گھٹیا انسان



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے میری شادی کردی۔اب میرے چار بچے ہیں۔ ہم انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ میرا شوہر نشہ کر کے اِدھر اُدھر پڑا رہتا ہے۔ میں صبح سے شام تک ایک فیکٹری میں کام کرتی ہوں اور آدھی رات تک بیٹھ کر کپڑے سیتی ہوں۔اس کے باوجود بچوں کو پڑھا نہیں سکی۔اب تو خیر' ایسا سوچنا بھی چھوڑ دیا ہے' بس چاہتی ہوں کہ ایسی دُعا بتا دیں جس کے پڑھنے سے روزی میں برکت ہو کیونکہ بابا جی! اب اس سے زیادہ تو محنت میں کر ہی نہیں سکتی۔وظیفہ بھی کرنا مشکل ہے۔کوئی آسان سا ورد ضرور بتا دیں۔

☆ بیٹی شائلہ! اللہ تمہیں اولاد کا سکھ نصیب کرے۔یقیناً ایک ماں کے لیے اس کی اولاد ہی سب کچھ ہوتی ہے۔تمہیں اللہ تمہاری اس شب و روز محنت کا بہت اجر دے گا۔یقین رکھو۔ بچوں کو تعلیم ملے' یہ بہت ضروری ہے۔ دُعا کرو کہ اللہ کوئی سبب بنا دے۔ بکثرت یَاعزیزُ کا وِرد کیا کرو۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

□ جاوید۔حیدرآباد۔

o بابا جی! میں نے کچھ عرصہ قبل آپ کو اپنی بیوی کی تشویش ناک صحت کے بارے میں تحریر کیا تھا۔آپ نے مجھے تعویذ ارسال کیا۔بابا جی! میں اس وقت خط لکھتے وقت رو رہا ہوں۔میری بیوی نے کل ایک عرصہ کے بعد سارا دن بنا سوئے گزارا۔ وہ بالکل نارمل لگ رہی تھی پھر رات میں اس کو تھکن ہوگئی لیکن پھر بھی بنا دوا کے سوگئی۔ بابا جی! یہ کسی معجزے سے کم نہیں۔ مجھے بہت دنوں بعد گھر میں زندگی کے آثار محسوس ہوئے۔اس کے ہی کہنے پر آپ کو فوری طور پر صورتِ حال سے آگاہ کر رہا ہوں۔آگے کیا حکم ہے' بتایئے؟

☆ بیٹے جاوید! اللہ تمہاری بیوی کو مکمل صحت عطا فرمائے۔اللہ کا خوب شکر ادا کرو۔جیسا میں نے پہلے کہا تھا' صدقہ خیرات سے ہاتھ مت روکنا۔ جو مال اللہ کی راہ میں نہیں دیا جاتا' وہ ضائع ہی ہو جاتا ہے۔ یَاشافعی کا بہت ورد کرو۔لگاتار ایک ماہ کسی حاجت ضرورت مند کو ایک وقت کا کھانا ضرور کھلاؤ۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

□ طاہرہ۔خانیوال۔

☆ بیٹی طاہرہ! سرخ روشنائی سے خط مت لکھا کرو۔ مجھے پڑھنے میں شدید دقت ہوتی ہے۔ صاف اور واضح خط لکھو۔ میں جواب دے دوں گا۔

□ فائزہ افتخار' کرک۔

o بابا سائیں! میں بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہوگئی ہوں۔ میرے اور میرے شوہر کے درمیان ناچاقی تو عرصہ 3 سال سے چل رہی تھی' میں یہ نہیں کہوں گی کہ میری غلطی نہیں مگر بابا سائیں! وہ بہت بدزبان انسان ہے۔صرف روٹی کھلا دینا اور کپڑا دلا دینا تو زندگی نہیں۔گھر اس کا' بچے اس کے' رشتے ناطے اس کے' مجھے تو وہ اپنے رشتے داروں سے بھی نہیں ملنے دیتا مگر میں پھر بھی برداشت کر رہی تھی مگر اب جب سے وہ بہت مال دار ہوگیا ہے' میری زندگی بہت مشکل ہوگئی ہے۔ ہر لمحہ میری بے عزتی کرتا ' کبھی شکل کو برا کہتا' کبھی بڈھی کہتا' بہت گندے گندے الزام لگاتا' ہر تھوڑے دن بعد ذلیل کرتا پھر معافی مانگ لیتا مگر بابا سائیں! میں اب اپنی نظروں میں بہت گرنے لگی ہوں۔ آخر میری بھی عزت ہے۔روٹی تو ہم کتے کو بھی کھلاتے ہیں۔انسان میں اور جانور میں فرق ہوتا ہے پھر میں اس کے بچوں کی ماں بھی ہوں صرف اس لیے کہ لوگ کچھ نہ بولیں۔ میں روز روز ایک شخص کی گالیاں نہیں سہہ سکتی۔ میرے والدین بھی نہیں۔ بھائی آج کل بہنوں کے کہاں ہوتے ہیں مگر پھر بھی میں اس شخص کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی نہ ہی مجھے بچے چاہئیں۔ ظاہر ہے' اکیلی ہی نہیں سکتی۔ بس مجھے ایسا طریقہ بتا دیں کہ مجھ میں اتنی ہمت پیدا ہو جائے کہ میں اس انسان کا گھر چھوڑ سکوں اور مجھے کوئی ٹھکانہ مل جائے۔

☆ بیٹی فائزہ! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ میں جانتا ہوں کہ ذلت کی زندگی انسان گزار ہی نہیں سکتا مگر بیٹی! در بدر ہونے سے بہتر ہے کہ اپنے اوپر صبر کرلو۔اللہ سے مدد مانگو۔تمہارا شوہر گھر میں جو کچھ کر رہا ہے' وہ صرف تم جانتی ہو مگر گھر چھوڑنے کے بعد باہر والے جو کریں گے' وہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔سوچو' تم جو دکھ اٹھا رہی ہو' اس کے بدلے تمہارے سر پر چھت ہے۔تمہاری اولاد نظروں کے سامنے ہے۔میں یہ نہیں کہہ رہا کہ عورت کی مجبوری ہے کہ وہ دکھ سہے مگر بیٹی! عورت کو ضرورت ہے کہ وہ محفوظ رہے' اس کا تقدس بنا رہے۔تمہارا صبر تمہارے اور تمہاری اولاد کے کام آئے گا۔اللہ تمہارے شوہر کو بھی ہدایت عطا فرمائے۔اس پاک ذات سے مانگو جو لمحوں میں دلوں کو بدل دیتا ہے۔نماز پڑھو۔تہجد میں اٹھ کر خوب گڑگڑا کر دُعا کرو۔اللہ سب اچھا کرے گا۔

□ راشد۔لاڑکانہ۔

☆ بیٹے راشد! تم نے خط میں فرضی نام لکھا ہے۔اصل نام مع والدہ کے نام تحریر کرو' تبھی استخارہ ہوسکتا ہے۔

□ صارم حسن۔U.K.۔

o بابا! امید ہے' آپ اچھے ہوں گے۔ پچھلے سال میری والدہ نے آپ سے میرے سلسلے میں رجوع کیا تھا اور آپ کی دُعاؤں کی بدولت میں U.K آگیا۔ ماں نے اپنا جمع کیا ہوا سارا پیسہ اور جو تھوڑا بہت زیور تھا' بیچ دیا۔ مجھے پتہ ہے' وہ پاکستان میں اکیلی بھی ہیں اور مجبور بھی۔ میں سال بھر سے معمولی نوکریاں کر رہا ہوں مگر کچھ کما نہیں پا رہا پھر یہاں آکر اندازہ ہوا کہ اب پاکستانیوں کو بہت بری نظر سے دیکھا جاتا ہے۔لوگ کام بھی نہیں دیتے۔ اب میں بہت پریشان ہوں' کیا کروں؟ پاکستان میں ماں پریشان اور یہاں میں۔ کیا میں واپس آجاؤں؟

☆ بیٹے صارم! میں نے اُس وقت بھی تمہاری ماں کو سمجھایا تھا کہ تمہیں اپنے پاس ہی رکھے۔ بہرحال اب مشکل برداشت کرو۔ایک سال میں نہ تو حالات تبدیل ہوتے ہیں نہ فیصلے بدلے جاتے ہیں۔ مستقل مزاجی اور ہمت سے کام لو۔نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔اللہ سب خیر کرے گا۔

o بابا جان! آپ سے اپنے بیٹے کے لیے تعویذ اور خصوصی وظیفہ کی درخواست کی تھی۔ وہ بہت نافرمان ہے۔ماں کا تو رو رو کر حشر خراب ہے۔بات ہی نہیں سنتا۔ بہنوں کے ساتھ بہت بدتمیزی سے پیش آتا ہے۔صرف دوستوں کو پسند کرتا ہے اور انہی کے ساتھ رہتا ہے۔سختی کر کے بھی دیکھ لی' کوئی فائدہ نہیں ہوا۔کیا میں اس کو دادا' دادی کے پاس پاکستان بھیج دوں؟

☆ بیٹے راشد......! بچے کو اپنے پاس اور ماں کے قریب رکھو۔سختی کا کوئی فائدہ نہیں۔رویہ نرم اور محتاط رکھو۔ جب ہم اولاد کے ساتھ بے جا لاڈ و پیار کرتے ہیں تو وہ اس کے ہی عادی ہو جاتے ہیں پھر اچانک جب رویئے بدلتے ہیں تو وہ پھر سیکھنے کے بجائے فرار کو ترجیح دیتے ہیں۔ بے جا روک ٹوک بھی مناسب نہیں مگر اولاد کی پرورش میں متوازن رویہ بہت ضروری ہے۔ بہرحال والدہ سے کہو' ہر نماز کے بعد ایک تسبیح لاحول ولا قوۃ الاباللّٰہ کی پڑھیں اور دعا کریں۔صبح و شام بیٹے پر ضرور دم کرو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عائشہ عارف

# آپ کی ڈائری کے لیے

ان منتخب شہ پاروں کو آپ اپنی ڈائری میں سجا سکتے ہیں

## انتخاب

### عزتِ نفس

"صبح جب خاکروب سڑکیں جھاڑتے ہیں، تو گرد کا ایک اونچا ستون کھڑا ہو جاتا ہے۔ دھول کی لمبی سی فصیل۔ اس کو عبور کرتے ہوئے اگر تم اپنی جیب سے رومال نکال کر ناک پر رکھو گے تو خاکروب سے اس کی عزتِ نفس چھین لو گے۔ اسے احترام سے محروم کر دو گے۔ ایسا نہیں کرنا، بالکل نہیں۔ ہمت ہے تو سانس روک کر گرد کے اس قلعے میں سے گزر جاؤ۔ فاصلہ طویل ہے تو کھل کے سانس لیتے چلو۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ قدرت نے انسان کے احترام میں نتھنوں میں پہلے سے فلٹر لگا دیئے ہیں۔ کبھی خاکروب سے یہ نہ کہنا کہ بھئی، ذرا جھاڑو روک دو، ہم گزرنے والے ہیں۔ نہ بالکل نہیں کہنا۔"

اشفاق احمد کی تحریر "توتا کہانی" سے اقتباس

انتخاب: قرۃ العین زینب۔ ملتان

### شادی.....!

صاحبو! عام لوگ میاں بیوی کے تعلق کو محبت کا رشتہ سمجھتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی خوش فہمی ہے۔ دراصل شادی ایک درسگاہ ہے جہاں افراد ایک دوسرے کے ساتھی بن کر جینا سیکھتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی کمزوریوں، پسندیدگیوں، ایک دوسرے کے وہموں یعنی نامعقول رویے کو برداشت کرنا سیکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کی طبیعتوں میں ڈھل جانے اور اختلاف رائے کو برداشت کرنا سیکھتے ہیں۔ رواداری اور ایک دوسرے کو خوش رکھنا سیکھتے ہیں اور پھر جب بچے ہو جاتے ہیں تو ان کے لیے ایثار و قربانی کرنا اور اپنی شخصیت کے نوکیلے، چبھتے کونوں کو گول کرنا سیکھتے ہیں۔

ممتاز مفتی کی تصنیف "تلاش" سے اقتباس

انتخاب: نایاب محبوب۔ کراچی

### اردو شاعری کا عاشق

اردو شعر و شاعری میں عاشق کے کارٹون بکثرت ملتے ہیں مثلاً لاغر ہوتے ہوتے شکنِ بستر یا سوکھ کر چلمن کی تیلی بن جانا جس کی وجہ سے پردے کے مقاصد نہ پورے ہوتے ہوں۔ ناتوانی کا یہ عالم کہ دمِ عیسیٰ بھی پیامِ مرگ ثابت ہوتا ہے، پھر یہ کہ عاشق کے سارے اعضاء "اسکریو" پر ہوتے ہیں جس کے جی میں آتا ہے، اڑا لے جاتا ہے اور یہ زندہ رہتے ہیں۔ شراب پینے میں ان کا ثانی نہیں۔ مرکے



ہی اٹھنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل۔ خط بڑھا ہوا، ہر قسم کے متعدی مرض میں مبتلا، دامن کے چاک میں اور گریبان میں کوئی فاصلہ باقی نہیں۔ منہ سے بھبھکے نکلتے ہوں۔ تن بدن لہولہان، بغل میں لپٹا ہوا بستر، خاک بسر، آنکھوں میں کیچڑ، پیچھے پیچھے رقیب، ناصح مستحب اور ربِ دان و نکل کی ذریات کا ہجوم، آخر اس قسم کی متحرک میونسپلٹی کو کوئی شریف آدمی اپنے قریب کیوں آنے دے۔

رشید احمد صدیقی کی تصنیف "خنداں" سے اقتباس

انتخاب: نور گھلو۔ حیدر آباد

### بسترِ راحت

مشتاق احمد یوسفی نے اپنے مضمون "پڑیے گر بیمار" میں تیمار داری کا حال کچھ ایسے دلسوز پیرائے میں بیان کیا ہے کہ ہماری ہر بیماری تیمار داروں کے خوف سے دور ہو جاتی ہے اور ہم بسترِ علالت سے ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ گزشتہ دنوں ہی دل میں کھٹ مٹھا درد اٹھا۔ طبیعت روایتی عاشق اور بیمار تو تے سے بھی زیادہ مضمحل رہنے لگی تو ہمارے معالج ڈاکٹر ریاض اور شائستہ نے متفقہ طور پر بسترِ علالت پر دراز ہونے کا مشورہ دیا لیکن جیسے ہی تیمار داروں کے اندازِ بیان، مزاج پرسی کے رنگ ڈھنگ اور طبی ہدایتوں کا خیال آیا، یقین جانیے "انجیسڈ" کھائے بغیر درد غائب ہو گیا اور طبیعت دفتری کام کی طرف مائل ہو گئی۔

ارشاد احمد خان کی کتاب "تعمیلِ ارشاد" سے اقتباس

انتخاب: عمران ہارون چھوٹانی۔ کراچی

### اگر.....!

اگر تم محبت کے ساتھ نہیں بلکہ ناپسندیدگی کے ساتھ ہی کام کر سکتے ہو تو اس سے بہتر یہ ہے کہ اپنا کام چھوڑ دو اور مندر کے دروازے پر بیٹھ کر ان لوگوں سے خیرات لو جو مسرت کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ اس لیے اگر تم بے تو جہی سے روٹی پکاؤ گے تو تمہاری روٹی بدمزہ ہو گی اور اس سے صرف آدھی بھوک مٹے گی اور چاہے تم فرشتوں کی طرح گاؤ لیکن اپنے گانے سے پیار نہ کرو تو تم انسانوں کے کانوں میں روئی بھر دو گے اور وہ دن کی آوازیں اور رات کی آوازیں نہ سن سکیں گے۔

خلیل جبران کی کتاب "کوشِ برآواز" سے اقتباس

انتخاب: رضوانہ کوثر۔ لاہور

### عذاب

عذاب اور عبرت کے الفاظ سننے میں بھی سخت ہیں اور سمجھنے میں بھی۔ عذاب کسے کہتے ہیں؟ عذاب اس وقت کا نام ہے جب انسان اپنے اعمال کا نتیجہ اپنے سامنے دیکھے۔ انسان کی بداعمالیاں جب ایک خوفناک نتیجہ بن کر اس کی راہ میں آ موجود ہوں، عذاب کا لمحہ ہے۔ عذاب کے لمحات، محاسبے کے لمحات ہیں، عبرت کی گھڑیاں ہیں، قیامت کا منظر ہے..... عذاب کا وقت وہ وقت ہے جب انسان سے دعائیں چھن جائیں۔ جب انسان گتھیوں کو اپنی عقل سے سلجھانا چاہے اور عقل سے وہ گتھیاں مزید الجھ جائیں تو سمجھ لیجیے کہ عذاب قریب ہے۔ عقل اور صرف عقل، طاقت اور صرف طاقت مسائل کا حل نہیں دے سکتے۔ جب تک اس کا فضل حاصل نہ ہو، ہمارے تمام کام اور ہمارا تمام حاصل، ہمارے لیے عذاب لکھ رہے ہیں۔ ہم خود اپنے لیے اپنے ہاتھوں سے عذاب لکھ رہے ہیں۔

واصف علی واصف کی کتاب "قطرہ قطرہ قلزم" سے اقتباس

انتخاب: شرجیل اقدس۔ حیدر آباد

## انمول خزانہ

### اچھی اور سچی باتیں

☆ خوابوں کی دنیا کتنی ہی حسین ہو، سچائی پر مبنی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں ہوتی۔

☆ نئے نئے راستے اختیار کرنے سے منزل دور ہو جاتی ہے۔

☆ چوٹ کھا کر آنسو تو سب کے نکل آتے ہیں لیکن چوٹ کھا کر مسکرانا آسان نہیں۔ یہی مسکراہٹ انسان کے کردار اور عظمت کی دلیل ہے۔

☆ نیکی بے شک اچھی چیز ہے لیکن نیک خیالات اس سے بھی کہیں اچھے ہیں۔

☆ سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے انسان کی سب سے زیادہ خدمت کی۔

☆ جو لوگ ہمیشہ کام میں مشغول رہتے ہیں، ان کو بہت کم کبیدہ خاطر دیکھا ہے۔

☆ جس میں ادب نہیں، اس میں برائیاں ہی برائیاں ہیں۔

☆ پیٹ بھر کر سونے سے زندگی کا مقصد پورا نہیں ہوتا کیونکہ زندگی ہمدردی اور ایثار کے جذبے کو مدِنظر رکھ کر بنائی گئی ہے۔

☆ بے وقوف دوست سے عقل مند دشمن اچھا ہے۔

مرسلہ: نوید شہریار۔ کراچی

## روشن ستارے

اگر تم اپنے والدین کی باتوں پر توجہ دو گے تو لوہے کی اور پتھر کی سلیں بھی تمہارے ہاتھوں میں موم بن جائیں گی۔

سونے کو آگ پرکھتی ہے اور انسان کو مصائبِ زمانہ۔

محبت کی کشتی میں پہلا سوراخ شک کا ہوتا ہے۔

ندی کے پانی اور آنکھ کے پانی میں فرق صرف جذبات کا ہوتا ہے۔

لوگ اونچے پہاڑوں سے ہی نہیں اکثر کنکریوں سے بھی پھسل جاتے ہیں۔

مرسلہ: عائشہ اشعر۔ کراچی

## یاد رکھنے والی باتیں

+ خوف سے بچنے کا واحد، مناسب اور سہل طریقہ یہی ہے کہ انسان میں اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا ہو جائے۔

+ اللہ تعالیٰ کے دوستوں اور خاص بندوں کی یہ پہچان بتائی گئی ہے کہ ان کے ہاں خوف اور حزن نہیں ہوتا۔

+ نتیجے سے بے نیازی ہی خوف سے بے نیازی ہے۔

+ خوف بہ ذاتِ خود ایک حادثہ ہے جو آتا ہے اطلاع کیے بغیر اور انسان کے دل میں بیٹھ جاتا ہے۔

+ جب زمین والوں کی بداعمالیاں حد سے بڑھ جائیں تو آسمان سے عذاب کا دیباچہ خوف کی صورت میں نازل ہوتا ہے۔

+ جب انسان اللہ تعالیٰ سے دور ہو جائے تو سکون انسان سے اتنا دور کر دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ اندیشہ اور خوف مسلط کر دیا جاتا ہے۔

+ خوف اعصاب شکن بیماری ہے۔ اس سے انسان کی تمام فکری صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں اور اس کی شخصیت ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔

+ خوف کا پسندیدہ مسکن اس انسان کا دل ہے جس میں احساسِ گناہ تو ہو لیکن گناہ چھوڑنے کی طاقت نہ ہو۔

+ کسی کو خوف زدہ نہ کیا جائے تو خوف کا عذاب ٹل جاتا ہے۔

+ دعا سے خوف دور ہوتا ہے اور دعا کا حاصل اور اس کا ماحصل ہی یہ ہیں کہ یہ ہمیں ہمارے خوف سے نجات دلاتی ہے۔

مرسلہ: رباب نقوی۔ جھنگ



## انمول

* موت سے بڑھ کر کوئی سچی اور زندگی سے بڑھ کر کوئی جھوٹی چیز نہیں۔

* خندہ روئی سے پیش آنا سب سے پہلی نیکی ہے۔

* انسان اندر سے کرچی کرچی ہو جاتا ہے جب اعتماد کے رشتے ٹوٹنے لگتے ہیں۔

* اپنے آپ سے زبردستی نہ کیجیے ورنہ ٹوٹ جائیں گے۔

* جن کا کوئی مر جاتا ہے، ان کے پاس تو سوگ منانے کا واضح جواز ہوتا ہے مگر وہ لوگ اپنی اداس صورتوں کی کیا وضاحت پیش کریں، جن کے زندہ چہرے بھی مُردوں جیسے ہوتے ہیں۔

فاروق خان۔ کوئٹہ

## توجہ طلب باتیں

◉ بعض اوقات ایک ٹھوکر ہماری زندگی سنوار دیتی ہے اور بعض اوقات وہی ٹھوکر زندگی بھر کی ناکامیوں کا باعث بنتی ہے۔

◉ اگر کوئی ہماری خامی بیان کرے تو ہم ماحول کو قصوروار ٹھہراتے ہیں حالانکہ ماحول بھی ہم بناتے ہیں تو کیوں نہ اچھا ماحول بنائیں۔

◉ پھول اپنی خوشبو سے پہچانا جاتا ہے اور انسان اپنے کردار سے۔

◉ اگر ہم سب اپنے فرائض دیانت داری سے ادا کرنے لگ جائیں تو معاشرے کی موجودہ حالت بدل سکتی ہے۔

◉ زندگی میں ایسے بنو کہ لوگ تمہیں مرنے کے بعد بھی اچھے لفظوں میں یاد کریں۔

مرسلہ: اقبال۔ کراچی

# ذرا مسکرائیے

## جھگڑا

میاں بیوی کا جھگڑا اتنا بڑھا کہ شوہر نے زچ ہو کر گھر چھوڑ دیا اور دل بہلانے کہیں چلا گیا۔ شام کو جب بھوک نے ستایا تو گھر واپس آیا اور بیوی کی طرف دوستی اور مفاہمت کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔ ''کھانے کے لیے کیا تیار ہے؟''

بیوی نے ترش روی سے جواب دیا۔ ''زہر۔''

شوہر نے اسی نرمی سے کہا: ''میری تو ایک دوست کے ہاں دعوت ہے، جو بچے اپنی والدہ کو بھیج دینا۔''

مرسلہ: محمد نعیم۔ سرگودھا

## سزا

قاضی کا رنگ کوے جیسا تھا۔ اس نے کسی شخص کے خلاف سزا کا حکم دیتے ہوئے کہا: ''اس کا منہ کالا کر کے گدھے پر گشت کرائی جائے۔''

ملزم ذرا مسخرا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ ''حضور میرا آدھا منہ کالا کرائیں۔''

قاضی نے دریافت کیا۔ ''یہ کیوں؟''

ملزم نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ کہیں لوگ اس غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو جائیں کہ لوگ آپ جناب کو گدھے پر بٹھا کر گشت کرا رہے ہیں۔''

مرسلہ: ثمرین ارشد۔ کورنگی، کراچی

## تصدیق

فون کی گھنٹی بجی، ٹیلی فون آپریٹر نے ریسیور اٹھا کر کہا: ''ہیلو، پبلک لائبریری!'' لیکن دوسرے جانب سے کوئی جواب نہیں ملا۔ ذرا دیر بعد پھر گھنٹی بجی اور آپریٹر نے پھر شائستگی سے کہا: ''پبلک لائبریری!'' جواب ندارد تھا۔ آپریٹر تنگ آ گیا۔ گھنٹی پھر بجی۔ ٹیلی فون آپریٹر نے پھر کہا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''پبلک لائبریری!''

دوسری طرف سے کسی عورت نے پوچھا۔ ''کیا واقعی یہ پبلک لائبریری ہے؟''

آپریٹر نے جواب دیا۔ ''جی ہاں محترمہ! آپ کس سے بات کرنا چاہتی ہیں؟''

دوسری طرف سے جواب ملا۔ ''شکریہ جناب! ٹیلی فون کا یہ نمبر مجھے اپنے شوہر کی جیب سے ملا تھا۔''

مرسلہ: جہانگیر نیازی۔ کوئٹہ

## خدمات

قومی اسمبلی کی رکنیت کا ایک امیدوار عام مجمع میں تقریر کر رہا تھا۔ ''خواتین و حضرات! میں آپ کے لیے نیا نہیں ہوں۔ آپ کا پرانا خادم، میں آپ کی خاطر میلوں پیدل چلا ہوں۔ آپ کی خاطر بارشوں میں بھیگا ہوں، آپ کی خاطر میں نے لُو کے تھپیڑے برداشت کیے ہیں، آپ کی خاطر میرے پاؤں زخمی ہوئے، آپ کی خاطر میرے تلوؤں میں چھالے پڑ گئے اور.....''

مجمع میں سے ایک خاتون نے اٹھ کے ہاتھ بلند کیا۔ امیدوار نے اپنی تقریر روک کے اس سے کہا۔ ''فرمائیے؟''

خاتون نے سادگی سے سوال کیا۔ ''محترم! کیا یہ ساری سختیاں آپ نے ہماری خاطر جھیلی ہیں؟ صرف ہماری خاطر؟''

''جی ہاں!'' امیدوار نے سینے پر ہاتھ رکھ کے سر جھکایا۔ ''بے شک۔''

خاتون نے ہمدردانہ لہجے میں کہا: ''اگر یہ بات ہے تو جناب! میرا خیال ہے اب آپ کو آرام کرنا چاہیے۔ ہم اتنے احسان فراموش نہیں ہیں کہ ایسے بے لوث انسان کو دوبارہ تکلیف دیں۔''

مرسلہ: نجمہ قیصر۔ لاہور

## بزم آرائی

☆

یہ حدیں نہ توڑ دینا، مرے دائرے میں رہنا
مجھے اپنے دل میں رکھنا، مرے حافظے میں رہنا
مرا بوجھ خود اٹھانا، مرا کرب آپ سہنا
مرے زخم بانٹ لینا، مرے رتجگے میں رہنا
مرے منظروں میں بسنا، میری گفتگو میں ہونا
مرے لمس میں سمانا، مرے ذائقے میں رہنا
مرا حکم خود سنانا، مری مہر خود لگانا
مرے مشوروں میں ہونا، مرے فیصلے میں رہنا
کبھی دھوپ کے نگر میں مرا ساتھ چھوڑ جانا
کبھی میرا عکس بن کر مرے آئینے میں رہنا
کبھی منزلوں کی صورت مری دسترس سے باہر
کبھی سنگِ میل بن کر مرے راستے میں رہنا
مرے ہاتھ کی لکیریں تیرا نام بن کے چمکیں
مری خواہشوں کی خوشبو مرے زائچے میں رہنا
(معین نظامی)

حسن انتخاب: ارشد علی ارشد۔ ابوظہبی

☆

چہرہ میرا تھا، نگاہیں اُس کی
خامشی میں بھی وہ باتیں اُس کی
میرے چہرے پہ غزل لکھتی گئیں
شعر کہتی ہوئی آنکھیں اُس کی
شوخ لمحوں کا پتہ دینے لگیں
تیز ہوتی ہوئی سانسیں اُس کی
ایسے موسم بھی گزارے ہم نے
تُم نہیں جب اپنی تھیں، شامیں اُس کی
دھیان میں اُس کے یہ عالم تھا کبھی
آنکھ مہتاب کی، یادیں اُس کی
فیصلہ موجِ ہوا نے لکھا
آندھیاں میری، بہاریں اُس کی
نیند اِس سوچ سے ٹوٹی اکثر
کس طرح کٹتی ہیں راتیں اُس کی
دور رہ کر بھی سدا رہتی ہیں
مجھ کو تھامے ہوئے بانہیں اُس کی
(پروین شاکر)

حسن انتخاب: غلام حیدر دلشاد، اسکردو بلتستان

☆

ہیں موسم رنگ کے کتنے گنوائے، میں نہیں گنتا
ہوئے کتنے دن اُس کوچے سے آئے، میں نہیں گنتا
بھلا خود میں کب اپنا ہوں، سو پھر اپنا پرایا کیا
ہیں کتنے اپنے اور کتنے پرائے، میں نہیں گنتا
لبوں کے بیچ تھا ہر سانس اِک گنتی بچھڑنے کی
مرے وہ لاکھ بوسے لے کے جائے، میں نہیں گنتا
وہ میری ذات کی بستی جو تھی، میں اَب وہاں کب ہوں
وہاں آباد تھے کس کس کے سائے، میں نہیں گنتا
بھلا یہ غم میں بھولوں گا کہ غم بھی بھول جاتے ہیں
مرے محبوں نے کتنے غم بھلائے، میں نہیں گنتا
تو جن یادوں کی خوشبو لے گئی تھی اے صبا، مجھ سے
انہیں تو موج اندر موج لائے، میں نہیں گنتا
وہ سارے رشتہ ہائے جاں کہ تازہ تھے جو اس پل تک
تھے سب باشندۂ کہنہ سرائے، میں نہیں گنتا
(جون ایلیا)

حسن انتخاب: شزا گیلانی۔ کراچی

☆

اداس شامیں، اجاڑ رستے، کبھی بلائیں تو لوٹ آنا
کسی کی آنکھوں میں رتجگوں کے عذاب آئیں تو لوٹ آنا
ابھی نئی وادیوں، نئے منظروں میں رہ لو مگر مری جان
یہ سارے اِک اِک کر کے جب تم کو چھوڑ جائیں تو لوٹ آنا
جو شام ڈھلتے ہی اپنی اپنی پناہ گاہوں کو لوٹتے ہیں
اگر وہ پنچھی کبھی کوئی داستان سنائیں تو لوٹ آنا
نئے زمانوں کا کرب اوڑھے ضعیف لمحے، نڈھال یادیں
تمہارے خوابوں کے بند کمروں میں لوٹ آئیں تو لوٹ آنا
میں روز یونہی ہوا پہ لکھ لکھ کے اس کی جانب یہ بھیجتا ہوں
کہ اچھے موسم اگر پہاڑوں پہ مسکرائیں تو لوٹ آنا
اگر اندھیروں میں چھوڑ کر تم کو بھول جائیں تمہارے ساتھی
اور اپنی خاطر ہی اپنے دیے جلائیں تو لوٹ آنا
مری وہ باتیں تو جن پہ ہنستا تھا کھلکھلا کر
بچھڑنے والے، مری وہ باتیں کبھی رلائیں تو لوٹ آنا
(فرحت عباس شاہ)

حسن انتخاب: نوین خاور۔ اسلام آباد

☆

گھاؤ گنتے نہ کبھی زخم شماری کرتے
عشق میں ہم اگر وقت گزاری کرتے
تجھ میں تو خیر، محبت کے تھے پہلو ہی بہت
دشمنِ جاں بھی اگر ہوتا تو یاری کرتے
ہو گئے دھول تیرے راستے میں بیٹھے بیٹھے
بن گئے عکس تیری آئینہ داری کرتے
وقت آیا ہے جدائی کا تو پھر سوچتے ہیں
تجھے اعصاب پر اتنا بھی نہ طاری کرتے
ہوتے سورج تو ہمیں شاہ فلک سونا تھا
چاند ہوتے تو ستاروں پر سواری کرتے
آخری داؤ لگانا نہیں آیا مجھ کو
زندگی بیت گئی خود کو جواری کرتے
کرنا پڑا تھا قتل اَنا کو ناسک
ورنہ دشمن کو بھی ہم اپنا حواری کرتے
(اطہر ناسک)

حسن انتخاب: قرۃ العین زینب۔ ملتان

## آخر کیوں.....!

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں
اَب جب کہ میں نے تمہاری یادوں کے جگنو
اپنی چاہت کی مٹھیوں کی قید سے آزاد کر دیے ہیں
تمہارے نام کی بہت سی بارشیں
اَب اَن دیکھی چھتوں پر برسنے لگی ہیں



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہارے سنگ دیکھے ہوئے تمام خواب
ذہن سے مٹا دیے ہیں
تم سے کیے ہوئے تمام وعدے بھلا دیے ہیں
لیکن شام ہوتے ہی میری تمام سوچیں
تمہاری محبتوں کی طرح
جھوٹی ثابت ہوتی ہیں
اور تم ہزار ضبط کے باوجود
میری آنکھوں میں آنسو بن کر
اُتر آتے ہو
آخر کیوں؟

(عذرا بخاری)

حسن انتخاب: افشاں سحر طارق۔ کراچی

## ایک خواہش

مجھے معجزوں پر یقین نہیں
مگر آرزو ہے کہ جب قضا
مجھے بزم دہر سے لے چلے
تو پھر ایک بار یہ اُذن دے
کہ لحد سے لوٹ کے آسکوں
تیرے در پہ آ کے صدا کروں
تجھے غم گسار کی ہو طلب
تو تیرے حضور میں آ رہوں
یہ نہ ہو تو سوئے رہ عدم
میں پھر ایک بار روانہ ہوں

(فیض احمد فیض)

حسن انتخاب: بابر محبوب۔ کراچی

## کانچ کی سرخ چوڑی

کانچ کی سرخ چوڑی
میرے ہاتھ میں
آج ایسے کھنکنے لگی
جیسے کل رات شبنم سے لکھی ہوئی
ترے ہاتھ کی شوخیوں کو
ہواؤں نے سُر دے دیا ہو

(پروین شاکر)

حسن انتخاب: تحسین جونیجو۔ بورڑی

## میٹھی اذیت

بچھڑا ہے اِک شخص جب سے
پھر اُس کے بعد نہ جانے کیوں
مجھے رستے میں ملنا
اور پھر رستے میں ہی
بچھڑنا اچھا لگنے لگا ہے

(زرقا مسبم)

حسن انتخاب: راحیلہ شاہ۔ نواب شاہ

## بارش

رات نے جلتی تنہائی میں
اَندھیاروں کے جال تنے تھے
دیواروں پر تاریکی کی گرد جمی تھی
خوشبو کا احساس فضا میں ٹوٹ رہا تھا
گھر آنگن خاموشی اوڑھے جاگ رہا تھا
دروازے بانہیں پھیلائے اونگھ رہے تھے
دور سمندر پار ہوائیں بادلوں سے باتیں کرتی تھیں
ایسے میں اِک نیند کا جھونکا
لہر بنا اور گزر گیا
پھر آنکھ کھلی تو
اس موسم کی پہلی بارش
اور تیری یادیں
دونوں مل کر
ٹوٹ کر برسیں

(سلیم کوثر)

حسنِ انتخاب: عباس علی۔ جھنگ





## تنہائی کا دکھ

رضوانہ کوثر۔ لاہور

انسان، انسان کے ساتھ مل کر رہے تو بہلا رہتا ہے۔ خوش رہتا ہے لیکن کبھی ایسی کیفیات بھی آجاتی ہیں کہ سب کے ساتھ رہتا سہتا، سب کے ساتھ اٹھتا بیٹھا انسان تنہا رہ جاتا ہے۔ بات کسی سے کرتا ہے دھیان کسی اور طرف رہتا ہے۔ بیٹھا کہیں ہوتا ہے، پہنچا کہیں رہتا ہے۔ سامنے کوئی ہوتا ہے اور ذہن کے پردے پر تصویر کسی اور کی ابھرتی رہتی ہے۔ یہ تنہائی کے دکھ کی ابتدائی علامات ہوتی ہیں۔ پھر جب انسان کسی ایسے سے بچھڑ رہا ہو جس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے خوابوں سے زیادہ حسین، سپنوں سے زیادہ سہانے رہے ہوں اور جس کی بات بات پر دل کے تاروں میں جلترنگ بجتا رہا ہو تو یہ بچھڑنا قیامت کا بچھڑنا ہوتا ہے، تب بیتے ہوئے سارے لمحے، گزری ہوئی ساری باتیں، کہے ہوئے سارے بول آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ انسان بھری محفل میں تنہا رہتا ہے۔ سب کے ساتھ ہوتا ہوا بھی اکیلا ہو جاتا ہے۔ اکیلے پن کا یہ دکھ بڑا اذیت ناک ہوتا ہے۔ انسان کو کچھ دیکھنے دیتا ہے نہ کچھ سوچنے دیتا ہے۔ بس اندر ہی اندر اسے گھن کی طرح چاٹتا رہتا ہے۔ موسم کی آنکھ مچولیاں ہوں یا پھولوں اور کلیوں کی مسکراہٹیں، خزاؤں کا مخصوص رنگ ہو یا بہار کی شوخیاں، برسات کی پن پن ہو یا دمکتی شعاعوں کی کش لش۔ اس کی آنکھوں میں اترائی کا غبار اسے تمام رنگوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ بس وہ اپنے اندر قید ہو جاتا ہے اور اس کی ذات کے قفل کی چابی بچھڑنے والا اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

## میرے بہترین دوست

شاہد وفا۔ مور

میرے والدین میرے بہترین دوست ہیں جنہوں نے تکلیف سہہ سہہ کر مجھے عمدہ تربیت دی۔ بچپن سے آج تک میری ہر خواہش کو پورا کیا اور میری خوشی کو اپنی خوشی سمجھا۔ وہ مجھ سے بے لوث محبت کرتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں بچپن میں مٹی میں کھیل کر گھر آتا تھا تو امی مجھے سینے سے لگا کر پیار کرتی تھیں اور ابو شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے جیب خرچ دیتے تھے اگر کہیں میں گرتا تو مجھے والدین ہی حوصلہ دیتے۔ ماں کی گود میرے لیے کسی جنت سے کم نہیں ہے۔ اب بھی اگر میں پریشان ہوتا ہوں تو امی کی گود میں سوتا ہوں۔ وہ ڈھیر ساری دعائیں دیتی ہیں تو زندگی حسین سے حسین تر لگنے لگتی ہے اور دل کو سکون ملتا ہے۔ بڑوں کی عزت کرنا، اساتذہ کا احترام کرنا اور سب سے محبت کرنا اور ہر ایک سے اخلاق کے ساتھ پیش آنا میں نے اپنے والدین سے ہی سیکھا ہے۔ میرے والدین بہت اچھے ہیں۔ ان کی مسکراہٹ میرے لیے بہار ہے۔ میں ان کے قدموں کی دھول ہوں۔ وہ میرے آقا ہیں اور میں ان کا ایسا غلام ہوں جو آزاد رہتا ہے۔ میرے دل سے ہمیشہ یہی دعا نکلتی ہے کہ یا خدا مجھے توفیق دے کہ میں اپنے والدین کو بے شمار سکون اور خوشیاں دے سکوں تاکہ ان کے چہروں پر ہمیشہ مسکراہٹ سجی رہے، آمین۔

## تیری آس ہے اب بھی

میر منظور احمد لُنڈ

ہماری محبت ویسی ہی یادگار محبت تھی جیسے پُرخلوص محبت کرنے والوں کی ہوتی ہیں۔ ہم میں بہت گہرا روحانی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور قلبی سنجوگ تھا مگر قسمت میں ہمارا ملن نہیں تھا۔ اس روز میں کسی کام سے حیدر آباد گیا تھا اور وین سے واپس آرہا تھا کہ میرے موبائل پر فون آیا۔ دیکھا تو الوینا کے ابو کا نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ انہوں نے بتایا کہ الوینا کی امی نے اس کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ 16 ستمبر کو اس کی شادی ہے۔ اتنا کہہ کر انہوں نے کال ڈراپ کر دی۔ یہ خبر سن کر مجھے لگا جیسے پوری دنیا کا بوجھ مجھ پر گر رہا ہے۔ میرے ہاتھ سے موبائل چھوٹ گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں نے ان آنسوؤں کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ وین میں میرے ساتھ بیٹھا مسافر حیرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس نے مجھ سے وجہ پوچھی میں اسے کیسے بتاتا وہ تو اپنی منزل پر پہنچ جائے گا مگر میں منزل کے اتنے قریب پہنچ کر منزل سے بہت دور ہو گیا تھا۔ پھر تقریباً دو ماہ کے بعد اس کی کال آئی تو میں نے اس سے شکوہ کیا تھا: ''تم نے اپنا گھر بسا لیا میرا گھر اجاڑ دیا۔'' وہ بڑی معصومیت سے بولی۔ ''یہ میرے گھر والوں کا فیصلہ تھا۔ میں کیا کر سکتی تھی۔ شاید ہماری قسمت میں ملن نہیں تھا۔'' جب بھی الوینا کی یاد آتی ہے تو میں سوچتا ہوں کہ اگر الوینا چاہتی تو ہمارا ملن ہو سکتا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے آج تک اس کا انتظار ہے۔ دل کو ایسا لگتا ہے شاید زندگی کے کسی موڑ پر وہ مجھے ضرور ملے گی۔ کیونکہ میری محبت سچی ہے۔

## نقلی ادویات اصلی دوزخ

ام عادل۔ کراچی

خالقِ کائنات اپنی نادر تخلیق انسان سے بے حد محبت کرتا ہے جب کہ انسان خود اپنی ہلاکت کا سبب ہوتا ہے۔ انسان جو وقت کے ساتھ ساتھ علم سے بہت زیادہ آشنا ہونے کا دعویٰ دار ہے درحقیقت وہ اصلی و نقلی فائدے سے بے خبر اور آخرت کے گناہ و ثواب سے اس حد تک غافل و بے پروا ہوتا جا رہا ہے کہ اس چند روزہ زندگی کو عیش و عشرت سے بسر کرنے کے چکر میں وہ اپنی ابدی اور ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی کو بالکل فراموش کر چکا ہے۔ نقلی یا جعلی ادویات بنانے والے بدخصلت افراد نہیں جانتے کہ وہ کتنے گھاٹے کا سودا کر رہے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ قاتل ادویات بنانے اور ان کا منافع کمانے کے دوران ہی جانے کب اس نفع سے فائدہ اٹھائے بغیر ہی وہ خود لقمہ اجل بن جائیں اور دنیاوی منافع دھرے کا دھرا رہ جائے پھر قبر کا خوف ناک گڑھا ہوگا اور اپنی بداعمالیوں اور انسانیت کے خون سے رقم شدہ نامہ اعمال۔ حیف صد حیف! جعلی ادویات بناتے وقت وہ اپنی موت کیوں بھول گئے کیا انہوں نے آبِ حیات پی رکھا ہے یا شیطان کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہنے کی کوئی ڈیل کر رکھی ہے۔ کائنات کا خالق منصف ہے وہ کسی پر بھی ناحق ظلم نہیں کرتا، ایسی بدسوچ رکھنے والے خود اس جہان فانی میں لوگوں کی زندگیوں سے کھیل کر ان کے لیے شہادت اور جنت اور اپنے لیے نقلی ادویات کے بدلے اصلی دوزخ کے خریدار بن رہے ہیں۔ خدارا! ہوش کے ناخن لیجیے توبہ کا دروازہ حالت سکرات تک کھلا ہے۔ کیا آپ نے اپنے ضمیر کو اتنی گہری نیند سلا دیا ہے کہ وہ اب آپ کے ساتھ روزِ محشر ہی بیدار ہوگا مگر تب کیا فائدہ تب تک تو بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ تب آپ کا جسم و جان دونوں دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔

## وہ ایک سجدہ.....!

ثانیہ بھٹی۔ سیالکوٹ

سفارش کرنے کے لیے انسان کو اپنے جیسے انسان کے سامنے جھکنا پڑتا ہے تاکہ وہ اپنا جائز یا ناجائز کام نکلوا سکے مگر سفارش کرنے والا یا کروانے والا کیا یہ نہیں جانتا کہ سب انسان خدا کے غلام ہیں۔ جب غلام ایک ہیں اور مالک بھی ایک ہے تو غلام کے سامنے جھکنے کا کیا فائدہ.....! ہم اس مالک کے آگے کیوں نہیں جھکتے؟ ہم اکثر



یہ شکایت کرتے پائے جاتے ہیں کہ اللہ پاک ہماری دعائیں پوری نہیں کرتا لیکن ہمیں یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ ہم خدا کے لیے کیا کر رہے ہیں اس کی رضا کے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں؟ تاہم اگر ہم اس کے لیے کچھ نہ بھی کر رہے ہوں پھر بھی وہ ہمیں دیتا ہے۔ ہماری سنتا ہے تو پھر ہم اپنے جیسے انسان کے سامنے سرِ تسلیم خم کیوں کرتے ہیں؟ ہمیں کسی سے مانگنے یا سفارش کرنے کے بجائے اللہ پاک سے مانگنا چاہیے۔ جب بندہ صرف خدا سے مانگتا ہے تو اسے کسی انسان کی سفارش کی ضرورت نہیں پڑتی، نہ ہی کسی کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

## محبت

روبینہ شاہین۔

محبت ایسی طاقت ہے جو تخلیقِ کائنات کی وجہ بنی اور پھر آدم کے وجود میں نمو پا کر رونقِ کائنات بن گئی۔ یہ محبت ہی ہے کہ ماں تخلیق کے اذیت ناک مراحل کا کرب جھیل کر بھی مسکراتی ہے اور یہ محبت ہی ہے کہ جب دو اجنبی زندگی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں تو ایک دوسرے کی جان بن جاتے ہیں اور جب یہی محبت عشق بن جاتی ہے تو امر ہو جاتی ہے لیکن عشق میں جذبے کی پاکیزگی اور سچائی شرط ہے۔

## ماں

روبینہ منور۔ کراچی

میرا پہلا عشق اور میری پہلی محبت میری ماں ہے۔ میری داستانِ حیات میری ماں کے گرد گھومتی ہے۔ ماں کے دم سے ہی سب کچھ تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں بہت چھوٹی تھی انہوں نے میری کتنی اچھی دیکھ بھال کی تھی۔ محنت مزدوری کر کے مجھے پڑھایا، مجھے دنیا جہان کی آسائشیں فراہم کیں اور مجھے اپنے بے غرض پیار سے نوازا۔ میری ماں سادگی اور خلوص کا پیکر تھیں اور دوسروں پر جان چھڑکنے والی عورت تھیں۔ دنیا میں میرا ایک ہی Best friend ہے اور وہ ہے میری ماں، میری ماں سے مجھے ایسی خوشبو ایسی مہک آتی ہے جو دنیا کے کسی گلاب میں نہیں ہے۔ میری ماں میرا آئیڈیل تھیں۔ ماں تو ماں ہوتی ہے، جیسے برگد کا درخت جتنا بوڑھا ہوتا ہے اس کی چھاؤں اتنی ہی ٹھنڈی اور گھنی ہوتی جاتی ہے۔ جب میری ماں بہت بیمار ہو گئی تھیں میں نے رو رو کر اپنے خدا سے ماں کی زندگی کی بھیک مانگی تھی۔ میں ماں کو دیکھ کر مسکراتی تو ایسا لگتا کہ میری سوچ نے ان کے ذہن کے دروازے پر دستک دی ہو جب وہ آنکھیں کھولتیں لگتا جیسے زندگی کے سب رنگ اتر آئے ہوں۔ پھر ماں زندگی کی بازی ہار گئیں۔ ماں زندگی سے روٹھ گئی تھیں۔ دل میں جانے کیا کیا چھپائے دنیا سے منہ موڑ گئی تھیں۔ میں بہت روئی تھی۔ ماں لفظ کتنا پیارا ہے۔ منہ سے نکلتا ہے تو خوشبو سی بکھر جاتی ہے۔ جس طرح گلاب کا پھول باغ کی رونق ہوتا ہے اسی طرح ماں کا وجود گھر کی رونق ہوتا ہے۔ ماں کی زبان اتنی شیریں تھی دل چاہتا ماں بولتی رہے اور میں سنتی رہوں۔ جن کی ماں نہیں ہوتی ان کے دل سے پوچھو وہ کس کرب سے گزرتے ہیں۔ مجھے اپنی ماں کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے ماں کے لیے اپنے جذبات قلمبند کرتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ ماں کے لیے لکھنے کو تو بہت کچھ ہے اتنا کہ شاید پوری کتاب بن جائے مگر میرا قلم ساتھ نہیں دے رہا کیونکہ آنسوؤں کا سمندر آنکھوں میں اتر آیا ہے جسے روکنا میرے بس میں نہیں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## زندگی سے موت تک

تنویر خالد۔ کوئٹہ

ہم پیدا ہوئے پھر جوان ہوئے پھر بوڑھے ہوئے اور پھر ایک دن اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ کہنے کو تو یہ بہت آسان لگتا ہے پر جب اس کی گہرائی میں جایا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں کیا کچھ پوشیدہ ہے۔ ہم اپنی زندگی میں اس قدر مگن ہو گئے ہیں کہ سب کچھ ہی بھول بیٹھے ہیں۔ بس ہم یہی سوچتے رہتے ہیں کہ دوسروں کی نظروں میں کس طرح خود کو اچھا ثابت کیا جائے۔ کیا کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ اللہ کی نظر میں خود کو کس طرح سے اچھا ثابت کیا جائے۔ شاید نہیں کیونکہ ہمارے پاس تو وقت ہی نہیں ہے۔ ہم تو بس دنیا داری نبھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک بات اکثر مشاہدے میں آئی ہے کہ جتنا دھن دولت انسان کے پاس زیادہ آجائے وہ اتنا ہی خدا باری تعالیٰ سے دور ہو جاتا ہے۔ اسے پتا ہی نہیں چلتا کہ کب اذان ہوئی، نماز کے تو قریب جانا دور کی بات ہے اسی طرح اس کی اولاد بھی ویسی ہی ہو جاتی ہے۔ آج ہم موت کو تو شاید بھول ہی گئے ہیں۔ ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ زندگی عارضی ہے۔ ایک دن یہ دنیا ہم کو چھوڑ کر جانی ہی پڑے گی اور پھر ہم ایک نئے جہان میں چلے جائیں گے۔ ایک ایسا جہان جو ہمیشہ رہے گا اور اس جہان میں ہم کو وہی ملے گا جو ہم یہاں کر کے جائیں گے اگر اچھا کر کے جائیں گے تو ہمارے ساتھ اچھا ہو گا اور اگر برا کریں گے تو آخرت میں ہمارے ساتھ بھی برا ہو گا۔ یعنی ''کر بھلا تے ہوئے بھلا''۔ آج تو ہم بڑے بڑے گھروں میں رہتے ہیں۔ گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں اور تھری پیس اور اعلیٰ لباس تو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ پر کبھی یہ سوچا ہے کہ جب مٹی کے اس بُت سے جان نکال لی جائے گی تو کیا ہو گا۔ پھر لٹھے کے کپڑے ہمیں پہنائے جائیں گے اور چار کندھوں کے سہارے ہم اپنا آخری سفر کریں گے۔ پھر لوگ ہمیں قبر میں دفن کر کے واپس آجائیں گے۔ کہتے ہیں کہ قبر دن میں ستر دفعہ پکارتی ہے پر ہم ایک دفعہ بھی اسے یاد نہیں کرتے۔ کیونکہ ہمارے پاس تو وقت ہی نہیں ہے۔ مرنے کے بعد یہی ہماری پناہ گاہ ہے۔ کبھی سوچا ہے وہ منظر جب ہم کو قبر میں اتارا جائے گا اور جب مٹی ڈالی جائے گی اور پھر بالکل اندھیرا چھا جائے گا۔ کبھی اپنے کمرے میں اندھیرا کر کے یہ سوچیے کہ قبر ہے تب ہماری روح دہل جائے گی۔ پر ہم تو یہ سوچتے ہیں کہ جب وقت آئے گا دیکھ لیں گے لیکن اس وقت دیکھا نہیں دکھایا جائے گا۔ ہو سکے تو سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لو اور نماز قائم کرو۔ وہ بہت بے نیاز اور رحم کرنے والا ہے۔ وہ ضرور معاف کرے گا۔ اس نے ہمیں بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ ''اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔''

## دور ابا

صائمہ سحر۔ کراچی

جب انسان کبھی زندگی کے کسی دوراہے پر آتا ہے تو الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اسے سمجھ نہیں آتی کہ کون سی راہ درست ہے اور اسے کس سمت جانا ہے۔ خاص طور پر وہ وقت انتہائی صبر آزما ہوتا ہے جب دوراہے کا فیصلہ اپنوں کے درمیان ہو۔ انسان اپنوں کے درمیان الجھ سا جاتا ہے۔ یہ صرف وہی سمجھ پاتا ہے جسے ایسی صورت حال سے واسطہ پڑا ہو۔ میری دعا ہے کہ کسی کی بھی زندگی میں ایسا نہ ہو کیونکہ کسی ایک راہ کا انتخاب انتہائی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے اور اگر کبھی کسی دوراہے کا سامنا ہو تو ہمیں درست سمت میں قدم بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔



# تبصرہ اور تذکرہ

کتابوں پر تبصرے اور ادیبوں کی گفتگو، باتیں، یادیں

## عرفانِ ذات کا شاعر

# ضیاء شاہد

عکاشہ سحر

تخلیق اور پھر اچھی شاعری کی تخلیق ایک کارِ دشوار ہے۔ کائنات کی وسعتوں میں بکھرے الفاظ کی تلاش کرنا اور پھر ایک خاص ترتیب سے قرطاس کی زینت بنانا..... یہ ہنر ہر کسی کو تو نہیں آتا، دشت تنہائی میں غبار آلود راستوں کا سفر طے کرتے ہوئے اپنی ذات کی شکست و ریخت کو سمیٹتے بکھیرتے سطریں تراشنا اور پڑھنے والی بے شمار آنکھوں کی نذر کرنا کسی بھی شاعر کے لیے تجرباتی ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی کربناک بھی ہوتا ہے۔

لفظ بہت قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں ہمارا..... لفظ کی حرمت کا پاس رکھنا بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے یہ لفظ اور ان لفظوں سے جڑی داستان کو قاری تک پہنچانے کے لیے شاعر کو اپنی ذات پر کیا کیا کرب سینے پڑتے ہیں! کیونکہ تخلیق کا عمل بہرحال انسان کے اندر سے شروع ہوتا ہے اور پھر پھیلتا پھیلتا ساری کائنات پر محیط ہو جاتا ہے۔

''زادِ عشق'' کراچی کے نوجوان شاعر ضیاء شاہد کا مجموعہ کلام ہے۔ ضیاء شاہد نظم بھی کہتے ہیں اور غزل بھی لیکن اس مجموعہ کلام میں زیادہ تعداد غزلوں کی ہے۔ ضیاء کی غزل کے مطالعے سے ایک بات تو سامنے آئی ہے کہ محبت کا اظہار بہت جداگانہ ہے، وہ دوسروں کے رنگ کو اپنانے اور تکرار ہنر کے قائل ہرگز نہیں ہیں۔ انہوں نے جذبات کے وفور پر قابو پا کر عشق کی تقدیس اور محبت کی شان کو قائم رکھا۔ آہ و زاری کی روش اختیار کرنے کی بجائے شکیبائی کا مسلک اپنایا ہے۔

حسن و جمال کا عہد ایک محدود مکان و زمان میں رہتا ہے۔ بہت سی تاریک جگہیں ہیں جہاں روشن کرنیں نہیں پہنچ پاتیں مگر اس ان دیکھے حسن کے خدا آثار جلوے شاعر کی حیات کے قریں خیمہ زن ہوتے ہیں تو زبان و بیان کے راستے ان کو پذیرائی ملتی ہے۔ ضیاء شاہد کے ہاں شعری رویہ بے حد اور بیحد ہے۔ وہ انسانی اقدار کا نوحہ گر ہی نہیں ان کے ختم کیے جانے پر معترض بھی ہے۔ روایت و جدت کی حسین آمیزش۔ اسلوب میں دلکشی اور تازگی زبان بیان پر عبور، مضامین کا تنوع، موسیقیت کا آہنگ غزل میں خیالات کی پختگی اور نظم میں موضوعات کے تنوع کی موجودگی ان کی تخلیقات کو مزید پرتاثر بنا رہی ہے۔

ضیاء شاہد کی شاعری کے فکر و فنی محاسن کلاسیکی روایت سے جڑے ہوئے ہیں۔ اردو شاعری کی کلاسیکی روایت میں معنی آفرینی اور معنی کی سطح کاری کو ایک نمایاں صفت کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے اسی تنقیدی نقطہ نظر سے میر تقی میر اور مرزا غالب کی شاعری کو مثالی مقام حاصل ہوا۔ اقبال کی شاعری اسی روایت سے منسلک ہے۔ شاعری کے آفاقی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حسن اور ضائع بدائع سمیت، کلام ناطق کو ضد نہیں بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کلام ناطق ہی کے مواد سے کشید کیا ہوا ایک عرق شیریں ہے

ہر اک نظر کو میسر ہو آئینہ لیکن
ملی ہے مجھ کو جو حیرت خدا کسی کو نہ دے

☆

سنگِ وحشت اور اس پر تیشہ، جوشِ جنوں
میرے ہاتھوں سے کوئی کار ہنر ہونے کو ہے

☆

میں سنگِ رہ گزر تھا تم نے آئینہ بنا ڈالا
تمہاری اک نظر نے مجھ کو کیا سے کیا بنا ڈالا

☆

عشق سے وحشت کی جانب اک سفر ہونے کو ہے
دشت گویا زندگی کی رہ گزر ہونے کو ہے

''زادِ عشق'' کی شاعری لمحہ موجود کی عکاس ہے اس میں کوئی تصنع اور بناوٹ نظر نہیں آتی۔ ضیاء شاہد شعر کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ سچی اور منفرد شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ ایک عرصے کے لیے ذہن کو معطر اور دل کو مسحور کیے رکھتی ہے۔ ضیاء کے بیشتر اشعار اسی کیفیت کے عکاس ہیں ان کی شعری ترجیحات روایتی نظام سے مکمل جڑی ہوئی نظر آتی ہیں ان کے ہاں لفظوں کو برتنے کا ایک خاص سلیقہ موجود ہے۔

میرا وجود زمانے سے مٹ نہیں سکتا
میں اپنے عہد کی سچائیوں میں رہتا ہوں

☆

کوئی پوچھے تو امیرِ شہر سے
کیا تماشا ہو رہا ہے ہر طرف

ضیاء شاہد کی غزل روایات کے معیارات کی مکمل پاسدار ہے۔ ان کی غزلیں حالات میں بکھری ہوئی معنویت کی توسیع نظر آتی ہیں بہت سے متنوع راستے ہیں جو ان کی شاعری میں موجود ہیں۔

عشق میرا مجھے پسپا نہیں ہونے دیتا
میں بھی گرتا ہوں مگر گر کے سنبھل جاتا ہوں

☆

کیمیائی خاصیت دریافت کرنی ہو جسے
آئینے میں سالموں کا عکس بھی حاصل کرے

☆

یہ کائنات ایک خرابے سے کم نہیں
ہونے لگا ہے مجھ کو گماں آپ کے بغیر

☆

وہ چلے جب تو ٹھہر جاتی ہے دل کی دھڑکن
وہ ٹھہر جائے تو یہ وقت ٹھہر جاتا ہے

☆

ضیاء شاہد کا اسلوب سخن مختلف جہات رکھتا ہے اور اسلوب کی مختلف پرتیں کھولتے ہوئے ضیاء کی ہنر کے ساتھ وابستگی یا تعلق اور بھی مستحکم ہوتا ہے۔ انہوں نے مختلف رنگوں، تصویروں اور خوبصورتیوں کو باہم یکجا کر کے اپنے تخلیقی رویے کی بنیاد رکھی ہے۔

تمہیں وہ آنکھ بھر کر دیکھتی ہیں
مری جاں تتلیوں سے دور رہنا
یہ رستہ عشق کا رستہ ہے اے دل
تو پھر کیوں وحشتوں سے دور رہنا

☆

ضیاء شاہد کے ہاں حساسیت، ظلم کے خلاف بلند آواز، ہجر و وصال، حوصلہ مندی کے موضوعات ملتے ہیں۔ وہ کھلی آنکھوں اور حساس دل کے تانے بانے سے شعر کا سراپا تخلیق کرتے ہیں لیکن ان کا یہ لہجہ زرخیز زمینوں سے اپنے شعری آہنگ کے سچے مفاہیم اور نئے رنگ لے کر ظہور پاتا ہے



ہزاروں مرحلے دشوار سے دشوار آتے ہیں
جہاں میں آدمی کو صاحب کردار ہونے تک

☆

ضیاء شاہد کے ہاں ہجر کی کیفیات بھی مختلف انداز میں نمایاں ہوئی ہیں اور استفہامیہ لب و لہجہ ایک خوب صورت شعری فضا ترتیب دیتا ہے۔ زندگی کی مختلف پرتیں مختلف رخوں سے کھلتی چلی جاتی ہیں۔

مرے لب پر انہی کا تذکرہ
جنہیں بچھڑے زمانہ ہو گیا ہے
ہمارے درمیاں اک حاشیہ تھا
جواب بے انت صحرا ہو گیا ہے

ضیاء شاہد کی شاعری میں داخلی معاملات کے ساتھ ساتھ خارجی واقعات بھی ہیں۔ ان کے یہاں اردو غزل میں روایتی اور کلاسیکی حوالے سے معاملہ بندی کا جو عمل ہے۔ وہ بھی جاری و ساری دکھائی دیتا ہے۔ سادگی اور بے ساختگی ان کی غزل کی پہچان ہے

دیکھا تھا کبھی اس نے محبت کی نظر سے
اک عمر شب غم نے ستایا مرے دل کو

سلاسل، مقتل، سورج، صیاد، ماتم، پتھر، سنگ، چراغ، انجمن، تیرگی، قافلہ، شبنم، اشک، آئینہ، ان کی شاعری کے بنیادی استعارے ہیں۔

اسے بھی میری طرح تیرگی سے وحشت تھی
چراغ جب میں جلاؤں وہ یاد آئے مجھے
چراغ بزم محبت ہوا ہوں میں جب سے
جلائے کوئی مجھے اور کوئی بجھائے مجھے

☆

خلوت غم میں چمکتے ہیں ستارے بن کر
میری پلکوں پہ سجے اشک تمہارے جاناں

ضیاء شاہد کی وجدانی دولت کی فراوانی ہی ان کے کلام کو موزونیت کے خزانے عطا کرتی ہے۔ وہ مثالی دنیا کے خواب کی تعبیر دیکھنا چاہتے ہیں جو زمین کے ممکنات سے بہت دور جا چکی ہے۔ مایوسی کی حکمرانی ہے اندھیرا، تاریکی، وحشت۔

جو نحرِ ضبط دلوں میں رُکا ہوا ہے ضیاء
وہ انقلاب کی صورت بپھر نہ جائے کہیں

☆

دیکھ لیں ہم نے ہزاروں کوششیں کر کے ضیاء
مسئلوں کا ایک ہی حل رہ گیا ہے انقلاب

☆

تیرگی شہر میں اب اور بڑھے گی کتنی
انتہا اس کی دکھائی نہیں دیتی ہم کو

ضیاء شاہد کی مجموعی شعری فضا سے ان کے موضوعات اور ان کی شعری کائنات کا ایک مکمل امیج کچھ اس طرح سامنے آتا ہے کہ ان کی غزل میں تنوع اور رنگا رنگی کی ایک کہکشاں دور تک پھیلی ہوئی ہے اگرچہ ''زادِ عشق میں'' عصری صورت حال کی آئینہ داری بھی ہوئی ہے۔ ہجر، عشق، محبت، وصال، جدائی، بے وفائی، دوری، مجبوری کے بھی مختلف رنگ مختلف انداز میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔

ضیاء شاہد کھلی آنکھوں سے غم دوراں اور غم جاناں کے باہم امتزاج سے بہت ہی خوب صورت اور منفرد اشعار تخلیق کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی غزل فنی و فکری حوالے سے بہت مضبوط اور جاندار ہے۔ ان کی غزل کا تاثر مختلف تنوع الجہات اور متاثر کن ہے۔ رفعت و رعنائی، خیال، خوب صورت بندش الفاظ، تراکیب و محاورات کا برمحل استعمال، مترنم بحور اور لفظ کی موسیقیت

محبت کے سبھی بے رنگ موسم
وہ میرے نام کرتا جا رہا ہے

☆



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ضیاء شاہد کی نظم کا موضوع انسان اور انسانیت ہے۔ بیشتر نظمیں معاشرتی مسائل اور المیوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ ''مرے شہر میں'' لہو کا سودا نہیں کریں گے۔ تمہارے ساتھ ہیں ہم حرف آخر، معتبر لمحہ، کرب، اجازت، صلیب محرومی اندیشہ، مجھے آواز آتی ہے، نکتہ موہوم، بہار بن کر خزاں سے نکلو، اپنا موضوع، مضامین خیال اور مفاہم کے حوالے سے بہت خوب صورت اور متاثر کن نظمیں ہیں مگر ضیاء شاہد کا فن مکمل طور پر کھل کر غزل ہی میں نظر آتا ہے۔ ان کی نظم ''کرب'' پڑھیے۔

میں جس ہوا کے دوش پر
تھا
آج تک
سفر سفر
وہ
آندھیوں میں کھو گئی
ہست و نیست ارادہ یا خبر کے مابین..... اپنی ہی تلاش میں سرگرداں ضیاء شاہد تجسس، تنہائی اور حزن و جستجو کی دنیا میں قید ہیں..... تجسس جستجو ضیاء شاہد کے فن کا باقاعدہ حصہ نظر آتے ہیں۔ شاعری مسلسل ریاضت سے عمل پذیر ہوتی ہے جس طرح خوب صورتی کی کوئی آخری تعریف نہیں ہوتی۔ اسی طرح خوب صورت تخلیق کی بھی کوئی آخری تعریف نہیں ہوتی۔ میں ضیاء شاہد صاحب کو اس خوب صورت مجموعہ کلام کی اشاعت پر خلوص دل سے مبارک باد پیش کرتی ہوں..... خدائے حرف و قلم انہیں ان کے قلم و قرطاس سمیت اپنی حفاظت میں رکھے روشن صبح کی اولین ساعتوں میں مانگی گئی ساری خوب صورت دعائیں ان کے شعری وجدان کے نام۔

☆☆☆

کاشی چوہان

نوجوان شاعر کاشی چوہان کا خوبصورت شاعری سے سجا مجموعہ کلام.....

شائع ہو چکا ہے

تم نے سونا بنا کے مٹی سے
مجھ کو مٹی کے بھاؤ بیچ دیا

دوشیزہ اور سچی کہانیاں کے قارئین کے لیے خصوصی ڈسکاؤنٹ۔ کتاب کی قیمت میں کتاب آپ کے ہاتھ میں۔ نہ کوئی ڈاک خرچ اور نہ کوئی دوسرا خرچ۔ پاکستان بھر سے صرف ایک S.M.S یا فون کال کیجیے، کتاب آپ کی دہلیز تک پہنچا دی جائے گی۔

رابطے کے لیے

0307-2089080
0345-2540616




# پسند اپنی اپنی

قارئین کے پسند کردہ اشعار، ادبی ذوق کے آئینہ دار

احمد فراز..... رضوانہ کوثر، لاہور

اب مجھ کو نہیں یاد فراز اپنا ہی پیکر
جس روز سے بکھرا ہوں، سمٹ کر نہیں دیکھا

احمد فراز..... میر منظور احمد، ٹنڈو محمد خان

درد میں کوئی موسم پیارا نہیں ہوتا
دل ہو پیاسا تو پانی سے گزارا نہیں ہوتا
کوئی دیکھے ہماری بے بسی فراز
ہم سب ہی کے ہو جاتے ہیں، کوئی ہمارا نہیں ہوتا

فیض احمد فیض..... وفا صدام حسین غازی، تنیو

نہ جانے کس لیے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری راہ گزر بھی نہیں

شہاب صفدر..... غلام حیدر، اسکردو بلتستان

رہ گئے انجم دھرے، مہتاب رکھا رہ گیا
رات کی دہلیز پر ہر خواب رکھا رہ گیا
اڑ گئے سبھی پرندے، آب و دانہ چھوڑ کر
ہجرتیں واجب ہوئیں، اسباب رکھا رہ گیا

حجاب عباسی..... معیز احمد، کراچی

دکھوں کو بھولنا آسان تھوڑی ہوتا ہے
کہ دل تو دل ہے، یہ بے جان تھوڑی ہوتا ہے
گزرتا وقت بدلتا ہے خال و خد سب کے
یہ ساری عمر کا سامان تھوڑی ہوتا ہے

لیاقت علی عالم..... سائرہ انجم، حیدر آباد

کتنی عجیب بات ہے، سب دوست کھو گئے
تُو جب سے مل گیا ہے، کوئی مل نہیں رہا
ہم دور آ گئے ہیں بہت اپنی موج میں
اے دوست، آنکھ کھول کہ ساحل نہیں رہا

کاشی چوہان..... تحریم ناز، لاہور

تعلق زندگی سے کیا ہے میرا
تماشہ دیکھنے والا ہے میرا
شجر کیسا، کہاں کی چھاؤں پیارے
کہ اب تو دھوپ ہی سایہ ہے میرا

شہزاد نیر..... فرحان علی، جہلم

دونوں اک شمعِ محبت تو جلا بیٹھے ہیں
سوچنا یہ ہے کہ روکیں گے ہوائیں کیسے؟

نوازش علی ندیم..... رائمہ مجید، ٹنڈو آدم

عبادتوں میں نہیں فرق، لفظیات میں ہے
کہیں نماز، کہیں عشق واجبات میں ہے
نکھارتی چلی جاتی ہے کیوں مرے خدوخال
فقط جلانا اگر آگ کی صفات میں ہے

بہرام ساحل..... منیبہ منیر، اوکاڑہ

ہم تو اہلِ قلم ہیں نہ سخن ور بابا
ہم ہیں اخلاص و محبت کے پیمبر بابا
رام کرنے کو مجھے حشر اٹھاتا کیوں ہے؟
الٹے پڑ جاتے ہیں اکثر پڑے منتر بابا

طارق کریم کھوکھر، نسرین خواجہ، میر پور میرس

جس نئے غم سے ملاتے ہیں یہاں لوگ مجھے
اُس سے برسوں کی ملاقات نکل آتی ہے

طاہر شیرازی..... سلیمہ بخش، دادو

ہمارے گاؤں کے رستے میں کچھ بے نام قبریں تھیں
وہاں جا کر میں اکثر فاتحہ خوانی کیا کرتا
جہاں خاموشیاں شب بھر تلاوت کرتی رہتی تھیں
تجسس ہر گھڑی اُس در کی دربانی کیا کرتا

اختر عبدالرزاق..... پری وش، پشاور

میں اڑ رہا تھا تو مجھ کو زمیں نظر آئی
زمیں پہ آ کے مجھے آسماں دکھائی دیا
حفیظ شہر تھا لیکن امان میں اُس کی
ہر ایک شخص مجھے بے اماں دکھائی دیا



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سیف الرحمان سیفی.....حیات خان' بونیر

ظلم ہوگا نہ کسی پر' یہ کہا ہے اُس نے
یہ اگر سچ ہے تو اس سچ کی ضمانت کیا ہے؟

انجم جاوید.....شعبان کھوسہ' کوئٹہ

ہمارے گاؤں میں بارش نہیں ہوئی اب کے
زمین سوکھ گئی اور لگان سر پر ہے
امان میں ہے مرے عہد کا ہر اک بچہ
زمین ہو کہ نہ ہو' آسمان سر پر ہے

آتش.....محمد علی' حیدرآباد

یہ شوق دیکھو پسِ مرگ بھی تجلی نے
کفن میں کھول دیں آنکھیں سنا جو یار آیا

حمید عاکف.....رفیعہ رزاق' جھنگ

جسے آنکھوں نے میری پھینک ڈالا تھا کہیں پر
اب آنکھوں کو وہی منظر اٹھانا پڑ رہا ہے

رضا ٹوانہ.....راشد رفیق' کراچی

اگر تم ہنس کے کہہ دیتے' چلے جاؤ' چلے جاتے
تمہاری بات بن جاتی' ہماری بات رہ جاتی

سید غالب احمد.....عاصم خان نیازی' میانوالی

سب اُسی ذات کا عطا کردہ
جو بھی موجود جسم و جاں میں ہے
بات نوکِ قلم کی قید میں ہے
کرب تخلیق امتحان میں ہے

اشرف نقوی.....رومیصہ' ڈسکہ

جہاں بھی جایئے' یہ ساتھ ساتھ رہتی ہے
یہاں وہاں یہ اجارہ شبِ فراق کا ہے

عظیم راہی.....ثروت شان' کراچی

اب دل کا لہو سرد نہ ہوگا کسی صورت
اب دل میں ترے غم کی روانی ہی الگ ہے
لاکھوں میں نظر آئے گا وہ شخص اکیلا
اے دیدہ ور' اُس کی نشانی ہی الگ ہے

ضیاء شاہد.....نائلہ غضنفر' کراچی

اپنی منزل کی طرف اٹھ کر چلے جائیں گے لوگ
میں چراغِ بزمِ شب ہوں اور سحر ہونے کو ہے
اٹھ رہے ہیں آج طوفاں چاروں جانب سے ضیاء
یہ جہانِ آب و گل زیروزبر ہونے کو ہے

حسین جاوید.....یاسر دلاور خان' ایبٹ آباد

اُس کے مضبوط ارادوں کی خبر ہے مجھ کو
وہ بھی واقف ہے مرے ضبط کی کمزوری سے
قید کر رکھا ہے الفاظ نے دل کو جیسے
ایک مزور بندھا ہوتا ہے دو روٹی سے

نوید سروش.....محمد موسوی' گلگت

کبھی سر اور کبھی دستار بدلتے رہنا
جنگ لڑتے ہوئے ہتھیار بدلتے رہنا
عمر بھر ایک شجر پر کہاں رہتے ہیں طیور
اُن کی فطرت میں ہے اشجار بدلتے رہنا

خالد یوسفی.....ثمینہ کلام' کالا باغ

بچھڑ کے مجھ سے وہ ہوگا کہاں' کس حال میں ہوگا؟
خیال اُس کا مری آنکھیں بھگو دیتا ہے بارش میں

نوشاد قاصر.....رخشندہ خان' اٹک

عجب حیرت سے خود کو پڑھ رہا ہوں
سے کے ہاتھ پر لکھا ہوا ہوں
تراشیں گے ابھی کتنے زمانے
ابھی آدھا مکمل ہو سکا ہوں

صابر علی صابر.....نسیم شیر خان' چوکی

ہمارے بعد یہ لازم ہے عہدِ نو کے جواں
خوشی کے ساتھ شکستہ دلوں کی بات کریں

غالب.....سید فرحان احمد' کراچی

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

.....•.....•.....•.....•

نوٹ: شعر کے ساتھ شاعر کا نام ضرور لکھیں۔ شاعر کے نام کے بغیر شعر شاملِ اشاعت نہیں کیا جائے گا۔ (انچارج) پسند اپنی اپنی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

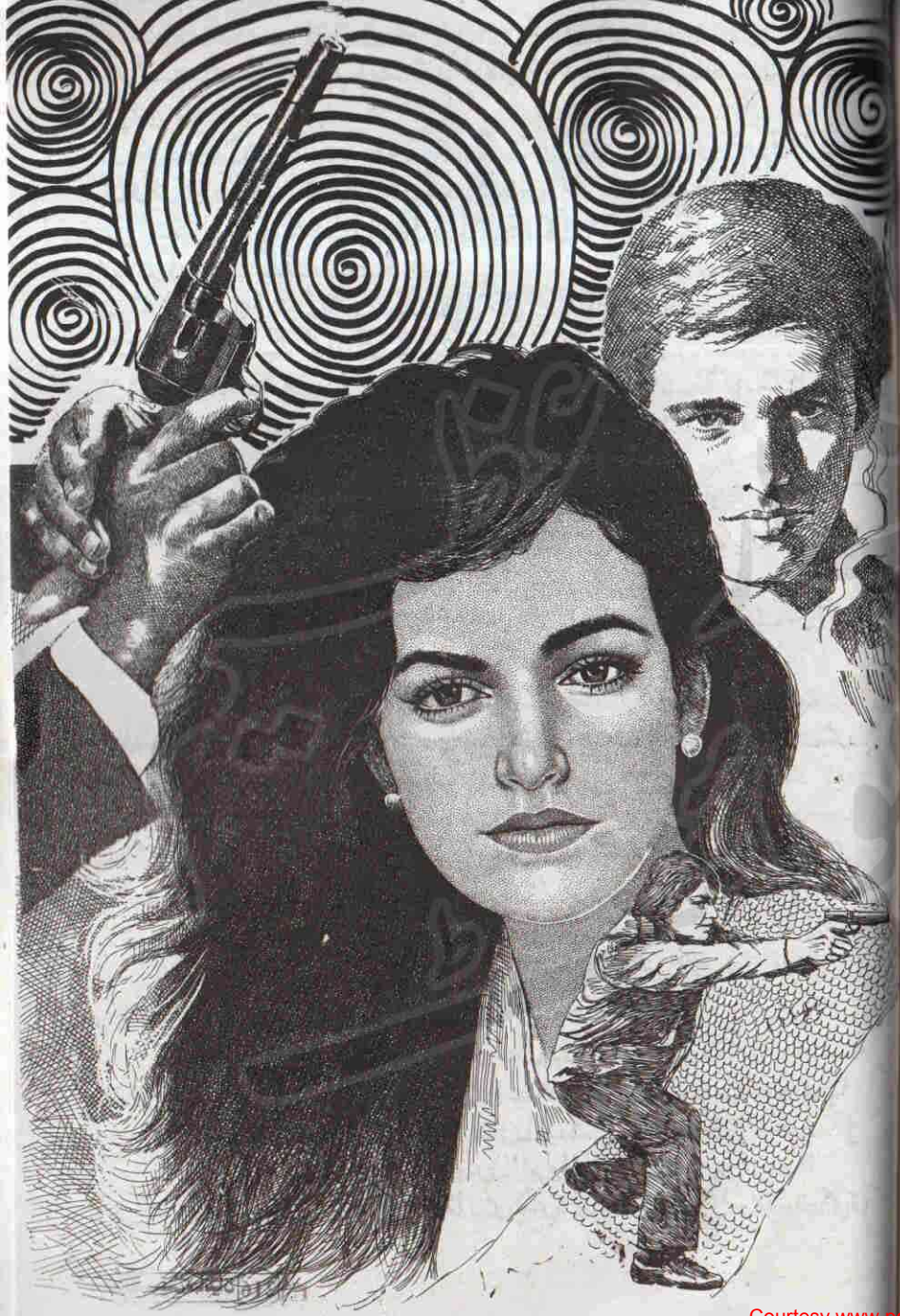

طویل کہانی "سچی کہانیاں" کی ایک مقبول و معروف لکھاری کی طویل کہانی، اقساط میں

فاطمہ بلگرامی

# جن آنکھوں میں خواب سے تھے

شاہد بخاری کا خیال

اب وہاں یادوں کا بکھرا ہوا ملبہ ہی تو ہے
جس جگہ عشق نے بنیاد مکاں رکھی تھی

سچی کہانیاں کی معروف سینئر لکھاری کا دلچسپ و تحیر خیز سلسلہ۔ قسط نمبر 3

**خلاصہ:** داؤد عرف ڈیوڈ کی ماں میری ایک انگریز عورت تھی جس نے ایک ایشیائی افتخار الملک نامی شخص سے شادی کی تھی...... اس رشتے کی پاداش میں میری کے ارب پتی باپ لارڈ ڈلفی نے اسے جائیداد سے عاق کر دیا تھا۔ اسی دوران حالات نے اسے اپنے شوہر سے جدا کر دیا...... اس کے بعد میری نے اپنے بیٹے کے ساتھ لندن میں بہت مشکل زندگی گزاری اور مر گئی۔ لارڈ ڈلفی کی موت کے بعد یہ وصیت سامنے آئی کہ اس نے اپنی تمام جائیداد کا وارث میری کے بیٹے ڈیوڈ کو قرار دیا ہے لیکن داؤد عرف ڈیوڈ یہ جائیداد قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے جب کہ لارڈ ڈلفی کی اس جائیداد پر ایک یہودی گروپ کی بھی نظر ہے۔ داؤد کی اس گروپ سے ایک جھڑپ بھی ہوتی ہے۔ لندن میں ہی بہن بھائی جیسے رشتوں سے محروم داؤد کی ایک پاکستانی فیملی سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ اس فیملی کی ایک لڑکی کو بہن بنا لیتا ہے لیکن وہ لڑکی داؤد کو بھائی نہیں سمجھتی اور ایک ایسا قدم اٹھاتی ہے کہ داؤد کی عزت داؤ پر لگ جاتی ہے۔ حالات کا مارا داؤد پاکستان اپنے باپ افتخار الملک کے پاس جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ جہاں وہ شادی کے بعد ایک بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہ رہا ہے۔ جہاز میں سفر کے دوران اس کی ملاقات فاطمہ نامی ایک نہایت موڈ لڑکی سے ہوتی ہے جو اسے پاکستان میں ملنے کے لیے وزیٹنگ کارڈ بھی دیتی ہے۔ داؤد پاکستان آتا ہے تو اسے باپ ہی نہیں اپنی سوتیلی ماں اور اس کی بیٹی فہمیدہ سے بہت پیار، محبت اور شفقت ملتی ہے۔ داؤد اپنی دولت کے ذریعے ان لوگوں کی زندگی میں آسانی اور آسائش لانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ **اور اب آگے پڑھیے**

میرے لیے ایسا ہنستا مسکراتا ماحول بالکل نیا تھا۔ لندن میں تو لوگ مشین بن کر زندگی گزارتے ہیں، خاص کر انگریز تو بس، ہنسنے پر بھی سوچتے ہیں کہ ہنسا جائے یا نہیں۔ گفتگو میں اتنی کنجوسی کریں گے جیسے باتیں کرنے پر بھی



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹیکس لگتا ہے۔اس لیے بھی لطف آرہا تھا۔جوائنٹ فیملی کا یہی تو فائدہ ہے۔سب ایک دوسرے سے گھلے ملے ہوتے ہیں۔

''اے عنبر کی بچی میرے منہ مت لگیو میں مار بیٹھوں گی۔'' خالہ نے ڈانٹ پلائی۔ان دونوں کی جھڑپ سے میں ہی نہیں فہمیدہ بھی لطف لے رہی تھی جو ابھی کچھ دیر پہلے واپس آکر عنبر کے برابر میں بیٹھ گئی تھی۔

''اے خالہ میں آپ کے منہ کیوں لگوں گی۔ایسا الزام تو نہ لگائیں کہ میں آپ کے منہ لگ رہی ہوں۔ابھی فوراً کہیں گی یہ میرے گلے لگ رہی ہے۔''

''اے اے کیا بولی؟ارے تیرے دیدے کا پانی مر گیا ہے کیا جو ایسا کہہ رہی ہے۔اتی بھی شرم نہیں کہ سامنے ایک لڑکا ہے اور گلے لگنے کی باتیں کیے جارہی ہے۔''

''لڑکا؟ کہاں ہے لڑکا.....یہ تو فہمیدہ ہے یا پھر داود بھائی ہیں۔یہ لڑکا کہاں سے آگیا۔لگتا ہے آپ کے چشمے کا نمبر پھر بڑھ گیا ہے۔''

تبھی باہر سے بیل بجنے کی آواز آئی۔

''لگتا ہے رابیل بھائی آئے ہیں۔'' عنبر نے خیال ظاہر کیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان اندر آیا۔اسے دیکھتے ہی عنبر نے کہا'میں نے کل آپ سے کیا کہا تھا؟ بھابی کو بھی لانا ہے۔''

''اس کے موڈ کا کب بھروسا ہے'پل میں تولہ پل میں ماشہ۔تیار ہو کر باہر نکلتی کہ اس کی ایک سہیلی آگئی اور اس نے آنے سے انکار کر دیا۔'' رابیل نے جواب دیا۔

''داود بھائی میں نے ان کا تعارف تو کرایا ہی نہیں'یہ میرے فرسٹ کزن ہیں رابیل اختر۔ابو کے بڑے بھائی کے فرزند ارجمند۔ایک مہمان ہستی۔بڑے پر لطف نوجوان ہیں بلکہ اب نوجوانی کو خیر باد کہنے والوں میں سے ہیں۔'' عنبر نے اپنے مخصوص انداز میں تعارف کرایا۔

میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

''داود صاحب میں آپ کا نام سن کر آیا ہوں۔اتنی بار آپ کا تذکرہ سنا ہے کہ بتا نہیں سکتا۔خالو جان کے حوالے سے جب بھی کوئی بات یہاں ہوتی تو اس میں آپ کا تذکرہ ضرور ہوتا۔'' رابیل نے کہا۔

''یہ خوش نصیبی ہے میری۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''داود بھائی'ان کی ایک اور خوبی ہے'یہ چرسی بھی ہیں۔دبا کر چرس پیتے تھے۔'' عنبر نے ایک نیا انکشاف کیا۔مجھے لگا اب وہ ابل پڑے گا۔کچھ کھری کھری سنا دے گا۔مگر وہ تو مسکراتا ہی رہا۔

''یہ جیل بھی آتے جاتے رہے ہیں۔'' یہ بات اس سے بھی کڑی تھی لیکن وہ اسی طرح مسکراتا رہا۔

اب مجھے اس کی ہنسی پر شبہ ہونے لگا کہ وہ مسکرا بھی رہا ہے یا صرف غصے کو دبانے کے لیے ہنسے جارہا ہے؟

تبھی اس نے کہا''شیطان کی خالہ ساری شکائتیں لگا دیں'اب کچھ مجھے بھی بولنے دو گی؟''

''آپ کو کون روک سکتا ہے'بولیں جتنا چاہیں بولیں۔'' عنبر بولی۔

''داود صاحب یہ سچ کہہ رہی ہے'ایک وقت تھا کہ میں پولیس آفیسر تھا۔انتہائی سخت آفیسر پھر وہ وقت بھی آیا



جب میں ڈرگس کا عادی بن گیا۔یہ ایک لمبی کہانی ہے جو کبھی پھر سناؤں گا۔'' رابیل بولا۔

''ضرور ضرور!'' میں نے جواب دیا۔

''داود بھائی میں نے ہوشیار کر دیا'بعد میں مجھے دوش نہیں دیجیے گا۔یہ دل کے بہت اچھے ہیں مگر تکلہ پولیس میں بھی رہ چکے ہیں۔اس لیے.....'' عنبر کھل کر مذاق اڑا رہی تھی اور وہ ہنسے جارہا تھا۔اب مجھے شک ہونے لگا تھا کہ وہ دماغی طور پر کمزور ہے۔

''میں نے بہت بڑی غلطی کر دی'تیری بھابی کے بغیر مجھے آنا نہیں چاہیے تھا۔ابھی اگر وہ ہوتی تو تیری زبان قینچی کی طرح نہیں چل رہی ہوتی۔''

''داود بھائی اب تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔انہوں نے بھی اقرار کر لیا ہے کہ ان کی بیگم صاحبہ کیسی جابر ہستی ہیں۔'' عنبر نے پھر چوٹ کی۔

''ابھی میں گھر جا کر یہ بات بتاتا ہوں پھر سوچ لو بچو وہ تمہارا کیا حشر کرے گی۔مجھے تو بڑا مزہ آئے گا۔'' وہ تالی بجا کر بولا''میں تو ایسے تالی بجاؤں گا۔''

''بس بس میں صرف آپ کی وجہ سے طرح دے دیتی ہوں ورنہ.....ورنہ مجھے تو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔''

رابیل جواب میں کچھ کہتا کہ تحسین خالہ کمرے میں آئیں۔''بیٹا داود چلو کچھ کھا پی لو پھر آرام سے باتیں کرتے رہنا۔''

''ہاں ہاں داود بھائی جلدی چلیے'امی نے آپ کے اعزاز میں میری پسند کی تمام چیزیں بنائی ہیں۔خاص الخاص پاکستانی ڈیشز جو آپ کو لندن میں صرف خواب میں ہی مل سکتی ہیں۔'' عنبر نے خوشی سے چہکتی آواز میں کہا۔

وہ پیاری سی من موہنی صورت والی گڑیا جیسی لڑکی مجھے بہت اچھی لگی تھی۔تصنوع اس میں نام کو نہ تھی۔جو دماغ میں آتا فوراً زبان سے پھینک مارتی خواہ سننے والے کو خجل ہونا کیوں نہ پڑے۔

میں جس ماحول سے آیا تھا۔وہاں یہ سب تصنوع کے پردے میں چھپا ہے۔اسی لیے اس کی خوشی کا ساتھ دینے کے لیے مجھے بھی اٹھنا پڑا۔فہمیدہ کے ساتھ میں بھی کمرے سے باہر آیا اور چھوٹے سے گلیارے سے ہوتا ایک دوسرے کمرے میں پہنچا۔اس کمرے کے آدھے حصے کو کچن کی شکل دے دی گئی تھی۔آدھے حصہ میں ایک درمیانے سائز کی ڈائننگ ٹیبل بچھی ہوئی تھی۔اس ٹیبل پر بہت ساری چیزیں سجی ہوئی تھیں۔امی ابو بھی منتظر بیٹھے تھے۔ابو کے برابر میں ایک اور شخص براجمان تھے۔ان کے سر پہ بال صرف جھالر کی شکل میں تھے۔رنگت کھلتی ہوئی تھی۔تھوڑی پر فرنچ کٹ داڑھی تھی۔انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا''بس بھائی اب اور انتظار نہیں ہوتا۔فوراً شروع ہو جاؤ تاکہ میں بھی کچھ چگ لوں۔''

''یہ کیوں نہیں کہتے کہ داود کے طفیل آج بد پرہیزی کا موقع مل رہا ہے تو خوب انجوائے کر لوں۔'' تحسین خالہ نے ہنس کر کہا۔

میں ان صاحب کے برابر میں جا بیٹھا۔میرے برابر میں فہمیدہ تھی اور اس کے برابر میں عنبر۔رابیل کی طرف دیکھ کر وہ صاحب بولے''رابیل میاں یہ تم نے اچھا نہیں کیا'اکیلا کیلے چلے آئے۔بیوی کو کیوں نہیں لائے؟''

''بس وہ تو اپنے ذہن کی غلام ہے جو اس کے دل میں آتا ہے وہی کرتی ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' پھر انہوں نے پلیٹ میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔''بھئی میں ایک اچھا شوہر ہوں اس



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے تمہاری تحسین خالہ کی ڈانٹ سر جھکا کر سن لیتا ہوں۔ عادی ہو گیا ہوں نا۔"

"خوب جھوٹ کا طومار باندھیے۔ نیا آیا ہے اس لیے آپ سے واقف نہیں ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ "یہ جو تمھارے خالو ہیں نا' ان کی باتوں میں کبھی مت آنا۔ اگر میری بات کا یقین نا ہو تو اپنی امی سے پوچھ لو۔"

"نہیں نہیں آپ لوگ اپنے جھگڑے میں مجھے مت گھسیٹیں۔" امی نے گھبرا کر کہا تو سب کا ملا جلا قہقہہ گونج اٹھا۔ ابو بھی لطف لے رہے تھے اور دھیرے دھیرے مسکرا رہے تھے۔

"میاں داؤد! یقین کرو' یہ جو تمہاری خالہ ہیں نا اگر یہ جنگ عظیم دوم کے وقت ہوتیں تو ہٹلر بھی کانوں کو ہاتھ لگا کر ہتھیار پھینک دیتا۔ پرل ہاربر پر بمباری کی نوبت ہی نہیں آتی۔ ان کے جبر و تشدد کی وجہ سے ہی مجھ جیسا شریف آدمی ان کے گھر پیغام دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔" خالو نے پھر چٹکی لی۔

"دیکھئے دیکھئے' آپ فاؤل کر رہے ہیں۔ کب تک بدلہ لیتے رہیں گے۔" تحسین خالہ نے روہانسی آواز میں کہا تو میں بھی سنجیدہ ہو گیا مگر امی ابو کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھ کر اطمنان ہوا کہ کوئی سنجیدہ بات نہیں ہے۔

"ارے بھائی خاندان میں سب کو یہ کہانی معلوم ہے۔ داؤد بھی خاندان کا فرد ہے۔ ابھی آیا ہے اسے بھی معلوم ہونا چاہیے نا۔" خالو نے مسکراتے ہوئے کہا تو عنبر بولی۔

"جی ابو ضرور بتائیں۔ ہر بار نیا مزہ آتا ہے۔"

"چپ رہ ابو کی چمچی۔" خالہ نے ڈانٹا مگر خالو شروع ہو چکے تھے۔

"بھئی داؤد یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میں بھی نوعمر ہوا کرتا تھا۔ اور سر پر بال بھی ہوتے تھے۔ اور ہم یہاں نہیں انڈیا میں پائے جاتے تھے۔ اسی انڈیا میں جو یہاں والوں کو بہت پیارا ہے جب تک کرکٹ میچ میں مد مقابل نہ ہو۔ اسی انڈیا میں کبھی ہم بھی رہا کرتے تھے اور تمہاری خالہ بھی۔ ان کے ابا مرحوم نے گھر میں آم کا پیڑ لگا رکھا تھا۔ اس پیڑ کی بدقسمتی کے اس میں آم بھی خوب آتے تھے۔ بازار کے آم میں وہ مزہ کہاں جو چوری کے آم میں ہے۔ بس جناب ایک دن ہم چپکے سے ان کے آنگن میں کودے اور پیڑ پر چڑھ گئے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان کی نظر پڑ گئی اور انہوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ میں پیڑ سے کودا اور دیوار پر چڑھ ہی رہا تھا کہ انہوں نے سٹاسٹ دو بینت کمر پر جما دیئے۔ بس وہ چوٹ مجھے ایسی بھا گئی کہ میں نے زندگی بھر کے لیے انہیں اپنے گھر لانے کا فیصلہ کر لیا اور آج تک اس چوٹ کو یاد کر رہا ہوں۔"

میں بھی مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔ ایک میں ہی کیا سب کے چہرے پر شگفتگی نظر آئی تھی۔ اس لیے کہ آنے والے وقت سے سب بے خبر جو تھے۔

"ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق' وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔ میاں انہیں دیکھ دیکھ کر تو میں اس چوٹ کو یاد کر رہا ہوں۔"

"بس اور نہیں اب آپ بھی خاموشی سے کھائیں اور اسے بھی کھانے دیں۔" موم نے مسکراتے ہوئے مداخلت کی۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم پھر سے بڑی خالہ کے کمرے میں آ گئے۔ ہمیں عنبر لے کر آئی تھی کہ داؤد بھائی وقت اچھا گزارنا ہے تو خالہ کے پاس چلیں اور ہم خالہ کے کمرے میں آ گئے تھے۔



"اے بیٹا تم پاکستان تو آ گئے اب یہ بتاؤ تم کرو گے کیا؟" خالہ نے پوچھا۔

"ان کے نانا کے تین باغات ہیں اس میں یہ آم کی فصل لگائیں گے۔" عنبر پٹ سے بولی۔ "انہوں نے انگلینڈ کے ایک سائنسداں سے ایک فارمولہ خریدا ہے۔ ادھر آم کے بیج لگاؤ ادھر لہلہاتی فصل تیار۔ لوگ درنتی لے کر آم کی کٹائی کریں گے۔"

"اے ہئے آم کے باغ' اے ہٹو۔ یہاں کے آم ۔۔اللہ توبہ۔ آم تو ہمارے یہاں ہوتے تھے۔ کیا میٹھے۔۔۔ آہا۔۔۔" زبان چچپا کر خالہ نے کہا۔ "ایسے رسیلے کے مت پوچھو۔۔ایک بار کھا لو تو کئی روز تک زبان سے ذائقہ نہ جائے۔"

"جی ہاں جنت سے سیدھے اترتے تھے۔" عنبر نے نیچی آواز میں کہا۔

"کیا بولیں۔" خالہ نے چونک کر پوچھا۔

"بالکل جنت کے پھل کا مزہ ہوتا تھا۔" عنبر نے جلدی سے کہا۔

"ہاں بیٹا خوب کہا' بالکل جنت کے پھل جیسا ذائقہ ہوتا تھا۔"

"اچھا خالہ یہ تو بتایئے آپ وہاں سے کب آئیں؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔ کیوں کہ میں تو یہ جانتا تھا کہ سب سے پیارا وطن پاکستان ہے۔ اسی کی محبت میں لوگوں نے اپنے گھر بار کو چھوڑا' بے شمار قربانیاں دیں تب جا کر یہ ملک بنا ہے۔ اس پر تو مسلمانوں کی جان بھی قربان ہے۔ یہ کیسی ہیں جو ایک دوسرے ملک سے' اپنے دشمن ملک سے محبت کا اظہار کر رہی ہیں۔ لگتا ہے یہ ابھی نئی نئی وہاں سے آئی ہیں، مگر میری بات سن کر انھوں نے کہا:

"ہم آئے تو سینتالیس میں تھے۔ تمہارے خالو کا گھر میں کافی زور تھا۔ وہ زبردستی ہمیں لے آئے تھے۔ یہاں آئے تو نا جائیداد تھی اور نہ نوکری' کھانے کے بھی لالے پڑ گئے تھے۔ تمہارے خالو کو نوکری ملی بھی تو بہت معمولی۔ چاہ کر بھی وہ جا نہیں پاتے تھے۔ صرف اس سرزمین کو خیالوں میں یاد کر لیتے تھے۔"

"کافروں کے ملک میں سے بھگائے گئے تھے اسی لیے یہاں آئے تھے۔" عنبر نے منہ بنا کر دھیرے سے کہا۔ بعد میں پتا چلا کہ اسے تو انڈیا سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اگر گھر میں کوئی وہاں کی فلم لگا لیتا تو یہ گھر کو سر پر اٹھا لیتی تھی۔ صرف خالہ کے آگے مجبور تھی۔ مجھے بھی اس کے خیالات پسند آئے تھے۔ وہ کہتی تھی۔ یہ لوگ فلم کے ذریعہ اپنا مذہب پھیلا رہے ہیں۔ ان کے ہر ڈرامے میں پوجا پاٹ ضرور ہوتا ہے۔ تا کہ کفر یہاں بھی پھیل جائے۔ صحیح کہا گیا ہے کہ فرعون کے گھر میں ہی موسیٰ کا جنم ہوتا ہے۔ یہ پوری پوری پاکستانی تھی۔

"دیکھ عنبر زیادہ بیچ میں مت بولیو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

"اچھا آپ سے بھی کوئی برا ہے؟ مجھے نہیں پتا۔ اللہ قسم نہیں پتا۔" عنبر نے معصومیت بھرے لہجے میں کہا۔

"دیکھ دیکھ میں مار بیٹھوں گی۔" خالہ نے دھپ جما کر کہا۔

"ہاں خالہ آپ کسی علاقے کا بتا رہی تھیں۔" فہمیدہ نے باتوں کا رخ بدلنے کے لیے ان کی باتوں کا ٹوٹا ہوا جملہ دوبارا سے جوڑ دیا۔

"ہاں بھئی علاقہ تو ہمارا تھا۔ کیا علاقہ تھا۔" خالہ نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

"کراچی سے زیادہ خوبصورت تھا؟ اے چلیں بھی۔ بکواس۔"

"اے ہئے۔۔بکواس تو تُو کر رہی ہے۔۔۔۔ یہ بھی کوئی علاقہ ہے' کیسے لوگ ہیں' کسی میں تمیز نہیں۔ نہ بڑے کا ادب نہ چھوٹے کا لحاظ۔ کیا کہوں کتنا دل جلتا ہے۔" خالہ نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"وہاں کے لوگ تو آسمان سے اترے ہوئے ہیں ناں۔" عنبر نے جل کر کہا۔

"چپ نہوست بیٹی' ہنہ آسمان سے اترے ہیں... ارے وہاں کے لوگ اخلاق کا مرقع ہوتے ہیں۔ ایک یہاں کے لوگ ہیں۔ آنکھوں کا پانی تک مر گیا ہے۔ ارے وہاں کے لوگ' محلے کا بھی کوئی بڑا دکھ جائے تو ایسے ادب سے پیش آئیں گے جیسے اپنا کوئی بزرگ آ گیا ہو۔ مجھے اب بھی یاد ہے سیتا رام بنیا گھر آتا تھا تو باہر دیوڑھی پر بیٹھتا۔ لاکھ کہو کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ بزرگ ہو مگر کبھی نہ بیٹھتا۔ ہمیشہ کہتا' نہیں میں نے اس گھر کا نمک کھایا ہے۔ آج اگر کاروبار پھل پھول رہا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم نوابوں کی برابری کرنے لگیں۔"

"تب تو آپ کی دیوڑھی پر صبح سے ہی قطار لگ جاتی ہوگی۔ لوگ دست بستہ کھڑے رہتے ہوں گے۔" عنبر نے پھر چوٹ کی۔

"چپ کل موہی.... اک یہاں کے لوگ ہیں کہ دو پیسا ہوتے ہی سر پر چڑھ کر ناچنا شروع کر دیتے ہیں۔ ارے علاقے بھر کے لوگ۔ کیا ہندو کیا مسلم سب عزت کرتے تھے۔ جس پھل کا موسم ہو اس کے ڈھیر لگا دیتے تھے۔ آم.... آم کے کیا کہنے ایسا ذائقہ...."

"خالہ آپ سے اتنی تعریف سن کر میرا بھی دل کرنے لگا ہے کہ میں بھی ایک نظر اس ملک کو دیکھ آؤں جہاں سے ہمارے والد نکالے گئے ہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

ان کی باتیں مجھے زہر لگ رہی تھیں مگر کیا کرتا کہ میں نے وہ ملک دیکھا نہیں تھا اس لیے بتا نہیں سکتا تھا کہ وہ صحیح کہہ رہی ہیں یا غلط۔ اسی وجہ سے بھی میرے دل میں اس ملک کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا تھا۔

باتیں ابھی اور چلتیں کہ امی نے آ کر کہا کہ اب شام بھی ڈھل رہی ہے چلو اب گھر چلتے ہیں۔

مجھے یہاں کا ماحول اچھا لگا تھا۔ دل لگ گیا تھا۔ مگر واپس تو آنا تھا۔ ہم سب واپس گھر آ گئے۔ گھر آ کر بھی مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں اب بھی وہیں ہوں۔ میری فطرت ایسی نہیں تھی اور نہ میں ایسی گری ہوئی ذہنیت کا تھا مگر یہ حقیقت تھی کہ وہ لڑکی مجھے اچھی لگی تھی۔ بہت بھولی بھولی اور معصوم مگر شوخی کا پیکر۔ ایسی لڑکیاں لندن میں کیا پورے انگلینڈ میں ڈھونڈے سے نہ ملیں۔ جو چیز عنقا ہو اس کی طلب زیادہ ہوتی ہے۔ ہر کمیاب شے ہی دل طلب کرتا ہے۔ اس کی معصومیت نے ہی مجھے اسیر کر لیا تھا مگر میری چاہت کا انداز وہ نہیں تھا جس میں کہیں بھی چھچھورپن کا شائبہ ہو۔ بس وہ مجھے اچھی لگی تھی۔ بالکل ویسے جیسے بہت سی کتابیں' بہت سی تاریخی عمارتیں یا اپنے وطن کی کوئی اہم چیز۔ بس وہ مجھے اچھی لگی تھی اور میں اس کے لیے اپنے دل میں جگہ پا رہا تھا۔

گھر آ کر بھی عنبر کا چہرہ نظروں سے محو نہ ہوا۔ میں لندن سے آیا تھا جہاں جذبات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی' مفاد ہی مدنظر رہتا ہے مگر میں خود کو اس کے خیالوں سے بچا نہیں پا رہا تھا۔ بالکل بے بس ہو چکا تھا۔ اس کے تصور سے خود کو آزاد نہیں کر سکا تھا۔ آنکھیں بند کرتا تو وہ چھم سے آ جاتی۔ جھلک دکھاتی' خیالوں میں لہراتی اور لہرا کر چلی جاتی۔ میں خیالوں میں اسے دلہن بناتا۔ دلہن بنا کر سامنے بٹھاتا' بڑے ارمانوں سے آہستہ آہستہ اس کا گھونگھٹ اٹھاتا۔ لیکن وہ گھونگھٹ کے پیچھے دکھائی نہیں دیتی۔ اس کا چہرہ اتنا روشن ہو جاتا کہ آنکھیں چندھیا جاتیں۔ میں جی بھر کر اسے دیکھ بھی نہ پاتا۔ دیکھنے کی حسرت دل میں رہ جاتی اور وہ غائب ہو جاتی۔

رات گئے تک یہی کھیل ہوتا رہا۔ بار بار نیند کے جھونکے آتے' سلانے کی کوشش کرتے اور وہ نیند اڑا کر چلی جاتی۔ بڑی مشکلوں سے نیند آئی تھی۔



صبح اٹھا تو کسلمندی کی یلغار تھی۔ جسم ٹوٹ رہا تھا مگر ایک آس تھی۔ ایک امید تھی کہ میں اس سے پھر ایک بار مل سکتا ہوں' اور میں اس سے ملنے کو بے چین ہو گیا۔ میں اس کے یہاں جاؤں' ابھی اسی بات پر غور کر رہا تھا کہ فہمیدہ نے دروازے پر دستک دے کر کہا "اب اٹھ بھی جائیں۔ پاکستان میں لوگ صبح سویرے اٹھنے کے عادی ہیں۔ ابو آفس جانے کی تیاری کر چکے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ جب سے آیا ہے آج پہلی بار ناشتے کے ٹیبل پر نظر نہیں آ رہا۔ جا کر پتا کرو کہ طبعت تو ٹھیک ہے۔ میں وہی دیکھنے آئی ہوں۔"

وہ عادت کے مطابق ریل گاڑی کی طرح چھک چھک بولتی چلی جا رہی تھی۔ میں اچھل کر بیڈ سے اترا اور بلند آواز میں بولا "ائے ہے یہ راشن پانی لے کر کیوں چڑھی آ رہی ہو، لو اٹھ گیا۔"

"اب فٹافٹ تیار ہو لیں۔ ابو انتظار کر رہے ہیں انہیں آفس بھی جانا ہے۔" کہہ کر وہ مڑ گئی۔ آندھی کی طرح آئی تھی اور طوفان کی طرح چلی گئی۔ میں سیدھے باتھ روم میں گھس گیا اور برش کر کے سیدھا ڈائننگ ٹیبل پر پہنچ گیا۔

ابو منتظر بیٹھے تھے۔ ناشتہ سامنے دھرا تھا۔ میں نے السلام وعلیکم کہا اور ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

"بیٹے طبعت تو ٹھیک ہے؟ آج اتنی دیر تک سوتے رہے؟" موم نے سلائس پر مکھن لگاتے ہوئے پوچھا۔

"بس موم! رات کچھ زیادہ دیر تک جاگتا رہا، نیند نہ آنے کی وجہ سے اٹھنے میں دیر ہوئی۔ سوسوری موم!" میں نے شرمندہ لہجے میں کہا۔

"بیٹے جلدی اٹھنا صحت کے لیے اچھا ہے۔ اس طرح فجر کی نماز بھی مل جاتی ہے۔ تم ظہر عصر مغرعشا تو باجماعت پڑھتے ہو مگر فجر چھوڑ دیتے ہو تاکید فجر کی زیادہ ہے۔" ابو نے مشفق لہجے میں سمجھایا۔

"ابو ایک بات کہوں؟" میں نے باتوں کا رخ بدلنے کے لیے کہا۔

"بولو!"

"اگر آپ اجازت دیں تو میں کار لے لوں' اس طرح آنے جانے میں بھی آسانی رہے گی۔"

"ایک کار تو گھر میں ہے' اگر تمہیں ضرورت ہے تو اس سے ہی کام چلا لیا کرو۔"

"ابو یہ بہت پرانی ہو چکی ہے۔ میں چاہ رہا تھا بالکل نئی لے لیں۔"

"مگر اس وقت میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

"آپ صرف اجازت دے دیں۔ میں موم اور فہمیدہ کو لے کر شوروم چلا جاتا ہوں۔ یہ جیسی پسند کریں گی میں لے لوں گا۔" میں نے سر جھکا کر کہا۔

"ارے واہ! داود بھائی آپ زیرو میٹر کار لیں گے؟ مزہ آ جائے گا۔ کب لے رہے ہیں۔" فہمیدہ نے چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔

"جب میری من موہنی بہن کہے گی۔" میں نے ہنس کر جواب دیا۔

"بس آپ جلدی سے لے لیں۔ مجھے خود اس کار سے وحشت ہوتی ہے۔ میری سہیلیاں مذاق اڑاتی ہیں۔"

"میں ابھی وکیل کو فون کرتا ہوں وہ ایک لاکھ پاؤنڈ میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دے گا۔ بس ابو میرا اکاؤنٹ کھلوا دیں۔"

"تمہارے نام پر فل الحال اکاؤنٹ کھلنا مشکل ہے۔ خصوصی اجازت لینی پڑے گی۔ ایسا کرو میرے اکاؤنٹ کو یوز کر لو۔"



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں یہ بھی صحیح ہے۔ آپ اپنا اکاؤنٹ نمبر دے دیجئے گا۔"

"اپنی موم سے مانگ لینا چیک بک انہی کے پاس ہوتی ہے۔" کہہ کر ابو دفتر چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی میں نے فہمیدہ سے پوچھا "اب بتاؤ تمہیں کیسی کار اچھی لگتی ہے۔ میں تمہاری پسند پر ہی لوں گا جو تمہارے استعمال میں رہے گی۔"

"میری ایک سہیلی ہے۔ اس کے پاپا نے جاپان سے ایک نئے ماڈل کی کار منگوائی ہے۔ مجھے تو بہت پسند آئی ہے۔ اگر لے سکتے ہیں تو وہی لیجئے گا۔" اس نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔

"اچھا... ایک کام کرو۔ اندر سے فون اٹھا لاؤ... میں لندن بات کر لوں۔"

وہ تیزی سے اندر گئی اور فون اٹھا لائی۔ اس دور میں آج کی طرح فوراً نمبر نہیں ملتے تھے۔ گھنٹوں کے بعد رابطہ ہوتا تھا۔ میں نے کوشش شروع کر دی۔ قسمت نے یاوری کی اور پہلی ہی کوشش کامیاب ٹھہری اور لائن مل گئی۔ فون مسٹر جوین الفارڈ کی سیکریٹری نے اٹھایا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا کہ مجھے وکیل صاحب سے بات کرنی ہے۔ فوراً بات کراؤ۔"

اس نے لائن ملا دی۔ دوسری طرف میرا وکیل تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "سر! مجھے ایک لاکھ پاؤنڈ کی ضرورت ہے۔ کیالارڈ کے اکاؤنٹ میں ہے؟"

"جی ہاں ہے۔ کتنا نکلوانا ہے؟"

"مجھے آج ہی بھیج دیں۔ میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیں۔ اس وقت میں پاکستان میں ہوں۔ اکاؤنٹ نمبر بتا رہا ہوں اسی اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرنا ہے۔"

"ہو جائے گا مگر بینک کے ذریعہ بھیجا تو کئی دن لگ جائیں گے۔ میں منی چینجر کے ذریعہ بھیج دوں گا آپ وہاں کے بینک کا نمبر اور آئی ڈی کارڈ کا نمبر بتا دیں۔"

میں نے ماؤتھ پیس پر ہتھیلی رکھ کر موم سے کہا کہ وہ ابو کا شناختی کارڈ اور چیک بک لے آئیں۔ موم سے پہلے فہمیدہ دوڑ گئی اور لمحوں میں شناختی کارڈ اور چیک بک لے آئی۔ میں نے شناختی کارڈ کا نمبر اور ابو کا اکاؤنٹ نمبر اسے لکھا دیا۔ نمبر لکھنے کے بعد وکیل نے کہا "مسٹر ڈیوڈ! اگر بینک سے ٹرانسفر کروں گا تو کافی دیر ہو جائے گی۔ کم سے کم ایک ہفتہ ایسا کرتا ہوں کسی منی چینجر سے بات کرتا ہوں پھر میں آپ کو اسی نمبر پر خبر کر دوں گا۔"

فہمیدہ کے چہرے پر جوش تھا۔ وہ بہت زیادہ خوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے کہا:

"داؤد بھائی اب میں کالج اسی کار میں جایا کروں گی۔ میری سہیلیاں دیکھ دیکھ کر جلا کریں گی۔"

"میری گڑیا! یہ کار میں تمہارے لیے ہی لے رہا ہوں۔ ابو کے پاس اپنی کار ہے، مجھے کبھی کبھی ہی ضرورت پڑے گی۔ اس کے لیے بھی میں تمہارا ہی محتاج رہوں گا۔ کیوں کہ مجھے ابھی تک یہاں کے علاقوں کی پہچان نہیں ہے۔ اگر یاد ہے تو صرف ایک ہی راستہ، یہاں سے ڈیفنس جانے والی سڑک۔" میں نے ہنس کر کہا۔

موم اندر چلی گئی تھیں۔ فہمیدہ کچھ قریب آ کر بولی "داؤد بھائی.... خیریت تو ہے؟ صرف ایک ہی راستہ کیوں یاد ہے؟..... کہیں وہ شیطان کی خالہ عنبر تو یاد نہیں رہ گئی۔" پھر بڑے زور کا اسے قہقہہ لگایا تھا۔

میں نے اس کے سر پر چپت لگا کر کہا "میں تو اسے تمہاری خالہ زاد سمجھ رہا تھا اور تم کہہ رہی ہو کہ وہ خالہ ہے؟ رشتہ الٹا کیسے؟"



میری بات سن کر اس نے قہقہہ لگایا پھر بولی "ارے ارے آپ نے مجھے شیطان قرار دے دیا۔"

"اور کیا... تم نے شیطانوں والی بات ہی کی ہے..... ویسے بڑے بھائی سے ایسی باتیں نہیں کرتے۔"

"یہ لو..... میں تو جلد سے جلد اس گھر میں بھابی لانے کا سوچ رہی ہوں اور آپ رخنہ ڈال رہے ہیں۔ اگر وہ اچھی لگی تو میں اسے بھی بھابی بنا سکتی ہوں۔"

اس کی اس بات نے میرے اندر میٹھی سی چبھن پیدا کر دی تھی۔ بھلے ہی میں نے انگریزوں کے ماحول میں پرورش پائی ہے لیکن خدا کے فضل سے اپنے اندر کے مشرقی لڑکے کو مار نہیں سکا ہوں۔ امی نے جو تربیت دی ہے اس کے مطابق ہی زندگی گزار رہا ہوں۔ خود کو اسی ماحول کا فرد سمجھتا ہوں اور خود کو مشرقی ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ عنبر مجھے اچھی لگی تھی۔ اب تک میں لڑکیوں سے دور بھاگتا رہا تھا جب کہ اب میرا بھی دل کرنے لگا تھا کہ میں بھی میٹھی میٹھی محبت میں پور پور ڈوب جاؤں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کار لینے کے بعد ایک بار اسے سیر کرانے ضرور لے جاؤں گا۔

"اچھا یہ بتائیں رقم کب تک آ جائے گی؟ یعنی کب تک آپ کار لے لیں گے؟"

فہمیدہ کی بات پر میں نے مسکرا کر کہا "ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو اس نے کہا ہے کہ وہ جلدی کے لیے منی چینجر کے ذریعہ رقم بھیجے گا۔"

"یعنی اسی ہفتے میں رقم آ جائے گی؟"

"اس ہفتے نہیں کل تک رقم پہنچ جائے گی۔"

"اچھا یہ تو بہت اچھی بات ہے یعنی پرسوں کار ہمارے دروازے پر ہو گی۔"

"بالکل... اب ایسا کرو کہ تیار ہو جاؤ ہم شوروم چلیں گے تاکہ تم کار پسند کر لو۔"

"سچ... امی سن رہی ہیں۔ ہم کار پسند کرنے چل رہے ہیں۔ آپ چلیں گی؟" اس نے آواز لگائی۔

اس کے جوش و خروش کو دیکھ کر میں خوشی سے نہال ہو رہا تھا۔ اس کی آواز پر موم بھی آ گئیں۔ میں نے ان کو بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ کچھ ہی دیر میں وہ دونوں تیار ہو کر آ گئیں۔ ان کے ساتھ میں بھی باہر نکل آیا۔ سڑک پر پہنچ کر میں نے پوچھا "یہ کاریں ملتی کہاں ہیں؟"

"طارق روڈ۔" فہمیدہ نے جواب دیا۔ میں نے ٹیکسی روک کر اس سے طارق روڈ جانے کا پوچھا۔ ابتدا میں حیرت ہوئی تھی کہ یہاں ٹیکسی ڈرائیور کی مرضی سے چلتی ہے۔ انگلینڈ میں پسنجر کی خواہش پر۔ خیر، وہ راضی ہو گیا تو ہم بیٹھ گئے، راستے میں موم نے پوچھا "جا تو رہے ہو مگر رقم تو ابھی تک آئی نہیں ہے۔"

"کل تک آ جائے گی۔ پھر ابھی تو پیڈ کرنا نہیں ہے۔ جب ڈیلیوری لیں گے تب پوری پیمنٹ کریں گے۔ اس وقت تو صرف ٹوکن منی دینا ہے جو میں بہ آسانی دے سکتا ہوں۔" میں نے مسکرا کر بتایا "ایک لاکھ کے تو ٹریولرز چیک پڑے ہیں۔ کچھ کیش بھی ہے۔"

"بس بس یہیں روک دو۔" فہمیدہ اچانک چیختے ہوئے بولی تھی۔

ڈرائیور نے ٹیکسی روک دی۔

ہم نیچے اترے۔ میں نے کرایہ دے کر فہمیدہ سے پوچھا "شوروم کدھر ہے؟"



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ جو سامنے گاڑیاں کھڑی ہیں۔" اس نے اشارے سے بتایا۔

مجھے حیرت ہو رہی تھی کیونکہ دکانیں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں۔ مگر ان کے سامنے روڈ پر بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں نے ایک کے بعد ایک کئی شوروم کو دیکھ لیا مگر اشنگر اکہیں دکھائی نہیں دی۔ مجھے مایوسی ہو رہی تھی۔ فہمیدہ کا بھی یہی کہنا تھا کہ کسی دوسرے ماڈل پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ موم کا بھی یہی خیال تھا کہ ایک دکان میں وائٹ کلر کی اشنگر انظر آ گئی۔ فہمیدہ بھی اسی کلر کا کہہ رہی تھی۔ صرف دو دن قبل وہ پاکستان لائی گئی تھی۔ شوروم کے مالک نے کہا کہ وہ ایک دن میں کاغذات تیار کرا دے گا۔ میں نے معاملات طے کر کے ایڈوانس میں رقم دے دیئے۔

اس وقت فہمیدہ کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ کھلی پڑ رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا "یہاں شاپنگ کے لیے نزدیکی جگہ کون سی ہے؟"

"کچھ لیں گے کیا؟" اس نے پوچھا۔

"یہی سمجھ لو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"برابر میں ہی شاپنگ ایریا ہے۔" کہہ کر اس نے قدم آگے بڑھا دیئے۔

میں اس کے ساتھ گلیوں گلیوں ہوتا ہوا جس سڑک پر پہنچا وہ دکانوں سے بھری ہوئی تھی۔ یہاں کی دو کانیں مجھے بھی پسند آئیں۔ میں نے فہمیدہ سے کہا کہ وہ اپنی مرضی سے جتنا چاہے خریداری کر سکتی ہے۔

اسے تو گویا اجازت کی ضرورت تھی اس نے اتنی خریداری کر لی جیسے اسے پھر موقعہ نہیں ملے گا۔ ایک کے بعد ایک چیزیں پسند کرتی گئی اور میں بل دیتا گیا۔ جلد ہی وہ وقت آ گیا کہ شاپر تھامنے کے لیے ہاتھوں میں جگہ نہیں رہی مگر اس کی خواہش ختم نہ ہو کر دی۔ بالآخر موم کو مداخلت کرنا پڑی۔ وہ بول اٹھیں "کیا آج کے بعد بازار نہیں آنا ہے جو اس طرح اتاولی ہو رہی ہو۔"

ماں کی جھڑکی پر وہ واپسی کے لیے راضی ہوئی۔ ہم سب لدے پھندے گھر پہنچے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی موم نے کہا "اف اس لڑکی نے تو آج حد ہی کر دی۔ اتنی خریداری۔"

"نہیں موم آج میں اتنا خوش ہوں کہ بتا نہیں سکتا۔ میری برسوں کی آرزو پوری ہوئی ہے۔" میں جلدی سے بولا۔

"روپے لٹانے کی آرزو؟" فہمیدہ جو شاپرز چیک کر رہی تھی ہنستے ہوئے بولی۔

"نہیں میری گڑیا لندن میں جب کسی بھائی کو اپنی بہن کے ساتھ خریداری کرتے دیکھتا تھا تو میرا دل کچوٹ کر رہ جاتا تھا کہ کاش میری بھی بہن ہوتی۔ وہ خواہش آج پوری ہوئی ہے۔" میرے لہجے میں چھپے درد کو وہ بھی بھانپ گئیں اور خاموش ہو گئیں۔

فہمیدہ کو خوش دیکھ کر میں خوش تھا۔ حالانکہ جتنے کی اس نے خریداری کی تھی وہ بہت زیادہ تھی۔ اس زمانے میں بیس ہزار روپے کم نہیں تھے۔ اس نے اتنے کی خریداری کی تھی۔

شام میں جب ابو آئے تو وہ خوشی سے سرشار ایک ایک چیز انہیں دکھائی جاتی اور قیمت بتائی جاتی۔ ابو بھی مسکرا رہے تھے۔ میں نے اسے رطب اللسان دیکھ کر باتوں کا رخ موڑ دیا۔ ابو کو مخاطب کر کے کہا "ابو! کل آپ تیار رہیئے گا۔ بینک جا کر رقم لانی ہے۔"

"مجھے دفتر میں فون کر دینا میں آدھے دن کی چھوٹی کر لوں گا۔" کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔



## ہم خاک نشیں شفا کا ذریعہ ہیں

جڑی بوٹیوں کے ذریعے امراض کے علاج کے مختلف طریقے صدیوں سے مختلف خطوں میں استعمال ہو رہے ہیں۔ ان میں ایک طب یونانی ہے جو ہمارے خطے میں صدیوں سے رائج ہے۔ اس طریقہء علاج میں جڑی بوٹیوں کا کردار بہت اہم ہے جن میں سے اکثر کو کوٹ پیس اور چھان کر مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔ کراچی میں واقع جوڑیا بازار میں پھول چوک کے ساتھ موجود ایک گلی میں سات آٹھ دوا خانے موجود ہیں جہاں تیار یونانی ادویہ اور ان کی تیاری میں استعمال ہونے والی جڑی بوٹیاں ملتی ہیں۔ پہلے یہاں بعض حکیم بھی بیٹھتے اور مریضوں کا علاج کرتے تھے۔ اب یہاں زیادہ تر افراد کسی سے حاصل کردہ یا کسی حکیم کے تحریر کردہ نسخے لے کر آتے اور جڑی بوٹیاں خریدتے ہیں۔ ان میں سے بعض دواخانوں کے باہر ہاون دستے کے ساتھ زمین پر بیٹھے ہوئے بعض افراد نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ جڑی بوٹیاں کوٹنے اور چھاننے کا کام کرتے ہیں۔ پہلے یہاں یہ کام کرنے والوں کی تعداد چھ تھی لیکن اب چار رہ گئے ہیں۔

اگلے دن میں ناشتے کے ٹیبل پر بیٹھا فہمیدہ اور موم سے باتیں کر رہا تھا۔ ابو ناشتے سے فارغ ہو کر جا چکے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ فہمیدہ نے ریسیور اٹھایا پھر میری طرف بڑھا کر بولی "آپ کا فون ہے۔"

میں نے ریسیور لے کر پوچھا "جی فرمائیں۔"

دوسری جانب سے بتایا گیا کہ میں منی چینجر سے بول رہا ہوں۔ آپ اپنا شناختی کارڈ لے کر دفتر آ جائیں۔"

"جی اچھا۔" کہہ کر میں نے لائین ڈسکنکٹ کی پھر ابو کو فون کیا کہ وہ تیار رہیں ہم ان کے آفس آ رہے ہیں۔

فہمیدہ تو گویا انتظار میں تھی اس نے شور مچا دیا کہ امی آپ بھی تیار ہو جائیں۔ ہم سب مل کر ابو کے آفس چلیں گے۔

موم اور فہمیدہ کو لے کر میں باہر آیا اور ٹیکسی لے کر پہلے ابو کے آفس پہنچا وہاں سے ان کو ساتھ لے کر منی چینجر کے پاس پہنچا۔ ان لوگوں نے شناختی کارڈ چیک کرنے کے بعد کہا "اتنی بڑی رقم آپ لے کیسے جائیں گے؟"

"آپ ایسا کریں کے پانچ لاکھ تو نقد دے دیں باقی اس اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیں۔" کہہ کر میں نے ابو کا اکاؤنٹ نمبر دوبارہ بتا دیا۔ اس نے لندن سے آئے فیکس نمبر میں درج اکاؤنٹ نمبر سے نمبر ملایا اور پھر اس نے اپنے آدمی کو بھیج کر اسی وقت ڈرافٹ بنوا دیا۔ رقم لے کر ہم باہر آئے اور ابو کی کار میں سوار ہو کر طارق روڈ پہنچے۔ شوروم والا کاغذات وغیرہ تیار کرا کر انتظار کر رہا تھا۔ باقی کی پیمنٹ لے کر اس نے ضروری کاغذات اور چابی دے دی۔ اس بار میں نے ڈرائیونگ خود سنبھال لی۔ میرے برابر میں فہمیدہ آ گئی اور پیچھے موم بیٹھ گئیں۔ ابو اپنی کار میں جا بیٹھے۔ ہم سب وہاں سے کلفٹن پہنچے۔ کافی دیر وہاں کی سیر کی۔ پہلی بار کیمل کی سواری کی۔ گیلی ریت پر فہمیدہ کے ساتھ دوڑ لگائی۔ کافی سارا وقت گزارا پھر واپس گھر آ گئے۔ کھانا ہم نے باہر ہی کھایا تھا۔ وہ دن فہمیدہ کی خوشی کا دن تھا۔ گھر آ کر اس نے کم سے کم دس سہیلیوں کو فون کر کے بتایا کہ اس نے انگیجر الی ہے۔

اگلے دن جب فہمیدہ کے کالج جانے کا وقت ہوا تو اس نے کہا "بس اب اٹھ جایئے مجھے کالج پہنچانا آپ کا کام ہے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے ساتھ لے کر جب میں نکل رہا تھا تو موم سے کہا ''موم آپ فکر نہیں کریں گی۔ مجھے کچھ کام ہے۔ اس شیطان کی خالہ کو کالج چھوڑنے کے بعد میں ایک دو جگہ جاؤں گا۔ واپسی میں تین چار بجے اسے کالج سے لیتا ہوا آؤں گا۔

فہمیدہ کو کالج چھوڑنے کے میں نے سوچا کہ فاطمہ کی طرف جاؤں اس کا کارڈ اب تک جیب میں پڑا تھا مگر ارادہ بدل دیا اور کار کا رخ ڈیفنس کی طرف موڑ دیا۔

جس وقت میں خالہ کے گیٹ پر پہنچا اتفاق کی بات ہے کہ عنبر گھر سے باہر آ رہی تھی۔ میں نے اس کے نزدیک جا کر کار روک دی۔ اس نے چونک کر دیکھا اور مجھے دیکھ کر اس نے ہنستے ہوئے کہا ''یہ آج راستہ کیسے بھول پڑے۔''

وہ حسین تھی۔ مہ جبین تھی۔ اس کی ہر ادا میں ایک وقار تھا۔ میں نے لندن کی سڑکوں پر، ہوٹلوں میں، ریستورانوں میں، محفلوں میں، لڑکیوں کو نیم برہنہ ہی دیکھا۔ ایسے نظاروں کا عادی تھا مگر یہ گوہر نایاب جو سیپ میں بند ہوتے ہوئے بھی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ سرتاپا ڈھکی ہوئی تھی۔ صرف ہاتھ اور چہرہ کھلا ہوا تھا۔ لوگ کہتے ہیں، انگلی پکڑو تو پہنچی تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسکارف سے ڈھکے ہوئے سر اور بڑے سے دوپٹے میں چھپا جسم میرے دل میں ہلچل مچا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا ''بس ادھر سے گزر رہا تھا کہ تم نظر آ گئیں۔ کہاں کا ارادہ ہے؟''

''ایک دوست کے یہاں جانا ہے، گزری تک۔'' اس کی نظریں اٹھیں، میری نظروں سے ٹکرائیں اور جھک گئیں۔ ان شرگیں آنکھوں میں میرے لیے ناپسندیدگی نہیں تھی۔ اس لیے میں نے اپنا رخ ادھر سے موڑا نہیں۔ اپنایت سے بولا ''اگر کہو تو چھوڑ دوں۔''

''مجھے تو اعتراض نہیں ہے مگر دروازے تک آ کر گھر میں نہ جانا کیا اچھی بات ہوگی؟''

''پھر کسی دن آج یوں بھی کچھ کام ہے۔'' میں نے بہانا بنایا اور اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔

وہ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ مجھے کھلے ہوئے پھول کی طرح لگی تھی۔ اور میں بھونرا بن جانے کو بے تاب ہوا اٹھا تھا۔ اسے ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لینے کو دل کہنے لگا تھا۔ اسی وقت میں نے سوچ لیا کہ ابو سے کہوں گا۔ یقیناً انہیں بھی میرا خیال پسند آئے گا۔ اس طرح میرا رشتہ پاکستان سے مزید مضبوط ہو جائے گا۔ بلکہ پختہ ہو جائے گا۔ ابھی میں اسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا کہ وہ بولی ''کار کس کی لے آئے؟''

''آج ہی لی ہے، ابو کی کار لینا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ انہیں بھی تو ضرورت پڑتی رہتی ہے اس لیے یہ خرید لی۔ جب تک پاکستان میں رہوں گا استعمال کروں گا پھر یہ فہمیدہ کے کام آئے گی۔'' میں نے کہا۔ وہ عنبر جو اس دن پٹر پٹر بول رہی تھی وہ نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ اسے چپ چپ دیکھ کر مجھے اچھا بھی لگ رہا تھا اور کھل بھی رہا تھا کہ میں اسے اسی روپ میں دیکھنا چاہتا تھا بولتی ہوئی مینا کی طرح۔ اس لیے میں بول اٹھا ''اس طرح خاموش رہو گی تو.....''

''تو کیا میں یہاں بھی خالہ کو کھینچ لاؤں، وہ سامنے رہتی ہیں تو انہیں چھیڑنے کو دل آپ ہی آپ کرتا ہے۔'' کہہ کر وہ کھلکھلا اٹھی۔

''مجھے یہاں کے علاقوں کی پہچان نہیں ہے اس لیے راستہ بتاتی رہیں گی ورنہ کہیں کا کہیں پہنچ جاؤں گا۔''



''بس سیدھے چلتے رہیں۔'' اس نے اتنا کہہ کر پوچھا ''تو کیا واقعی آپ واپس چلے جائیں گے؟''

''میری پیشنٹلی برتش ہے۔ میں یہاں زیادہ دن رک بھی تو نہیں سکتا۔'' میرے لہجے میں مایوسی کا عنصر در آیا تھا۔

''کوئی روکے تو بھی نہیں؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''تب سوچنا پڑے گا۔ یہ دیکھنا پڑے گا کہ روکنے والی شخصیت کس وجہ سے روک رہی ہے۔ اور اس کا ارادہ کیا ہے؟'' میں نے اس کے چہرے پر ایک پھر پور نظر ڈالی اور ہنستے ہوئے بولا۔

''ارے ارے! سامنے دیکھیں ورنہ روکنے کا ابھی انتظام خود ہو جائے گا۔ کسی کی کار آپ کی کار سے ٹکرائے گی یا آپ کی کار اس کے ساتھ اٹکھیلیاں کرنے کے لیے بڑھ جائے گی..... رہا سوال روکنے کا تو میں بس اتنا کہوں گی کہ روکنے والے کا ارادہ نیک ہی ہوگا بھی تو وہ روکنا چاہے گا۔''

میں نے دیکھ لیا تھا کہ یہ جملہ ادا کرتے ہوئے عجیب سا حجاب اس کے چہرے سے چھلک اٹھا تھا۔ یہ انداز مجھے کچھ زیادہ ہی پسند آیا تھا۔ لندن کی لڑکیوں میں خصوصاً برصغیر کی لڑکیوں میں بھی اب یہ انداز حیا پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ بلکہ ہو چکا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اب تک میں نے کسی لڑکی میں دلچسپی نہیں لی۔ یا پھر اس لیے دلچسپی نہیں لی کہ اب تک لڑکی کا ایک ہی تصور میرے ذہن میں تھا۔ ایک ہی چاہت تھی کہ میری بھی کوئی بہن ہو۔ اور یہ آرزو اب مٹ گئی تھی۔ پھر پہلے جیب خالی ہوا کرتی تھی مگر اب نہیں۔ پیٹ میں روٹی ہو تب عشق کی سوجھتی ہے۔ اور وہ وقت آ گیا تھا اسی لیے میرے دل میں بھی عشق کا دیپ جگمگانے لگا تھا۔ میں نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے پوچھا ''اگر میں کہوں کہ میرے ساتھ کچھ دیر کے لیے کسی رسٹورینٹ میں بیٹھ جاؤ تو کیا تم میری پیشکش پر غور کرو گی۔''

''آپ بھی کیا یاد کریں گے کسی سخی دل سے پالا پڑا تھا۔ اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو میں تیار ہوں۔'' اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

سامنے ہی ایک اچھے ریسٹورنٹ کا بورڈ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کے سامنے کار روک دی اور پھر نیچے اتر گیا۔ اس کی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا ''زہے نصیب آپ نے میری دعوت قبول کی۔''

وہ نیچے اتری اور مسکراتے ہوئے بولی ''آپ باتیں بھی بہت خوبصورت کرتے ہیں، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ آپ یہاں آنے سے قبل صداکاری کرتے رہے ہیں۔ ویسے شاعری وغیرہ سے بھی شغف ہے کیا؟''

''ابھی تو میری اردو بھی صحیح نہیں۔ شاعری کیا خاک سمجھوں گا۔'' میں نے ہنس کر کہا اور اندر داخل ہونے کے لیے ہوٹل کے دروازے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

وہ بھی میرے ساتھ تھی۔ مجھے اس کا یوں ساتھ چلنا اچھا لگ رہا تھا۔ ہم دونوں ڈائننگ روم میں آئے اور ایک خالی ٹیبل پر بیٹھ گئے۔

بیرے کو آرڈر نوٹ کرانے کے بعد میں نے پوچھا ''ایک بات بتاؤ گی؟''

''جی فرمائیں؟'' اس نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھئی ہم ٹھہرے لندن والے۔ مغربی معاشرے کے پروردہ، اسی لیے یہ پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے رک کر اس کے چہرے کا جائزہ لیا پھر دھیمی آواز میں بولا ''اگر میں یہ کہوں کہ آپ مجھے اچھی لگی ہیں تو؟''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے ہونٹوں پر پیاری سی شرمیلی سی مسکراہٹ کھیل گئی مگر فوراً ہی وہ اپنے پرانے انداز پر لوٹ آئی شوخ لہجے میں بولی۔ ”ملاقات کو ابھی دو دو چار دن ہوئے اور اظہار عشق بھی کر بیٹھے۔“

مجھے ایسا لگا جیسے میں چور ہوں۔ خود میں سکڑ گیا۔ عجیب سی پشیمانی ہوئی کہ خواہ مخواہ اظہار کر بیٹھا۔ شاید میرے چہرے پر دل کی کیفیت ابھر آئی تھی۔ اس کی نگاہوں نے بھانپ لیا کہ میں شرمندہ ہوں۔ وہ جلدی سے بولی ”ارے آپ تو شرمانے لگے؟“ پھر اس نے ہلکے سے قہقہہ لگایا اور بولی ”میں تو آپ کو چھیڑ رہی تھی۔“

”تو... تو گویا آپ کو برا نہیں لگا؟“

”ضرور برا لگا ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”اچھا... تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔“

”پہلے یہ تو پوچھئے کیا برا لگا ہے۔“

”برائیوں لگا ہے کہ آپ نے اظہار کرنے میں اتنی دیر لگا دی۔ لندن کے ہوتے ہوئے بھی پاکستان کو نہیں چھوڑ گئے۔ میں نے تو آپ کو دیکھتے ہی پسند کر لیا تھا۔ یقین کریں، میں جیسے ساتھی کی تمنا کرتی ہوں، آپ بالکل ویسے ہی ہیں۔“ کہہ کر اس نے نظریں جھکا لی۔

”واہ گویا دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔“

”جی ہاں اور اس کا اظہار میں نے فہمیدہ سے بھی کر دیا ہے۔“

”تبھی فہمیدہ بار بار مجھے آپ کا نام لے کر چھیڑ رہی تھی۔“

”ہاں اس سے میں کوئی بات نہیں چھپاتی، یہ بات بھی اسی وقت بتا دی تھی کہ آپ مجھے بہت پسند آئے ہیں۔“

”گویا کہ میرے راستے میں اب آسانیاں ہی آسانیاں ہیں۔“

”جی نہیں، یہ پاکستان ہے، یہاں پر پریشانیاں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ دعا ہے کہ کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو اور میں ..... جائیے میں نہیں بتاتی.... آپ خود سمجھ لیں۔“ کہہ کر اس نے سر جھکا لیا۔ اس کے چہرے پر پہلی بار حیا کی لالی اس قدر گھر آئی تھی۔ میں بھی مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔

بیرے کو بل لانے کا اشارہ کیا اور پلیٹ میں بچی چیزوں پر نظر دوڑاتا ہوا میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہو جائے گا۔ پاکستان کی لڑکیاں اتنا آگے بڑھ چکی ہیں۔

اسے گھر چھوڑ کر میں واپس کالج کی طرف چل پڑا، فہمیدہ کو بھی لینا تھا۔ ڈھیر سارا وقت تیزی سے گزر گیا تھا۔ کراچی کی بے ہنگم ٹریفک میں کار چلانا آسان نہیں ہے پھر بھی میں اندازے سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہاں پہنچا تو ابھی چھٹی ہوئی نہیں تھی۔ دیگر لوگوں کی طرح میں بھی کار پارک کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد فہمیدہ ہنستی کھلکھلاتی اپنی سہیلیوں کے ساتھ باہر آئی۔ اس نے کار پہچان لی تھی۔ سیدھی ادھر ہی آئی۔ اس کے ساتھ جو لڑکیاں تھیں۔ وہ سب اس کار کی تعریف کرنے لگیں۔ تبھی فہمیدہ بولی ”کار کی اتنی تعریف کر لی میرے بھیا کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔“

ایک لڑکی نے مجھے غور سے دیکھا پھر ایک انداز سے بولی ”واقعی تمہارے بھیا تو اپنا تعارف خود ہی پرسنالٹی ہے۔“



اس کے انداز پر میں دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ تبھی اس کے برابر کھڑی لڑکی نے کہا ”اے یاسمین! آہستہ بول اگر مجتبیٰ نے سن لیا نا تو اپنا سر اپنے ہاتھوں سے پھوڑ لے گا۔“

اس کی بات پر سب کا مشترکہ قہقہہ گونج اٹھا۔ مجھے ہر قدم پر احساس ہو رہا تھا کہ پاکستان کا ماحول وہ نہیں رہا جو میرے تصور میں تھا۔ وہ کتابی باتیں کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ لڑکیاں بے لگام گھوڑے کی طرح ہو چکی ہیں۔ وہ حیا آلود ماحول کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ کمنٹ تو ایسے کر رہی تھیں جیسے زبان پر رکھے جملے ہوں۔

یاسمین نامی اس لڑکی نے سہیلی کے جملے پر مڑ کر کہا ”کاش یہ پہلے ہی لندن سے آ جاتے تو مجتبیٰ کو لفٹ بھی نہ کراتی۔“

”اے ہے.....“ فہمیدہ بولی ”میرا بھائی اتنا سستا نہیں ہے، اب چل بیٹھ تم سب کو ٹریٹ بھی دینی ہے۔“ کہہ کر وہ میرے برابر والی سیٹ پر آ گئی۔ ایک اور لڑکی اس کے برابر بیٹھ گئی۔ پچھلی سیٹ پر پانچ لڑکیاں ٹھس ٹھسا کر بیٹھنے میں کامیاب ہو گئیں۔ میں نے اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے پوچھا ”ہاں بھئی... کہاں لے چلوں۔“

”چاند کے پار چلو، ہم ہیں تیار چلو۔“ پچھلی سیٹ سے کسی نے دبی دبی آواز میں گنگنایا۔

”کے ایف سی کی بڑی تعریفیں ہو رہی ہیں۔ اسی نئے رسٹورینٹ میں چلتے ہیں۔“ فہمیدہ نے کہا۔

”مجھے راستہ بتاتی رہنا۔“ کہہ کر میں نے کار آگے بڑھا دی۔

کچھ ہی دیر میں مجھے احساس ہو گیا کہ یہ لڑکیاں نہیں، شیطان کی خالائیں ہیں۔ ایسے ایسے جملے پھینکتی کہ میں چپ رہ جاتا۔ جواب نہ سوجھتا۔ بالآخر کے ایف سی آ گیا۔ میں نے نیچے اتر کر دروازہ کھولا اور ان سب کو ساتھ لے کر اندر پہنچا۔ پھر کہا ”آپ سب اپنی پسند کے مطابق آرڈر دیں۔ بل میری طرف سے ہے۔“

”آپ بے فکر رہیں، ہم بل دینے والے بھی نہیں ہیں۔“ ایک لڑکی نے جواب دیا۔

میں مسکرا کر رہ گیا۔ بیرے نے سب کا آرڈر نوٹ کیا۔ تبھی فوزیہ نے کہا ”بھائی جان... فہمیدہ کے۔ کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ لندن میں شغل کیا ہے؟“

”جی میں نے آرکیٹکٹ کا کورس کیا ہے۔ کچھ دن آرام کا خیال تھا اس لیے پاکستان لوٹ آیا۔ کچھ دن یہاں آرام کروں گا پھر واپس۔“ میں نے جواب دیا۔ میری بات پر ایک ساتھ سب نے قہقہہ لگایا جیسے میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔

”بھئی میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا۔“ فوزیہ نے مسکرا کر سہیلیوں کی طرف دیکھا پھر میری طرف چہرہ موڑ کر بولی ”یہ پاکستان ہے اور وہ انگلستان۔ دونوں کے معاشرے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہاں زندگی کو زندگی کی طرح انجوائے کیا جاتا ہے۔ اس لیے پوچھنا چاہتی تھی بلکہ گستاخی کر رہی تھی کہ.....“ وہ بولتے بولتے رک گئی۔

اسے رکتے دیکھ میں نے پوچھا ”جی آپ کچھ کہہ رہی تھیں؟“

”محترم بھائی جان، فہمیدہ کے..... میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کیا آپ واقعی اتنے معصوم ہیں یا بن رہے ہیں؟ لندن سے آنے والا اتنا سیدھا تو ہوتا نہیں؟“

آگے کا احوال جاننے کے لیے آئندہ ماہ شمارہ اپریل ملاحظہ کریں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

## سلسلے وار پراسرار کہانی — اس کہانی کو آپ کبھی نہیں بھولیں گے

حنیف سحر

# گھائل آتما

احسن سلیم کا خیال

بے کار ہے غم، دشت میں اچھا ہوں اکیلا
کیا کم ہے مجھے تو بھی تصور میں یہیں ہے

**اسرار کی دنیا سے کشید کیا گیا دلچسپ اور عجیب سلسلہ، آخری قسط**

## خلاصہ

2,500 سال کا سفر سرمد نے صرف ایک رات میں کیا اور رجنی کی سسکیوں سے وہ مزار کے فرش پر ہڑبڑا اٹھا۔ حیرت اور خوف سے اس کی آنکھوں میں عجیب وحشت کے سے رنگ سمٹ آئے تھے اور ان گنت سوالات اس کے ذہن کے گنبد میں گونج رہے تھے۔ کنال، رجنی ایک دوسرے کا اور دونوں اس سنسار میں جیسے بچھڑ گئے۔ بے رحم کشتا نے یونانیوں کے ساتھ مل کر جو گھناؤنی سازش کی اس کے مطابق کنال گرفتار ہوا۔ مترشتک دھوکے سے مارا گیا۔ کنال کی خوبصورت آنکھیں نکال کر اسے زندہ چھوڑ دیا گیا اور یہ تو رجنی بھی نہیں جانتی تھی سو بتا نہ پائی کہ اس کے کنال کو بیدیوں نے سولی پر کھینچ لیا یا وہ اندھیرے نینوں سے دربدر اپنی پریمیکا کو ڈھونڈا کیا اور پھر جانے کس بے سروسامانی میں سے نے اس کی چلتی سانسوں کو گھونٹ کر اس کی آتما کو آزاد کر دیا۔ رجنی کی طرح کنال کی آتما بھی سنسار میں بھٹک رہی ہے مگر رجنی کا ایمان ہے کہ جس طرح وہ جنم جنم سے ایک شریر سے دوسرے شریر میں اترتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہے ویسے ہی کنال بھی شریر بدلتا رہا ہے مگر وہ دونوں مختلف ادوار میں روپ بدل بدل کر پریم کہانیوں کے کرداروں میں سامنے آتے رہے مگر دنیا نے سلیم اور انارکلی لیلیٰ اور مجنوں شیریں اور فرہاد رومیو اور جیولیٹ سسی اور پنوں ہیر رانجھا کو کبھی ایک نہ ہونے دیا تو یہ رجنی اور کنال کی ہی گھائل آتمائیں تھیں جو دنیا میں بھیس بدل بدل کر آتی رہیں۔ پھر جانے سنسار کے مالک نے اپنی اچھا سے دنیا کے ان سب ظالموں کو کھلی چھوٹ دے دی جو ہمیشہ سے پریم کے دیوانوں کے دشمن تھے اور شاید پریم کے کارن تخلیق ہوئی ان روحوں کو شریر میں اترنے سے روک دیا گیا۔ دنیا سچے پریم سے نچنت ہو گئی اور اب صرف ان پریمیوں کی داستانیں قصے کہانیوں میں ڈھل کر محض مثالیں بن گئیں۔

نئے عہد کا بدنصیب انسان یہ تو جانتا ہے کہ سچا پریم ہوتا ہے مگر وہ سچا پریم کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا اور اس سے بڑی بدقسمتی انسان کی کوئی اور ہو نہیں سکتی کہ نئے لوگ ان عظیم پریم داستانوں کے کرداروں کا ذکر استہزا سے کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زمانہ ایسے جنون اور سچائی کا متحمل نہیں ہو سکتا سو جھوٹ اور جسم کے اندر دہکتے الاؤ اتنے زوروں سے دند مچائے ہوئے ہیں کہ حصول بس مایا ہے اور جسم کے اندر کی آگ ہوس کی سے بجھتی ہے اور پریم کی سانسیں پوری ہو جاتی ہیں۔ اب کوئی ہیر ہے نہ رانجھا یوں رجنی کی گھائل آتما اپنے کنال کے انتظار میں بھٹکتی رہی ہے اور ابھی کچھ برس ادھر کوئی پچاس سال پہلے رجنی کو یہ احساس ہوا کہ اس کے کنال نے پھر شریر دھارن کیا ہے۔ اس کی آتما میں کھلبلی مچ گئی وہ جلد سے جلد اپنے کنال تک پہنچنے کو بے قرار ہوئی کہ یہی قدرت کی منشا تھی مگر خود رجنی کو شریر اوڑھنے کا آدیش ملا نہ اختیار اور یوں وہ اپنی سب شکتیوں کو گنوا کر اس سے امید کے ساگر میں نئے ارمان سے کچے گھڑے کے ساتھ اتری کہ ضرور وہ اپنے کنال تک پہنچ جائے گی خود اس کے لیے بھی یہ کسی خوشگوار اچنبھے سے کم بات نہ تھی کہ وہ سرمد کو نظر آئی موہوم سی امید ایک طاقت ور جذبے کی شکل اختیار کر گئی۔ وہ خود جاننا چاہتی تھی کہ ڈھیروں ڈھیر انسانوں میں سرمد ہی کیوں وہ انسان ہے جسے وہ دکھائی دی؟ یوں سرمد کے شریر میں حلول کرنا قدرت کی اچھا تھی مگر یہ ناٹک کا بس ایک پنا تھا کیونکہ سرمد کے جسم میں حلول کرنے سے بھی وہ اپنی منزل کو پا لینے میں کامیاب نہ ہو گی بس اتنا جان پائی کہ سرمد کی روح ہی دراصل کرن کی آتما ہے جس نے پہلے بھی اسے یعنی رجنی کو کنال سے ملایا تھا مگر یہ ضروری نہیں کہ اتہاس ہمیشہ خود کو دہرائے سو سرمد کو بڑی عجیب عجیب مشکلوں نے گھیر لیا اور رجنی پھر نراش ہو گئی تب بابا نور علی شاہؒ کے مزار کے قرب میں رجنی نے سرمد کو اپنی بپتا کہہ سنائی جو صرف ایک رات کا قصہ بن کے ہی تمت بالخیر ہوئی۔ سرمد سوالوں کے جنگل میں مدتوں سے بھٹک رہا تھا۔ اس پوری کہانی کو سن کر اس کے دل و دماغ میں جیسے غدر مچ گیا۔ بابا نوری شاہؒ نے اس کے بہت سے سوالوں کے جواب دیئے پھر بھی وہ پوری طرح مطمئن نہ ہو سکا۔ مزار سے نکل کر وہ گھر تک آیا تو وہاں عمران کا دوست اظفر پہلے سے اسے انتظار کرتا ہوا ملا۔ عمران کی آلودہ دوستی کا یہ کردار اس کی اور بڑھنے والے ہر انسان کو اپنے اور عمران کے بیچ کی دیوار تصور کرتا تھا لہٰذا سرمد میں عمران کی بڑھتی ہوئی دلچسپی دیکھ کر وہ سرمد کا دشمن بھی ہو گیا حالانکہ سرمد کو عمران سے کوئی خاص علاقہ نہ تھا سوائے اس کے کہ عمران ایک ماڈل اور اداکار تھا اور سرمد موجودہ عہد کا صحافی یعنی پتر کار تھا تاہم سرمد کے لیے یہ جاننا بھی جستجو کا کوئی نہ کوئی انت تو تھا کہ آخر عمران کو رجنی کی آواز اور اس کا لہریا کیونکر نظر آیا؟ ساری کہانی کو پھر سے بیان کرنے کی وجہ سے رجنی کے سامنے سے عمران کے اوپر پڑے دبیز پردے سرک گئے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور اس نے سرمد کو بتا دیا کہ عمران اس کہانی میں مترشنگ یعنی کنال کا سب سے قریبی دوست تھا جس نے کنال سے بے وفائی کی۔ اگر مترشنگ بے وفائی نہ کرتا تو شاید یہ کہانی اور دنیا کی تاریخ مختلف ہوتی۔ یہی وہ معاملہ ہے جو سرمد کے لیے بڑے غضب کی مصیبت بنا ہوا ہے کہ کیا دنیا کی تاریخ اسی طرح لکھی گئی تھی یا اسے انسانی اختیار کی کمزوریوں اور لوبھ نے اس طرح سے بنا دیا۔

**اب آپ آگے پڑھیں۔**

سرمد یہ جان کر بقول رجنی کے' وہ عمران کو اس لیے نظر آئی تھی کہ وہ اس کہانی میں مترشنگ تھا۔ سرمد کو ہلکا سا حیرت کا جھٹکا لگا' تاہم وہ سوچ میں ڈوب گیا اور اسے یہ جان کر عجیب سا اطمینان ہوا کہ عمران کی آتما کی بے چینی اسی کارن ہے۔ اس کہانی کے باقی کرداروں کو شاید کبھی سمے کے آخری حصے میں شانتی مل جائے مگر مترشنگ یعنی عمران کو یہ شانتی اس وقت تک نہیں ملے گی جب تک اس کی آتما کو قدرت نشچت ہونے کا موقع نہیں دے دیتی۔ سرمد نے سوچا اور قبل اس کے کہ وہ اپنا کوئی کام شروع کرتا یا کسلمندی سے لیٹ کر سوچوں کے گھوڑوں کو بگٹٹ دوڑنے دیتا کہ ایک نئی سوچ نے سر اٹھایا۔

''رجنی' اگر تمہیں کنال یا اس وقت دنیا میں اس کا جو بھی نام ہے' وہ تمہیں نہ ملا تو کیا تم پھر مکلی میں بھٹکتی رہو گی اور تمہاری کہانی کا انت؟''

''یہ تو میں نہیں جانتی کہ اب میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور میرا کنال کہاں ہے' کب ملے گا؟ جو یونہی انتظار میرا نصیب ہے تو وہی کرتی رہوں گی۔'' رجنی نے دکھ سے کہا۔

''اگر ایسا ہے تو پھر تم اس وقت اپنی کہانی مجھے سنانے کو کیوں آئیں؟ یہ سب بلاوجہ تھا اور اس کا کوئی مقصد نہ تھا؟'' سرمد کی الجھن بڑھنے لگی۔

''سمے کی ترتیب اور اس کا شمار پرش کے اختیار میں نہیں ہے۔ پرماتما کی سب تخلیقوں میں سب سے زیادہ سرکش تخلیق سمے ہی ہے۔ انسان سمے کے سامنے بے بس و مجبور ہے حالانکہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اگر انسان اشرف المخلوقات ہے تو کبھی نہ کبھی سمے کو قابو کر ہی لے گا۔ کائنات کی سب سے آخری کڑی یہی ہے جس پر انسان نے سب سے کم توجہ دی۔ وہ اپنے لیے مادی آسائشیں پیدا کرنے میں جٹا رہا' لوبھی جو ہے اور یہ بھول گیا کہ وہ سب تخلیقات سے بلند کیسے ہے؟ ہاتھیوں اور شیروں کو مطیع کر کے اس نے سمجھا کہ دنیا کی سب سے زور آور مخلوق یہی چیزیں تھیں اور انہیں زیر کر کے اس نے اشرف المخلوقات ہونے کا راز پا لیا ہے مگر یہ پورا علم نہیں ہے' پورا علم قدرت کے پاس ہے جو قادر ہے اور انسان سے کو بھول چکا تھا کہ سمے بھی تو مخلوق ہے پھر کیوں اب تک اس نے سمے پر قابو نہیں پایا؟ ابھی اس کی فتح مکمل نہیں ہوئی اور کائنات کا انت اس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک سمے کو تابع نہ کر لیا جائے۔ سمے ہی وہ مخلوق ہے جو انسان کو سب سے زیادہ چنوتی دیتی رہی ہے۔ وہ سب سے بڑی مخالف طاقت ہے جو انسان کی بہت سی آرزوؤں اور اچھاؤں کو تہہ تیغ اور تہس نہس کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو انسان سمے کو شکست دے لے تو یہ سارا قصہ مکت ہو سکتا ہے۔ تم بھی سمے کے ہاتھوں ہی مضطرب ہو۔ میں سمے کو شکست نہیں دے سکی کہ اس کی پہنائی ہوئی بیڑیاں اب بھی میرے پیروں میں ہیں مگر میں نے سمے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے للکارا ہے۔ میرے کنال نے بھی ایسا ہی کیا' لوبھی دینا یہ راز ابھی نہیں جان سکی مگر انسان کی منزل یہی ہے۔ تمہیں یہ کہانی سنانے کا مطلب اور مقصد یہی تھا کہ غافل انسان کو سمے کی سنائی اور دکھائی نہ دینے والی چنوتی سے آگاہی دی جائے۔ یہ صرف خاص لوگوں کا وصف ہے' وہی خاص



لوگ جن کی روحیں نبیوں اور صوفیوں کے پراہن میں اترتی ہیں' وہی لوگ تھے جو سمے کو شکست دینے لائق ہوئے۔ انہوں نے انسانی حیات کے اجتماع کو یہ راز بتایا مگر لوبھی دنیا پھر بھول گئی۔ تم بھی اس بھیڑ میں شامل ہو جو گیانیوں کی بھیڑ ہے۔ تمہیں بھی اپنے آپ کو اشرف المخلوقات ثابت کرنا ہے کہ اسی کارن میں تمہیں یہ کہانی سنانے تمہارے شریر میں اتری اور یہی اس کہانی کا مقصد ہے۔ ڈھائی ہزار سال کے دن و رات کا نظارہ ایک ہی رات میں کر لینے کا مقصد یہ ہے کہ تمہیں سمے کی آگاہی سے بہرہ مند کیا جائے۔ قدرت تمہارے ہردے پر بھی دستک دے رہی ہے۔''

''اور تم.....؟'' سرمد اب بھی نئی کھوج سے زیادہ اس کہانی کے دلدوز منظر میں قید تھا۔

''میں ہی تو ہوں جو سمے کے رتھ پر سوار ہو کر تم تک پہنچی ہوں۔ اب اس رتھ کی باگیں تمہیں تھما کر میں لوٹنے والی ہوں۔''

''بنا کنال کے؟'' سرمد نے کہا۔

''نہیں' میں بنا کنال اس سنسار سے جانے والی نہیں ہوں' سمے بتنا بھی چھل کپٹ کر لے' میں کبھی نہ کبھی اسے اپنی مٹھی میں بند کر کے قہقہہ لگانے والی ہوں۔''

''آج بڑی عجیب اور حوصلے والی باتیں کر رہی ہو یعنی تم اتنی بار شریر کا چولا پہن کر بھی تھکی نہیں ہو؟''

''تھکن کیسی' انسان وقت سے بلند ہے۔ میں اس کی چھاتی پر کھڑے رہ کر اسے بتانے والی ہوں کہ بتنی بھی شکستیں ہوں' میں ہاروں گی نہیں کیونکہ انسانی جیون کے اور کوئی معنی نہیں ہیں کہ وہ خود کو سمے سے زیادہ شکتی شالی ثابت کر دے۔''

''تو مایوس ہونے والی کوئی بات نہیں؟''

''بالکل نہیں' جب قدرت پرش کو کائنات میں سب سے زیادہ بااختیار کہہ چکی ہے تو یہ ہونا بھی ہے پر ابھی مانو جاتی اس مقام سے کافی دور کھڑی ہے۔ انسان کا علم ابھی بڑا ادھورا ہے' وہ وقت کی دست برد سے نکل کر خلاؤں میں چہل قدمی کر آیا ہے مگر وہاں حیات کا بسیرا نہیں جما سکا۔ جب ایسا ہوا تو سمجھو' موت کو شکست ہو گی۔ موت وقت ہے اور وقت کی موت ہی انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی دلیل ہے۔''

''تم کہنا چاہتی ہو' انسان اور اس کی آتما سنسار میں موت کو شکست دینے میں ضرور کامیاب ہوں گے؟'' سرمد کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔

''نہیں' جہاں وقت ہے' وہاں نہیں۔ انسان نے وقت کو شکست دی اور اس کے دائرے سے باہر نکل گیا مگر اسے باہر نکل کر زندگی ڈھونڈنا ہے۔ یہ سنسار کی نہیں' کائنات کی بات ہے۔ انسان کائنات کی تسخیر کے لیے ہی آیا ہے اور تسخیر صرف وقت کو شکست دینے سے ہی ممکن ہے۔ جہاں وقت ہے' وہاں انسان کی کامل فتح ممکن نہیں۔'' رجنی نے رسان سے کہا۔

''مگر رجنی' انسان تو یہی کر رہا ہے۔ وقت کو سنسار میں قابو کرنے اور شکست دینے کے جتن کیا کرتا ہے۔ اسے وقت کے دائرے سے نکل کر زندگی بسانے کی کو تو سمجھ ہی نہیں ہے۔'' سرمد نے اپنی کھوج کے سب کھڑکی دروازوں سے جھانکتے سوالوں کو مسخر کرنے کی ٹھان لی۔

''اس رمز کو میں بھی نہیں جانتی کہ انسان وقت کی دائرے میں رہ کر اسے شکست کیسے دے سکتا ہے؟ جانے



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قدرت نے ایسی بھی کوئی چیز رکھ چھوڑی ہو جو کبھی نہ کبھی انسان کو حاصل ہو جائے۔''

''مگر جو تم کہتی ہو یعنی وقت کے دائرے سے نکل کر اسے شکست دینا یہ تو فرار ہے' یہ کوئی مقابلہ تو نہیں' مقابلہ تو یہ ہے کہ وقت کے سامنے کھڑے رہ کر اسے شکست دی جائے۔'' سرمد نے پھر اپنی جرأت کے وصف کو مہمیز دی۔

''وقت اپنے دائرے سے پرش کو نکلنے نہیں دیتا' یہی دونوں کا مقابلہ ہے اور جو نکل جائے' اسے بھی واپس کھینچ لیتا ہے کہ یہی اس کی فطرت ہے۔ اس دائرے میں کھڑے رہ کر اس کی شکتی کو توڑنا اسے شکست دینا جانے' یہ بھی ممکن ہو مگر میں اس سے واقف نہیں اور نئے عالموں کی کھوج میں جانے پرش کو کوئی ایسا عالم مل جائے جہاں سے نہ ہو تو سمجھو' پرش نے اپنے لیے نئی دنیا بسالی۔ ایسی حیات وہاں نہیں ہے جہاں وقت نہیں ہے اور ممکن ہے' یہ منظر بس اوجھل ہو' کبھی یکا یک دکھائی دے جائے پھر ایسا بھی ہو کہ جہاں وقت ہو' وہاں خلا ہو اور انسانی حیات وہاں ہو جہاں وقت نہ ہو۔ یہ سب ممکن ہے یا ناممکن' جانو' کائنات میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے مگر یہ طے ہے کہ پرش کا سفر ابھی بہت باقی ہے۔''

''اوہ..... میرے خدا.....! میں یونہی بھکارا کرتا تھا جیسے میری ہستی تو خود مجھ سے اوجھل تھی۔'' سرمد کے منہ سے نکلا تو رجنی نے خاموشی کی چادر اوڑھ لی اور سرمد کے دل و دماغ میں بس ایک ہی بات ہتھوڑے کی ضرب کی طرح برسنے لگی کہ خود اسے یہ کہانی سنانے کا مطلب یہ تھا کہ اسے بھی سے سے جنگ کرنا ہے مگر کیسے؟ یہ ابھی گہرا اور سربستہ راز ہے جس پر سے تقدیر کب بہت دھیرے سے پردہ سرکانے والی ہے؟ اوہ میرے خدا! یہ صرف دو مخلوق کی لڑائی ہے اور پرش کیسی کیسی فروئی باتوں میں الجھا ہوا ہے۔'' سوچتے سوچتے سرمد کو نیند آ گئی۔

•.....•.....•

''یار' اتنی دیر سے تم سرمد' سرمد کی رٹ لگائے ہوئے ہو' آخر تمہارا پرابلم کیا ہے اظفر؟'' عمران جھنجھلا گیا۔

''تم ہمیشہ اس شخص کے حق میں بولتے ہو اور مجھے اس کے سامنے کمتر بنا دیتے ہو۔'' اظفر نے کوشش کی کہ اس کی آواز عصیلی نہ محسوس ہو۔

''کاش تم جان پاتے' کم تر تو میں ہوں' تمہارے سامنے بھی اور سرمد کے سامنے بھی۔ سرمد ہم دونوں سے زیادہ کامیاب ہے۔'' عمران کی آواز میں اداسی گھلی ہوئی تھی۔

''تمہیں وہ معمولی صحافی سوکالڈ جرنلسٹ ہم لوگوں سے زیادہ کامیاب معلوم ہوتا ہے؟ مجھے چھوڑو' اپنے آپ سے بھی..... تم..... تم.....'' اظفر نے حیرانی سے جملہ پورا کرنے کی کوشش کی۔

''کیا ہوں میں' کیا ہوں میں؟ ایک مشہور ماڈل اور اداکار جس کے ایک اشارے پر لڑکیاں اور لڑکوں کا ہجوم لگ جاتا ہے۔ تم سمجھتے ہو' یہ کامیابی ہے؟ ننھا سا دماغ ہے تمہارے پاس' مینڈک سے بھی چھوٹا۔'' عمران نے اس کا ہمیشہ کی طرح تمسخر اڑایا۔

''کیا مطلب؟'' اظفر کی حیرانی دوچند ہو گئی۔

''سمجھ پاتے تو مطلب نہ پوچھتے۔ جانتے ہو' بڑے بڑے بادشاہ بے اختیار فقیروں کی چوکھٹ پر کیوں سر پٹکتے ہیں؟ فقیروں کے پاس مٹی کے برتنوں میں پانی پینے سے زیادہ کیا ہے؟ وہ سالخوردہ کٹیا جو محلوں کے مقابلے میں کتنی کمزور دکھائی دیتی ہے پھر کیوں اُن فقیروں کو محلوں سے غرض نہیں اور محلوں والے ہمیشہ اُن کے در کے



بھکاری۔ بولو' سمجھ آتا ہے یہ رمز؟'' اظفر کے جیسے دماغ کے فیوز ہی اڑ گئے۔

''تم خود ایک مقبول اور بڑے شہرت یافتہ اداکار ہو کر سوکالڈ فقیروں سے مدد مانگنے گئے تھے کہ میں یعنی عمران تمہاری دوستی سے نکل کر سرمد کی دوستی کے دائرے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہوں اور تمہارے خیال سے یہ کالا جادو ہے جو مجھ پہ سرمد نے کرایا؟'' عمران جیسے بحث پر اتر آیا۔

''تو اس کمینے نے تمہیں بھی بتا دیا؟ جاسوس چھوڑ رکھے ہیں اس نے میرے پیچھے؟'' اظفر کو اپنی بڑی زبردست سبکی محسوس ہونے لگی۔

''بکو مت..... یہ جواب دو' اس جادوگر کا ٹھکانہ تم سے زیادہ شان و شوکت کی تصویر تھا؟''

''نہیں.....'' اظفر کے لہجے میں پژمردگی تھی۔

''اس ڈھونگی کے پاس بھی اللہ والے فقیروں کی مخالف سمت میں کام کرنے کے باوجود تم سے زیادہ کچھ نہ تھا پھر بھی تم اس سے مدد مانگنے گئے' کیوں؟'' اظفر کو لگا کہ اس کی حیثیت سرمد کے سامنے اور چھوٹی ہو گئی۔ اس نے بلا سوچے سمجھے ایک عجیب ہی کیفیت میں کہا۔

''ظاہر ہے' اس کے جادو کا توڑ..... اسی طرح ممکن ہے۔ میں کوئی جادوگر نہیں ہوں۔''

''اچھا تو یہ کس نے تم سے کہا کہ سرمد جادوگر ہے؟'' عمران کو غصہ آنے لگا تھا۔

''تم جس طرح اس کی طرف بڑھ رہے ہو' ہمیشہ اس کی باتیں اس سے ملنے کی بے قراری' یہ سب کس وجہ سے ہے؟'' اظفر نے بھی جو اس کے دل میں تھا' سب کہہ دینا چاہا۔

''یعنی میری اس کے متعلق جو بھی سوچ ہے' اسے تم نے جادوگری سے تعبیر کر لیا اپنے تئیں؟''

''تو اور کیا ہے' اس سے قبل کبھی کسی کے لیے تمہاری وارفتگی ایسی نہیں رہی۔'' اظفر نے اپنی ذہنی سطح سے کہا۔

''کاش اظفر' میں تمہیں سمجھا سکتا کہ یہ وہ بات نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔''

''تو پھر کیا بات ہے؟ اب میں اتنا بھی ناسمجھ نہیں ہوں جو اتنی سامنے کی بات نہ سمجھ سکوں۔''

''تم نہیں سمجھو گے یار' انسان بسا اوقات اپنی بات سمجھانے میں اتنا بے بس ہو جاتا ہے کہ بس۔'' عمران نے شدید مایوسی سے کہا۔

''تم سمجھاؤ تو میں سمجھ سکتا ہوں' سمجھنا چاہتا ہوں۔'' اظفر مصر رہا۔

''اچھا تو پھر سنو' میری روح میں ایک عجیب سی بے چینی ہے جو اس وقت سے ہے جب میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ بے چینی کسی روح وغیرہ کی وجہ سے ہے' میں روح کے ہونے نہ ہونے کی کوئی آگاہی نہیں رکھتا تھا' تب سے۔ بیٹھے بیٹھے خود بخود اداس ہو جانا' بھری محفلوں میں ایکا ایکی تنہا ہو جانا' ہنستے ہنستے یوں محسوس کرنا جیسے کہیں میرے اندر کوئی رو رہا ہو۔ ان سب کیفیات کو نہ کبھی کوئی سمجھ سکا نہ ہی میں کبھی کسی کو سمجھا سکا۔ تمہارے جیسے بہترین دوست کے ہوتے ہوئے بھی اکیلے موئن جوداڑو جیسی ویران اور اداس جگہوں پر چلے جانا' یہ سب جیسے میرے اختیار سے باہر کوئی ایسی بات ہے جس کے بارے میں' میں یہ تک نہ جان سکا کہ آخر یہ سب کیوں ہے؟ میں نے کبھی تمہیں یا کسی کو بھی ایسی کیفیات سے گزرتے نہیں دیکھا تو مجھے لگتا تھا جیسے میں کسی کو بھی اپنی اندرونی کیفیات اور اداسیوں کے بارے میں نہ بتا سکوں گا۔''

ابھی عمران کی بات جاری تھی کہ اظفر درمیان میں بول اٹھا۔ ''تم نے کسی ڈاکٹر کو دکھایا؟''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''مجھے معلوم تھا' تم جیسے لوگوں سے بات کرنے کا مطلب یہی ہے کہ مجھے ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کو کہا جائے گا۔ اگر سب جسمانی تبدیلیوں اور سب طرح کے رویوں کا علاج ڈاکٹروں کے پاس ہوتا تو دنیا میں کبھی کوئی لمحہ بھر کو بھی اداس نہ ہوتا۔ تم کیوں گئے جادوگر کے پاس؟ ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں گئے؟'' الٹا عمران نے اظفر سے سوال داغ دیا۔

''ظاہر ہے' وہ جادوگری کا معاملہ تھا اور اس کا علاج ڈاکٹر کے پاس نہیں تھا۔'' اظفر نے سطحی انداز سے اپنا دفاع کیا۔

''یہ فیصلہ تم نے خود بخود کرلیا کہ یہ جادو ہے؟ اس کا ڈاکٹر سے کوئی تعلق نہیں ہے؟ کیوں کیا تم نے یہ فیصلہ؟ کیوں پہنچے تم اس نتیجے پر؟''

''تمہارا یوں ایک معمولی سے صحافی کی ساتھ قریبی رشتہ استوار کرنا' وہ بھی اس تیزی سے' کافی عجیب اور ناقابلِ یقین ہے؟'' اظفر سے اسی طرح کے جواب کی توقع تھی۔

''اس کا مطلب ہے' تمہیں یقین ہے کہ کچھ نہ کچھ زندگی میں ناقابلِ یقین بھی ہوتا ہے؟''

''آف کورس.....''

''تو پھر میرے اس بدلاؤ پر تم نے مجھے کسی ڈاکٹر کو دکھانے کا مشورہ دینے یا مجھے پکڑ کے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے بجائے جادوگر سے مدد لینا ٹھیک سمجھا؟''

''ڈاکٹر سے ایسی باتیں کرنا اپنا مذاق بنوانے کے مترادف ہے۔'' اظفر جیسے عمران کی گفتگو کے بارے میں دھیرے دھیرے وہیں آتا جارہا تھا جہاں عمران اسے لانا چاہتا تھا۔

''تو پھر اظفر' مجھے یہ بتاؤ کہ ایسا ہی میں کررہا ہوں تو وہ تمہیں غلط یا کچھ اور کیوں لگ رہا ہے؟ میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ میرے ان مسائل' ان بے چینیوں کا حل ڈاکٹر کے نہیں' سرمد کے پاس ہے تو یہ تمہیں جادو کیوں لگتا ہے؟''

اظفر الجھ کے رہ گیا کہ اب کیا کہے؟ ''تمہیں کیسے یقین ہے کہ تمہاری ان عجوبہ سوچوں کا علاج سرمد کے پاس ہے' اس معمولی صحافی کے پاس؟''

''تم بار بار اس غیر معمولی انسان کو معمولی صحافی کہہ کر اپنے ایک ایسے جذبے کو تسکین دینے کی کوشش کرتے ہو جو تم نے خود ہی تخلیق کرلیا ہے یا وہ تخلیق ہوتا جارہا ہے اور تم سمجھ نہیں پارہے۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمارے اندر ہماری مرضی اور اختیار کے بغیر جنم لیتی ہیں اور دھیرے دھیرے وہ طاقتور بنتی چلی جاتی ہیں جیسے تمہارا یہ حسد کا جذبہ' اسی طرح جسمانی بیماریاں اگتی اور پھیلتی ہیں۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ انسانی جسم میں کوئی روح نام کی بھی چیز ہے تو پھر یہ بھی مان لو کہ روحیں بیمار بھی ہوتی ہیں' ان کا علاج بھی ڈھونڈنا پڑتا ہے اور مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ روحوں کا علاج ڈاکٹروں کے پاس نہیں ہوتا ہے پھر بھی تمہاری جیسی سوسائٹی سے تعلق رکھنے کی وجہ سے میں نے کئی نفسیاتی ڈاکٹروں سے کنسلٹ کیا تھا لیکن نہ ہی مجھے کہیں سے بھی تسلی بخش جواب ملا نہ ہی میری تشفی ہوئی۔ سوسائٹی میں عام طور سے کسی بھی انسان کا نفسیاتی ڈاکٹر سے رجوع کرنے پر لوگوں کا جو ردِعمل ہے' وہ فوری طور پر اسے نارمل انسانوں کی فہرست سے نکال کر ایک نفسیاتی مریض اور بعض کیسوں میں پاگل سمجھتے ہیں جو لوگ اپنے صحیح اور یقینی طور پر تندرست ہونے کا کسی نفسیاتی ڈاکٹر سے کوئی سرٹیفکیٹ لے کر نہیں گھوم رہے' انہوں



نے کبھی نفسیاتی ڈاکٹر سے رجوع ہی نہیں کیا' ایسے لوگ بھی اس انسان کو جس نے نفسیاتی ڈاکٹر سے رجوع کیا ہے' ایب نارمل اور نفسیاتی مریض یا پاگل کہنے میں دیر نہیں لگاتے۔ میں پوچھتا ہوں' ایسے کسی بھی انسان کو کسی بھی دوسرے شخص کو پاگل یا نفسیاتی کہنے کا اختیار کیسے مل جاتا ہے؟ کسی دوسرے انسان کو یہ اختیار صرف اسی صورت میں ملنا چاہیے جب اس کی ذہنی صحت کا نفسیاتی ڈاکٹر کا دیا ہوا سرٹیفکیٹ اس کے پاس ہو مگر سوسائٹی انصاف کا ایسا میزان اپنے رویوں میں کبھی طے نہیں کرتی۔ سب لوگ دوسروں کی خامیوں کو کھوجنے میں جٹے رہتے ہیں' اپنی خامیوں پر ان کی نظر کبھی نہیں پڑتی چہ جائیکہ ایک میرے جیسا مشہور اداکار اگر میں نفسیاتی ڈاکٹروں کے پاس جاؤں گا تو جانتے ہو' مجھے پاگل سمجھنے میں لوگ کتنی دیر لگائیں گے؟ کوئی حرف ایسا نہ ہوگا جو میرے حق میں لکھا جائے۔ سب مجھے بڑے آرام سے اور بڑی جلدی پاگل اور نفسیاتی مریض سمجھنے لگیں گے' خود تم بھی ان باتوں پر یقین کرنے میں دیر نہیں لگاؤ گے۔ ابھی تم سمجھتے ہو' مجھ پر جادو ہو چکا ہے پھر تم مجھے نفسیاتی مریض سمجھنے لگو گے۔ کیا کسی نفسیاتی ڈاکٹر کو تمہاری اس بات کا یقین آئے گا کہ مجھ پر جادو ہو چکا ہے؟ کیا تم کسی بھی ڈاکٹر کے پاس لے جاکر میرے بارے میں یہ کہو گے کہ مجھ پر سرمد نے جادو کردیا ہے؟ ڈاکٹر میری ذہنی حالت اور رویوں کا جائزہ لے کر ان علامات کو اپنی پہلے سے تحقیق شدہ بیماری کے آئینے میں پرکھے گا اور مجھے اسی طرح کی دوا اور تدابیر سے گزارا جانے لگے گا اور اس بیماری کا کوئی نہ کوئی نام بھی ضرور رکھ دیا جائے گا مگر جن پر گزرتی ہے' صرف وہی جانتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے؟ وہ بیمار ہیں مگر ان کا جسم نہیں' ان کی روح بیمار ہے اور روحوں کا علاج کسی بھی ڈاکٹر کے پاس کبھی نہیں رہا۔''

اظفر اس بے پناہ طولانی وضاحت کے بعد شدید الجھن میں پڑ گیا کہ کیا جواب دے؟ عمران نے اس سے قبل کبھی ایسی باتیں نہیں کی تھیں اور آج وہ اتنی دقیق اور الجھی ہوئی باتیں کررہا تھا کہ اظفر کے دماغ میں جیسے شور بھر گیا' اسے عمران کی بات کہیں سے سمجھ آئی اور کہیں سے نہیں آئی۔

''مجھے صرف اتنا بتادو کہ تمہاری ان بے پناہ گنجان باتوں کا حل سرمد کے پاس ہے کیا؟''

''مجھے ایسا لگتا ہے کیونکہ اس روز مکلی کے گورستان میں اس بے پناہ شیریں ترنم کو میں نے سنا تھا اور ایک ناقابلِ واضح ہیولہ مجھے نظر بھی آیا تھا۔ سرمد کی وہاں موجودگی اس بات کی گواہی تھی کہ اس نے بھی وہ کچھ دیکھا اور سنا' یقیناً مجھ سے زیادہ واضح اور پر یقین۔ تم بھی وہیں تھے مگر تمہیں نہ ہی کچھ سنائی دیا نہ ہی دکھائی دیا تو تم اس سب بے پناہ غیر عقلی معاملے میں کچھ بھی رائے کیسے دے سکتے ہو؟''

''لیکن عمران' ممکن ہے' سرمد نے بھی کچھ نہ سنا ہو اور کچھ نہ دیکھا ہو مگر تم سے قریب ہونے کے لیے وہ کہانی تراش لے اور یوں اس کی گرفت تم پر اور تمہاری شخصیت پر مضبوط ہوتی چلی جائے۔'' اظفر اب بھی سرمد دشمنی میں سرشار تھا۔

''مجھے تمہاری بات میں شبے کی ہلکی سی نہیں' بہت زیادہ جھلک دکھائی دیتی ہے۔ سرمد مجھ پر گرفت کر کے کیا کرے گا؟ تم میرے بارے میں بہت پوزیسو ہو اس لیے ایسا سوچتے ہو۔ مجھے یقین ہے' اس معاملے کو سرمد مجھ سے زیادہ جانتا ہے اور میری نامعلوم اجنبی اداسیوں کا کچھ نہ کچھ علاج بھی اسی کے پاس ہے۔'' عمران کی آنکھیں یاسیت اور جیسے نامعلوم منظر کی کھوج میں اور بھی گہری ہوگئیں۔ اظفر کو لگا' جادو سر چڑھ کے بول رہا ہے اور وہ 50 ہزار روپیہ خرچ کر کے بھی عمران کے سر سے سرمد کا بھوت اتارنے میں ناکام ہو چکا ہے۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تو تم سرمد سے ملو گے؟'' اظفر نے ہارتے ہوئے جواری کی آخری امید کی طرح سے پوچھا۔

''مجھے بڑے طویل عرصے بعد میری زخمی اور اداس روح کا علاج نظر آیا ہے۔ میں اس راز سے ضرور واقف ہونا چاہتا ہوں جو اب تک مجھ پر گپت ہے۔''

''تو پھر مجھے چھوڑ دو۔'' اظفر کا غصے میں ڈوبا یہ چھوٹا سا جملہ ایک بڑی جنگ کا نقارہ تھا۔ عمران کو دھچکہ لگا' اس نے بڑی غضب کی حیرت اور ناقابلِ یقین انداز میں اظفر کی طرف دیکھا۔

''تو میری ساری بپتا سن کر بھی تم اس نتیجے پر پہنچے کہ میرا ساتھ دینے' میری مدد کرنے کے بجائے مجھے چھوڑنے کی بات کر رہے ہو؟''

''میں اس آدمی کو برداشت نہیں کر سکتا۔'' اظفر نے یہ فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''یعنی میری روح اس طرح گھائل رہے' میں انجانی راہوں میں بھٹکتا رہوں' مجھے کبھی اپنی ان گھورا داسیوں کا سراغ نہ ملے' یہ تمہیں منظور ہے مگر سرمد منظور نہیں؟'' عمران نے بڑی گمبھیرتا سے دردانگیز لہجے میں کہا جیسے سونے ویران جنگل میں کوئی پرندہ دکھائی نہ دینے والی تکلیف سے کراہتا ہو۔

''یہی سمجھ لو' تمہیں سرمد اور مجھ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔'' اظفر بدستور حسد کے ہون میں جھلس رہا تھا۔

''یعنی میں نے جو کچھ کہا' وہ سب تمہارے لیے بے معنی تھا اور تم وہیں اٹکے ہوئے ہو مرغے کی ایک ٹانگ کی طرح؟'' عمران نے اتمامِ حجت کی۔

''پتا نہیں' مجھے تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آئیں' بس اتنا جانتا ہوں کہ تم سرمد سے ملتے رہنے کے لیے کچھ ایسے جواز تراش رہے ہو جنہیں میں قبول کر لوں اور مجھے تمہاری اور سرمد کی دوستی پر کوئی اعتراض نہ رہے مگر مجھے یہ سب منظور نہیں۔ تمہیں مجھے چھوڑنا ہوگا یا سرمد کو' یہ فیصلہ کر لو بس۔''

عمران کو لگا' اس موٹی آنکھوں والے' بڑے منہ کے انسان کے سر میں تھوڑا بہت بھیجہ ضرور ہے مگر دل کی دھڑکنوں میں کوئی ایسی صدا نہیں جو روح کے تاروں کو چھیڑنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

''اسی لیے میں نے تم سے آج تک اپنا یہ دکھ بیان نہ کیا تھا کیونکہ میں جانتا تھا' تم کبھی کچھ بھی نہ سمجھ سکو گے۔'' عمران نے سخت مایوسی سے کہا۔

اظفر نے جیسے چل پڑنے کو اٹھ کھڑے ہونے کا عندیہ دیا۔ ''جب تمہارے سر سے سرمد کا بھوت اتر جائے تو مجھے فون کر لینا' میں نے ٹھیک سمجھا تو میں واپس آ جاؤں گا ورنہ شاید ہم ہمیشہ کے لیے الگ ہو رہے ہیں۔''

اظفر کی بات سن کر عمران کو لگا کہ جسم اور روح ایک ساتھ رہ کر بھی کبھی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ایک کی بے چینی' دوسرے کی بے قراری ہے اور اس وقت عمران کو روح اور جسم میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا لہٰذا اس نے اظفر کو خاموش رہ کر اپنا فیصلہ خود کرنے کا پورا موقع دیا اور یوں عمران کا مدتوں پرانا دوست اس کے دکھ سکھ کا ساتھی اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ باہر دھوپ نے رسان سے برسنا شروع کر دیا' ہواؤں میں بھی کوئی بے قراری نہ تھی۔ برآمدے میں رکھے گملوں میں کھلتے پھولوں نے جیسے ایک انگڑائی لی۔ سے کی زبان کبھی کوئی نہیں سمجھ سکا اور یوں سے اس منظر کا تماشہ بھی دیکھا کیا۔

عمران نہایت دھیرے سے اپنے بیڈ پر لیٹ گیا۔ مختلف سوچوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اس شہر



میں اس کا سب سے قریبی دوست اظفر ہی تھا' اظفر کے بغیر سے کے اس حصے میں زندگی کافی سنسان اور ویران محسوس ہوتی اور اس وقت عمران کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔ کیا وہ اس نئے دکھ سے نمٹ سکے گا؟ اس نے سوچا اور بہت ہولے سے آنکھوں پر پلکیں گرا لیں۔ دل رو رہا تھا اور آنسو بے اختیاری سے اس کا چہرہ بھگو رہے تھے۔ جسم اور روح کے اپنے اپنے دکھ اور اپنے اپنے تقاضے ہیں۔ انسانی بدقسمتی یہ ہے کہ ایک کے تقاضے یعنی جسم کے اس پر ہمیشہ آشکار رہتے ہیں اور روح ہمیشہ ایک دبیز اور سربستہ راز ہی بنی رہتی ہے لہٰذا عام انسان کبھی بھی ان دونوں کے بیچ فیصلہ کرنے کی شکتی نہیں جٹا پاتا کہ آخر اس کی اصل حقیقت' اصل منزل ہے کیا؟ عام انسان کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ وہ ساری حیاتی ظاہر کی پوجا کرتے گزار دیتا ہے اور باطن میں اندھیرا کنڈلی مارے بیٹھا رہتا ہے اور جب کبھی کسی انسان کے باطن میں کوئی ہلکی سی بھی کرن روشنی بن کے داخل ہونے لگتی ہے تو ظاہر میں جو کچھ ہے' وہ اس کا بیری ہونے لگتا ہے اور اس وقت عمران کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ اس کشمکش میں دیر تک لوٹنیاں مارنے کے بعد بالآخر عمران نے سرمد سے مل کے اپنے مسئلے کے سلجھانے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے ہاتھ سرمد کا نمبر ملانے لگے۔ بار بار گھنٹی بجتی رہی مگر سرمد نے فون ریسیو نہیں کیا' مایوسی اور اندھیرا اور بھی گہرے ہو گئے اور سے کی سے عمران کو یوں لگا جیسے زندگی اس پر تنگ ہو رہی ہے' سب دروازے دھڑ دھڑ کر کے بند ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ نہایت بے بسی سے زار و قطار رو پڑا۔

•.....•.....•

سرمد نے کئی دن کی روزمرہ مصروفیات میں خود کو پھر سے الجھنوں میں محصور پایا۔ اس سارے وقت میں کئی بار اسے رجنی کا خیال آیا مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر وہ رجنی سے کیا بات کرے؟ رجنی بھی خاموش تھی۔ مزار کے بھیتر خاصی بھیڑ تھی۔ سرمد نے بے دلی سے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک خالی جگہ ڈھونڈ کر وہاں بیٹھ رہا۔ سر اس نے گھٹنوں میں دے دیا اور آس پاس کے منظر سے غافل ہونے کی شعوری کوشش کرنے لگا۔ زندگی کس قدر الجھاووں سے بھری ہوئی ہے' ایک سوال مسلسل اسے تنگ کر رہا تھا کہ رجنی کو کبھی اس کا کنال ملے گا یا نہیں؟ انسان بھی کیا ہے' جو کچھ نہ ہو تو وہ کچھ نہ کچھ تراش لیتا ہے اور کبھی کبھی خود بخود کچھ نہ کچھ اس کی زندگی میں حادثوں کی طرح در آتا ہے۔ دنیا میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو دنیا اور کائنات کو حادثے کے ہی پیداوار سمجھتے ہیں اور ایسے لوگ بھی بہت ہیں جو ان حادثوں کو ہی قدرت اور خالقِ کائنات سمجھ کر اسے اپنا ایمان بنا چکے ہیں۔

مزار کی مختلف جگہوں سے عورتوں اور مردوں کا شور بلند ہو رہا تھا۔ عورتیں زیادہ شدت سے چیخ رہی تھیں۔ گالیوں کا بھی نہ رکنے والا طوفان ابل رہا تھا۔ سرمد نے سوچا' ان عورتوں پر جن آ جاتے ہیں اور یہ ان جنوں سے پیچھا چھڑانے کو واہی تباہی بک رہی ہوتی ہیں۔ اسی قسم کی ذہنی اٹھا پٹخ میں سرمد کو یکا یک اپنا دل زور زور سے دھڑکتا محسوس ہوا۔

''کیا چاہتا ہے؟'' ایک آواز اسے سنائی دی۔

''رجنی کا کنال۔'' اس کے اندر سے نکلتی یہ آواز بھی اس نے صاف محسوس کی۔

''وقت متعین ہے سب معاملوں کے ہونے کا اور جب سے ہوگا تو رجنی کو اس کے کنال سے ملوا دیا جائے گا۔'' اب سرمد نے سمجھ لیا کہ آواز درگاہ سے آ رہی ہے۔

''تو کیا قدرت کے سامنے سے کی حیثیت انسان سے زیادہ ہے؟''



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہرگز نہیں' پریانت کبھی بھی کیوں نہ ہو' انسان اسے وقت ہی سمجھے گا جیسے آتما دکھائی نہ دے' تب بھی ہوتی ضرور ہے' اسی طرح وقت نہ ہو' تب بھی ہوتا ضرور ہے۔ رجنی ہماری بیتی سمان ہے' اس کا دکھ ہمارا دکھ ہے مگر ابھی اس کا پریم وقت کی قید میں ہے' اس قید سے اسے جو وقت کے رہتے نجات ملی تو کبھی وقت کا کوئی تو تعین ہے جو وقت کے باہر وہ اپنے کنال سے ملی' تب بھی وقت کا موجود ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اب یوں ہے کہ اسے دن اور رات کی ترتیب سے علاقہ نہ ہوگا۔''

یہ کہہ کر آواز جیسے خاموش ہوگئی۔ سرمد سوچنے لگا کہ اس نے رجنی اور کنال کا ملاپ کیوں چاہا؟ کہیں ایسا تو نہیں' رجنی کی داستان عشق سن کر وہ خود بھی رجنی بن چکا ہو؟ جو ایسا نہ تھا تو پھر اس نے اپنے لیے کچھ نہ چاہا۔ اپنے لیے کیا؟ رجنی نے کہا تھا کہ وہ سے جلد آنے والا ہے جب خود سرمد کی سے سے ایک نئی جنگ کا آغاز ہونے والا ہے۔ خالق کائنات نے لاتعداد فروعی چیزیں تخلیق کر کے انسان کو اتنا الجھا دیا ہے کہ اسے اپنی تخلیق کے اصل معنی بھی بھول گئے ہیں۔ وہ جزا اور سزا کے چکر ویو میں پھنس چکا ہے اور مضحکہ خیزی یہ ہے کہ اس اوازن کو بھی پوری طرح سے پکڑ کے نہیں چل پایا' تب ہی یہ سوچ کر سرمد کے ہونٹوں پر ہنسی کھیل گئی کہ بہت سے انسان بھی فروعی ہیں۔ انسان کو برابری صرف روٹی' کپڑے اور مکان کی ہی دی جاسکتی ہے اور کوئی ایسی برابری نہیں ہے جس میں سب انسان برابر اور مساوات کے لیے تولے جاسکیں۔ جزا اور سزا بھی چند انسانوں کے لیے ہی محیط اور مقرر ہے مگر واویلا مچا ہوا ہر سو اور ہر گام پر ہے۔

''تم پھر ایسی باتوں میں الجھ رہے ہو جو تمہارا سکھ چین چھین لیں گی؟'' آواز پھر ابھری۔

''ایسی باتیں میرے اندر کون پیدا کرتا ہے؟ جو انہیں پیدا کرنے پر قادر ہے' وہی تو چاہتا ہے کہ میں بے چین رہوں اور جو وہ چاہتا ہے کہ میں بے چین رہوں تو پھر میرے چین و قرار کی حیثیت کیا ہے؟ یہ محض ایک تشنہ خواہش ہے' اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ سب خواہشوں کی موت ہوتی ہے' وہ جو پوری ہوئی ہیں اور وہ جو پوری نہیں ہوئیں اور سب موتوں پر تکلیف ہوتی ہے خواہ انسان چاہے یا نہ چاہے' موت کا یہی فلسفہ ہے کہ اس کی فطرت اور ردعمل دکھ ہے۔ دکھ تخلیق بھی ہوا ہے مگر دکھی رہنا کوئی نہیں چاہتا۔ سب کو خوشی اور شانتی چاہیے تو دکھ کیوں ہے؟ دکھ نہ ہوتا تو خواہش نہ ہوتی' خواہش کے بطن سے دکھ نے جنم لیا اور خواہش نے کہاں سے جنم لیا' یہ بڑی الجھی ہوئی گتھی ہے۔ خواہش کو پیدا ہونے سے روکا نہیں جاسکتا تو پھر دکھ کو بھی آنا ہے' اسے بھی روکا نہیں جاسکتا۔ دکھ ایک ڈراوا ہے پھر بھی انسان خواہش کے ساگر میں اترتا ہے؟''

''مگر جب کچھ خواہشیں پوری ہو جاتی ہیں تو انسان خوش بھی ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے' خوشی بھی ہے اور اسے بھی آنا ہے۔ خوشی ایسے ہے جیسے طویل مسافت میں دم بھر کو کوئی اسٹیشن آتا ہے۔ مسافت تکلیف ہے اور دکھ ہے اور لمحاتی خوشی کبھی بھی مسافت کی جگہ نہیں لے سکتی۔ جب خوشی آتی ہے تو دکھ موقوف ہو جاتا ہے اور پھر وہ خوشی کے خاتمے پر طلوع ہوتا ہے اور مسافت کی طرح طویل ہوتا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ پھر کب موقوف ہوگا؟''

موبائل فون پر وائبریشن بار بار ہو رہی تھی' بہت دیر ہوئی' سرمد کے دل میں لگے رن کی حالت بھی ایسی تھی جیسے جنگ ختم ہوئے دیر ہو چکی ہے اور سناٹا سب کچھ نگل چکا ہے۔ ایک وقتی قرار اسے اپنے سارے وجود میں محسوس ہوا۔ درگاہ کی یہ خاص کرامت تھی' ہمیشہ سرمد کو یہ احساس ہوتا کہ دنیا میں جن چند جگہوں پر کامل شانتی ہے' ان میں سے ایک درگاہ بھی ہے۔ اس نے حسب روایت موبائل نکال کے صرف یہ دیکھا کہ کس کا فون ہے؟



اسکرین پر عمران کا نام چمک رہا تھا۔ درگاہ میں سرمد نہ ہی کسی کا فون سنتا تھا نہ ہی میسج کا جواب دیتا تھا اس لیے اس نے موبائل واپس جیب میں رکھ لیا۔

ابھی وہ موبائل رکھ کے ہاتھ جیب سے باہر نکال ہی رہا تھا کہ اسے میسج کی وائبریشن ہوئی' اس نے پھر موبائل نکالا۔ میسج اظفر کا تھا۔ سرمد نے عجیب سے استہزا سے موبائل دوبارہ رکھ لیا اور اس فلسفے پر غور کرنے لگا کہ..... ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہم انجانے میں کسی کے بھی دکھ کا سبب بن جاتے ہیں؟ ہم ایسا نہ چاہیں' تب بھی کسی کو دکھی کر دیتے ہیں؟ اس وقت اظفر کے دکھ کا وہ خود کو سبب سمجھ رہا تھا اور انسان کی کیسی بے بسی ہے کہ وہ چاہتے ہوئے بھی خود کو اس دکھ کا حصہ بننے سے روک نہیں سکتا' شاید تب ہی سدھارتھ نے کہا تھا کہ انسان صدیوں سے ایک نہ بریک ہونے والے تسلسل کا حصہ ہیں' آپس میں مربوط اور باہم جڑے ہوئے مگر بظاہر الگ الگ نظر آتے ہیں' انسان چاہے بھی تو اس تسلسل سے خود کو الگ نہیں کر سکتا کیونکہ انسانی تسلسل ایک ایسی زنجیر ہے جو کڑیوں کے جڑے رہنے سے ہی زنجیر کہلاتی ہے اور ان کڑیوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کا اختیار کسی کے پاس نہیں ہے۔ قدرت کے پاس کتنے ہی ایسے اختیار ہیں جن پر اس وقت انسان کا بس نہ ہوگا جب وہ موت اور وقت کو کلی شکست دے دے گا کیونکہ قدرت اسی وقت تک اپنا وجود قائم رکھ سکتی ہے جب تک وہ انسانوں سے بلند رہے حتیٰ کہ انسان اس کی برابری بھی نہ کر سکے۔ انسان کی بنائی ہوئی کوئی بھی چیز اس سے زیادہ طاقتور ہو سکتی ہے مگر قدرت کی بنائی ہوئی کوئی بھی چیز اس کی ہمسری بھی نہیں کر سکتی' یہی قدرت ہے۔

مزار سے نکل کر اس نے عمران کو خود فون کیا تو دوسری طرف سے اسی زبردست جوش اور بہترین ردعمل ملا جو حسب توقع تھا کیونکہ سرمد نے اظفر کا میسج پڑھ لیا تھا جس میں لکھا تھا کہ بالآخر آپ کا جادو چل گیا ہے اور میں نے عمران کو چھوڑ دیا ہے۔ اب آپ جب چاہیں اور جتنا چاہیں' اس سے مل سکتے ہیں۔ سرمد کو ہنسی آئی کہ وہ ایسا نہ ہی چاہتا ہے نہ ہی ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کا سبب ہے پھر بھی ایسا ہے؟ بیک وقت کوئی بھی دو چیزیں ہوتی بھی ہیں اور نہیں بھی ہوتیں' یہ تجربہ سرمد کو پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔

عمران سے ملاقات کا وقت طے ہوا۔ آفس سے چھٹی کر کے وہ اس ویران ساحل کے حصے کی طرف بڑھا جہاں عمران پہلے سے موجود تھا۔ عمران بڑے خلوص اور گہری دلآویزی سے ملا۔ سرمد نے سگریٹ نکالا اور سلگا کر کش لیا۔ اتنی دیر میں عمران نے گفتگو کا سرا یہیں سے پکڑا۔

''آپ سگریٹ کیوں پیتے ہیں؟''

''مجھے یقین ہے' آپ یہ پوچھنے اتنی دور اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے نہیں آئے ہوں گے۔'' عمران زور سے ہنسا۔

''آپ کی ہنسی میں آج بڑا درد ہے؟'' سرمد نے کہا۔

''تازہ تازہ دکھ ہے۔'' عمران نے اب بھی مسکرانے کی کوشش کی۔

''اور آپ اس دکھ کو ہنسی میں اڑا دینا چاہتے ہیں؟'' سرمد بولا۔

''ایسا نہیں ہے پھر بھی میں اسے روگ بھی نہیں بنانا چاہتا۔'' عمران نے جانے کسی دبے ہوئے غصے سے یہ کہا ہو۔

''روگ بھی اختیار سے باہر ہوتے ہیں ورنہ وہ روگ نہ کہلاسکیں۔'' سرمد نے پھر کش لیا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہاں' شاید مگر انسانی ذہن یہ فیصلہ تو کر ہی سکتا ہے کہ اسے کس چیز کو کتنی اہمیت دینی ہے؟'' عمران نے اپنی مشق کے بموجب کہا۔

''ہاں' میں ایسا سمجھتا ہوں' مانتا نہیں ہوں۔ دکھ ذہن سے ماورا ہے۔ ہمیں ذہن کی قدر و اختیاری کو بھی کبھی نہ کبھی سمجھنا ہی ہوتا ہے۔''

''بہت مشکل باتیں کرتے ہیں آپ؟'' عمران نے اپنی آواز کے خمار کو لہروں کے شور سے بلند کرنے کی غالباً شعوری کوشش کی۔

''ہر آدمی سے نہیں ورنہ لوگ مجھے پاگل سمجھ کے مجھ سے بہت دور بھاگنے لگیں گے۔ بعض لوگوں سے میں ایسی باتیں بھی کرتا ہوں جن کی سطح بہت نچلی ہوتی ہے۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً میں آپ سے یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ آپ اپنی اداکاری سے زیادہ خوبصورت ہیں اور مجھے ایسا کہتے ہوئے یہ یقین ہوتا ہے کہ آپ اس کے باوجود یہ سن کر خوش ہوں گے حالانکہ اداکاری میں آپ کا کمال ہے مگر آپ کی خوبصورتی میں آپ کا کوئی کمال نہیں۔'' سرمد نے غور سے عمران کو دیکھا۔

''بہت عجیب..... کیا یہ دونوں ہی میری نہیں ہیں' خوبصورتی اور اداکاری؟''

''نہیں' اداکاری آپ کی ہے' خوبصورتی تو اسی کی ہے جس نے اسے بنایا ہے۔''

''واہ..... آپ سے کوئی جیت نہیں سکتا۔'' عمران جیسے لاجواب ہو گیا۔

''میں آپ سے ہار جیت کا کوئی کھیل کھیلنے کی خواہش نہیں رکھتا۔ آپ بات کر لیں جس کے لیے آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں؟'' سرمد نے سوچا۔ الجھنوں سے اٹی گفتگو اتنی عریض ہو سکتی ہے کہ سے کم پڑ سکتا ہے۔

''میں جاننا چاہتا ہوں' اس رات جو آواز میں نے سنی تھی' وہ کیا ماجرا ہے؟ اور وہ آواز کیا آپ نے بھی سنی اور کیا کوئی منظر آپ نے مجھ سے بھی زیادہ قریب سے دیکھا اور یہ کہ اظفر کو نہ کچھ دکھائی دیا نہ سنائی دیا' کیوں؟''

''یہ بتانا تو مشکل ہے کہ اظفر کو وہ آواز کیوں سنائی نہیں دی کیونکہ بعض ایسی باتیں بھی ہو سکتی ہیں جو براہِ راست اظفر سے متعلق ہوں۔ آپ ان باتوں کو سوچیں حتیٰ کہ ان کا خواب بھی دیکھیں' اس خواب میں اظفر ہو مگر اسے نہ وہ دکھائی دے نہ سنائی دے لیکن آپ کے سوال کا باقی جواب میں دے سکتا ہوں۔ وہ آواز مجھے سنائی بھی دی تھی اور دکھائی بھی دی تھی' وہ رجنی کی آواز تھی۔

عمران کو لگا' اس کی سماعت پر کوئی دھما کہ ہوا ہے۔ ''رجنی.....'' اس کے ہونٹوں پر مچلا۔

''میں اگر یہ کہوں کہ آپ رجنی کو مجھ سے بھی پہلے سے جانتے ہیں تو آپ کو یقین نہیں آئے گا اور اس سے بھی زیادہ ناقابلِ یقین بات یہ ہے کہ 2,500 سال قبل کی رجنی آج کی گھائل آتما صرف اسی وجہ سے دکھوں کے گھنیرے جنگلوں میں بھٹک رہی ہے کہ آپ نے بے وفائی کی تھی۔ بھٹکتی آتمائیں ہمیشہ بے وفائی کے کارن ہی بے چین رہتی ہیں۔''

''میں نے رجنی سے بے وفائی کی' میں تو کسی رجنی کو نہیں جانتا؟'' عمران کی حیرتوں میں ڈوبی آواز سمندر نے پوری شدت سے انگڑائی لی۔



''جانتے نہیں تو اس رات وہ آپ کو کبھی دکھائی نہ دیتی۔ ضروری نہیں جو آپ کو یاد نہ ہو' وہ موجود بھی نہ ہو۔ مجھے نہیں لگتا کہ آپ کبھی بھی رجنی کو جان سکیں گے یا وہ آپ کو یاد آ سکے گی اور آپ کی حیرت کو صحیح سمت دے دوں۔ آپ نے رجنی سے نہیں بلکہ رجنی کے پریمی یودراج کنال سے بے وفائی کی تھی مترشنگ.....''

عمران کو پھر اپنی سماعت میں بم پھٹتا ہوا سا محسوس ہوا۔ ''رجنی کنال' مترشنگ' پلیز سرمد' آپ مجھے سب کچھ وضاحت سے بتائیے' کیا یہ جنموں کی کوئی کہانی ہے؟''

''جی نہیں' جس طرح انسان نے اپنی سہولت اور آسانی کے لیے وقت کو شمار کر لیا ہے اور ایک سے لے کر بارہ تک کی ترتیب دی ہے' وقت کو اسی انسانی زندگی کو سمجھنے کے لیے بعض دھیانی گیانیوں نے جنموں کی بات محض انسان کو سمجھانے کے لیے کی ہے تاکہ اس پر زندگی کا فلسفہ آسان ہو جائے۔ بدقسمتی سے انسان نے جتنے تنازعات اور تفرقات کو جنم دیا' اس میں یہ فلسفہ بھی ایک سمجھ میں نہ آنے والی تھی اور ایمان کی مخالف قوت کی سی شکل اختیار کر چکا ہے۔ جس طرح وقت کی تقسیم ہوتی ہے اور دن و رات اس سے آسان ہو گئے ہیں' اسی طرح زندگی کی بھی تقسیم ہوئی ہے جیسے ہر روز' ہر وقت ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی ہوتا' اسی طرح زندگی بھی ہوتی بھی ہے اور نہیں بھی ہوتی۔''

''اوہ میرے خدا.....!'' عمران کے منہ سے نکلا پھر وہ نہایت انکساری سے بولا۔ ''سرمد' جس طرح مجھے کچھ بھی یاد نہیں ہے' اسی طرح آپ کو یقیناً سب کچھ یاد ہے۔ کیا آپ میری بے چینی کو دور کرنے میں میری کچھ مدد کریں گے اور بتا دیں گے کہ مجھ سے سے کے اس حصے میں کیا سرزد ہوا ہے؟''

''عمران..... آپ جان لیں گے' تب بھی آپ کی بے چینی کے ختم ہونے آپ کو قرار ملنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ جو کرموں کا پھل ہے' وہ آپ کو بھوگنا ہی ہے۔ ممکن ہے' اس داستان کو سن کر آپ مزید نراش ہو جائیں اور آپ کی بے چینی میں اضافہ ہو رہے لہٰذا آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ آپ اسی طرح موَن جو دارد جاتے رہیں اور اپنی بے چینی کے ساتھ ہی جئیں۔ اس احمق اظفر کو منا لیں۔ زندگی میں لوگ بھلے ہی ایک تسلسل کا حصہ ہیں پھر بھی وہ ایک دوسرے سے خوب الگ اگ ہیں۔ ان سے توقعات رکھنا عبث ہے جو آپ کو خوشی دیتا ہے' ظاہری ہی سہی' وہ حاصل کر لیں' جانے اگلے پڑاؤ پر کیا کچھ ہونا ہے؟''

دیر تک سرمد نے عمران کو سمجھایا اور وہ کہانی سننے پر اس کے باوجود بضد رہا کہ اسے سن کے بھی کچھ حاصل نہ ہونا تھا بلکہ بے رغبتی میں اور اضافہ ہو جاتا تھا لہٰذا سرمد نے کہانی سنا کے نہ دی۔ اگلے دن اظفر سے وہی بے سری تو تکار پھر جاری ہو گئی۔ سے کے منظر بس دم بدم اتر رہے ہیں' کہانیاں الگ الگ ہیں' ایسا لوگ سوچتے ہیں مگر یہ دراصل ایک ہی کہانی ہے۔

.....•.....•.....•

ہلکی ہلکی سردی کی برستی دھوپ میں سرمد نے مکلی میں قدم دھرا تو آج اسے ایسا لگا جیسے یہاں کچھ نا رمختلف انداز سے چھڑے ہوئے ہیں۔ بابا اصحابیؓ کے مزار پر ایک پھریرا ہواؤں میں ایسی مستی سے جھوم رہا تھا جیسے مزار میں کوئی رقص ہے جو آج آراستہ ہے بھلا دنیا کبھی یہ بات سمجھ سکے گی کہ مزار پر خوشیوں کے رقص برپا ہو سکتے ہیں؟ سرمد نے ویرانے میں چھوٹے چھوٹے درختوں کو ہنستے دیکھا اور یوں محسوس کیا جیسے ان سب میں خوشی کے گیت سننے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ سے نے پر پھیلائے اور زمین کی چھاتی پر بچھ گیا۔ سرمد کو اپنے پیروں میں لرزش



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سی محسوس ہوئی اور پھر سرمد نے پہلے کی طرح وقت کو سونگھنا چاہا تو اسے نقرئی ہنسی کی مہک اپنے وجود میں سرائیت کرتی لگی۔ کس قدر گھور سناٹا ہے مگر یوں لگتا ہے جیسے آج یہاں کنال کی سواری اترنے والی ہے' ہر چیز استقبال کو مچل رہی تھی۔

''رجنی' یہ سب کیا ہے؟'' سرمد نے دھیرے سے سوچا۔

''میرا اور تیرا استقبال سے وہی ہے' بس منظر میں کچھ رمز ہے۔ لے میں' تان میں' مٹھاس ہے۔ ہواؤں میں سوز اور آہیں نہیں' گیت ہیں۔ تو نے بھلا کبھی یہ سنا ہے کہ کوئی اپنی شکست پر خوش ہو رہا ہو؟'' رجنی کی آواز میں وہی مدھر تائیں لپک رہی تھیں جو اس روز کنال کی محفل میں گیت گاتے سے اتری تھیں زمین کے دامن میں۔

''تو کیا تم بھی خوش ہو بنا کنال کے؟'' سرمد کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیوں ہے؟ آخر کیا نیا ہوا ہے؟ کیا سب وہی پرانا اور اذیت رساں نہیں ہے؟''

''کنال آ گیا ہے سرمد' مگر.....؟''

''مگر کیا رجنی' جلدی کہو' میری سانسیں اتھل پتھل ہو رہی ہیں اور تم میرا شریر کب چھوڑو گی؟ کہاں ہے کنال' مجھے بھی دکھاؤ۔'' سرمد کی دھڑکنوں کی رفتار تیز ہو گئی۔

''بس کچھ لمحے اور قدم بڑھاؤ' نئی کہانی' نئے منظروں میں بدلنے والی ہے۔ دیکھو' اس عمارت کو جہاں میں کنال سے ملا کرتی تھی' کیسی رنگ و نور میں نہائی ہوئی ہے۔ آج وہاں دولہا آیا ہے۔ باراتیوں کی بڑی غضب کی بھیڑ ہے۔''

سرمد نے جیسے دوڑنے کی رفتار سے قدم بڑھائے۔ بابا اصحابی کو سلام کرتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اُس عمارت کی اور بڑھنے لگا جو جاتے سے بائیں ہاتھ پر استادہ تھی اور دور دور تک سنگلاخ زمین پر ویرانی لوٹ رہی تھی۔ پاس ہی بہتی خشک ندی میں پانی کی روانی جیسے سے کی چھب نرالی۔ کئی پرندوں نے نغمۂ جاں فزا چھیڑا اور سرمد جھٹ سے عمارت کے عین سامنے ٹھوکر کھا کے گرا۔ اسے رجنی کا قہقہہ سنائی دیا۔

''دیکھا' ملن کی جلدی میں ٹھوکر کھالی نا؟ جیون کی گتھی کو سلجھانے میں اتاولا پن ہو ہی جاتا ہے۔ ہائے..... پتھروں سے جھرنے پھوٹ پڑے ہیں سرمد' تجھے کچھ دکھائی دے رہا ہے؟''

''کہاں؟''

''وہ..... وہاں.....؟'' اور سرمد نے ہانپتے کانپتے عمارت کی گنی چنی سیڑھیاں چڑھیں۔ وہ دیوانہ وار عمارت میں گھوما کیا مگر اسے کہیں کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ ہر طرف ویرانی کا اور سناٹے کا راج تھا' وہیں عقبی ڈیوڑھی میں پینٹ اور ٹی شرٹ میں ملبوس ایک نوجوان کوئی گیت گا رہا تھا۔ پگڈنڈیوں میں دھول کی مستیاں جیسے تھمی ہوئی تھیں جھٹ پٹ خاموشی سب کچھ نگل گئی۔

''یہ کنال ہے؟'' سرمد نے رجنی سے پوچھا مگر جواب ندارد۔ سرمد کو بڑے زور اور شدت سے یہ عجیب تبدیلی محسوس ہوئی۔ رجنی کی آتما اس کا وجود چھوڑ چکی تھی اور اب اسے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ اس نے بار بار رجنی کو پکارا' ہر بار خاموشی اس کا جواب تھی۔ آخر کنال اور رجنی اسے کیوں دکھائی نہیں دیئے؟ کیا اس کا گیان بھی رجنی کے ساتھ ہی کافور ہو گیا اور اس ملن استھان پر یہ نوجوان کیوں بیٹھا ہے؟ یہ کون ہے اور یہ گیت.....؟'' سرمد نے



غور سے سنا' یہ تو وہی گیت تھا جو رجنی گایا کرتی تھی۔

''اوہ..... میرے خدا..... ! رجنی..... کنال..... سب کچھ سارے منظر غائب ہو گئے۔''

گیت تھم گیا' نوجوان اپنے بھاری اور خوب ہلہ مچاتے حسن کے ساتھ سرمد کی طرف مڑا۔

''مادھو.....!''

''جی' آپ..... مادھو.....!''

''آپ نے مجھ سے کہا؟'' آواز جیسے عشق نے کلام کیا ہو۔

''وہ..... رجنی..... آپ کون ہیں؟ یہاں بیٹھے اس ویرانے میں گیت گاتے؟'' سرمد کی الجھنوں میں ڈوبی کیفیت دیکھ کر وہ بے نیازی سے ہنس دیا۔

''آپ فضول میرا مذاق مت اڑائیں' سیدھے سبھاؤ اپنا نام بتائیں تاکہ میں آپ کو آپ کے نام سے پکار سکوں۔''

''عین ہوں میں' چھوڑ کے کیوں آئے تھے؟ بس تھوڑا سا لیٹ ہوا تھا میں مگر غصہ تو آپ کو آتا ہی بہت ہے۔''

''یہ کیا بکواس ہے اور جب میں تمہیں جانتا ہی نہیں تو تم کون ہو جو اس طرح کی باتیں کر رہے ہو؟''

''چلو یہاں بیٹھیں' جان بھی لو گے۔''

سرمد اجنبیت سے بیٹھ گیا۔ ''سے بدل رہا ہے' منظر بدل رہا ہے۔''

''تو.....؟''

''تو کیا بار بار آپ یہاں کب سے بیٹھے ہیں؟''

''ہزار سال سے!!!''

دونوں دیر تک لڑتے رہے' عین عشق ہے اور عشق عین ہے۔ کچھ ہی دیر بعد صوفیوں کے قصے شروع ہوئے۔ صوفی ازم کی باتیں' سے کا پھیلاؤ' انسانی اختیار' فلسفہ اور خدا کی موشگافی اور پھر دونوں تاریخ کے میں جنگل میں بھٹکا کیے۔ دونوں نے وقت کو دیر تک گمبھیر اداسی میں ڈسکس کیا اور پھر انسانی تخلیق موضوع بحث بنی اور جب عین نے اپنی بڑی بڑی لامتناہی آنکھوں سے سرمد کی طرف تھوڑی توجہ سے نظر ڈالی تو سرمد کو سے کی چال اور رتھ دونوں تھمے ہوئے سے محسوس ہوئے اور سرمد کو وہ الفاظ جو رجنی نے کہے تھے' بازگشت کی طرح سنائی دینے لگے۔

''اب سے نے تمہیں چنوتی دی ہے۔ کہانی کا اگلا پنا تمہیں لکھنا ہے اور سے کے رتھ کی باگوں کو پکڑ کر اسے کائنات کے مرکز میں روک کر یہ بتانا ہے کہ تم سے سے شکست نہیں کھا سکتے..... بھلے ہی تمہاری آتما کتنی ہی گھائل کیوں نہ ہو؟''

اور پھر عین اور سرمد الجھتے' جھکتے چار قبروں کی اور بڑھ گئے جہاں کی ایک ادھ بنی دیوار پر رجنی نے پہلی بار سرمد سے کلام کیا تھا۔

پگڈنڈیوں کی چھاتی پر سے نے زرہ بکتر کس کے مقابلے کی تیاری کی اور سرمد نے زور سے پاؤں مارا۔ عین نے تقلید کی ہواؤں میں اور سناٹے میں بڑے زوروں کا بیدھ شروع ہو گیا۔

(ختم شد)



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سلسلے وار کہانی ایک نئی دلچسپ قسط وار کہانی، جسے آپ ہر ماہ پڑھنا چاہیں گے

شازلی سعید مغل

# تاشون

حزیں صدیقی کا خیال

عالمِ رنگ و تماشا سے گزر
کوئی قیمت نہیں بینائی کی

حیرت، تجسس، اسرار اور ستاروں سے جڑے، بہت خاص سلسلے کی چودھویں کڑی

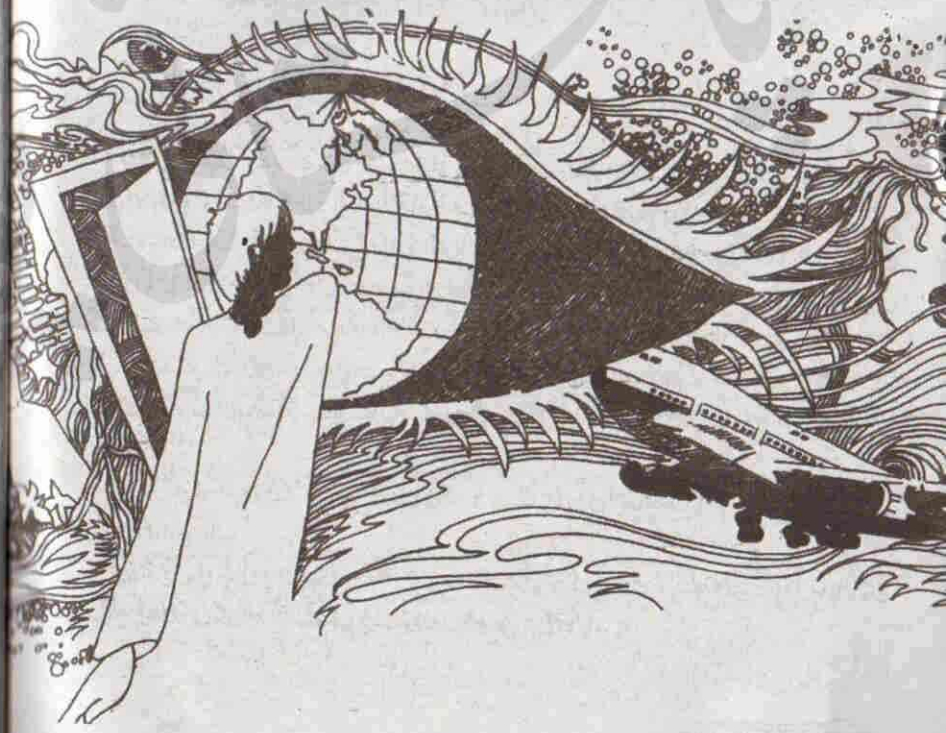

## خلاصہ

''تاشون''.....ایک پاکستانی نژاد مصری ہے۔ اُس کے ماں باپ اُس کی پیدائش پر مصر چلے گئے تھے۔ وہ صرف ایک ماہر ستارہ شناس یا پراسرار علوم کا مالک ہی نہیں ہے بلکہ روحانیت کی منازل طے کرتا روشنی کا ایک استعارہ ہے۔ اُس کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جن کی دُعائیں بارگاہِ ایزدی میں شرفِ قبولیت پاتی ہیں اور زمین پر معجزہ بن کر واپس آتی ہیں۔ ذوالفقار صہبائی عرف زلفی تاشون کا جگری یار ہے جس کی بیوی رانیہ طاغوتی طاقتوں کے نرغے میں پھنس جاتی ہے۔ تاشون اپنے دوست زلفی کے بلانے پر پاکستان کے لیے رختِ سفر باندھ لیتا ہے۔ رانیہ کی کیفیت واقعی خراب ہوتی ہے۔ وہ اکثر راتوں کو محسوس کرتی ہے کہ جیسے اس کی روح اس کے جسم سے نکل کر گھر سے باہر جانے کی کوشش کرتی ہے لیکن جب اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوتی تو واپس رانیہ کے جسم میں آجاتی ہے۔ صورتِ حال نہایت گمبھیر ہوتی جارہی تھی، ایسے حملے جلدی جلدی ہو رہے تھے۔ چنانچہ تاشون اپنے دوست کی مدد کرنے کے لیے پاکستان چلا آتا ہے اور یہاں آکر رانیہ کا پیدائشی زائچہ بناتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رانیہ ساڑھے ستی کے زیرِ اثر ہے اور ستاروں کی کچھ خاص پوزیشنز لے کر پیدا ہوئی ہے۔ اس کی پیدائش کے وقت سورج گرہن تھا جو کہ شیطانی قوتوں کے لیے نہایت سعد وقت ہوتا ہے۔ شیطانی قوتیں ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتی ہیں جن کی پیدائش کے وقت سورج یا چاند گرہن لگا ہو۔ رانیہ کے پیچھے بھی سیل شیا نامی ایک منظم طاغوتی تنظیم کی رکن لگی ہوئی ہے جسے اپنی طاغوتی قوتوں کو بڑھانے اور اپنے مذموم مقاصد کو پورا کرنے کے لیے رانیہ کی روح درکار ہے۔ اس کے مذموم مقاصد میں سب سے اہم مقصد اس کے شیطان صفت شوہر مہانیل کی واپسی سرِفہرست ہے۔ مہانیل وہ عفریت ہے جو کہ ایک صدی سے موت کی نیند سو رہا ہے۔ اپنی اس مذموم مقصد میں کامیابی کے لیے سیل شیا ہر حد سے گزرنا جانتی ہے، چنانچہ اس نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ایک صحرائی دیہاتی چندوا کے مرنے کے بعد اس کے ہم زاد کو اپنے قابو میں کر رکھا ہے جس کے ذریعے وہ فراعنہ مصر کے خزانوں پر بھی قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ سیل شیا نہایت کڑی تپسیا کے بعد ایک مرتبہ رانیہ کی روح کو اس کے جسم سے نکالنے میں کامیاب بھی ہوگئی مگر تاشون نے اللہ تعالیٰ کی مرضی اور رحمت کے طفیل روح کو اس کے جسم میں واپس بلا لیا تھا۔ اس وجہ سے سیل شیا کی طاقتیں اس وقت کمزور پڑ گئی تھیں جب اس کا اتنا کاری وار خالی گیا تھا اور رانیہ کی روح جسم سے نکلنے کے باوجود تاشون کے علم اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے واپس رانیہ کے جسم میں چلی گئی تھی۔ اپنی اس ناکامی پر سیل شیا پاگل ہوا اٹھی تھی، اسے اپنے آقا شیطان کو منانے کے لیے کافی جتن کرنے پڑے، تب کہیں جا کر اسے ایک بار پھر یہ اجازت ملی کہ وہ کچھ عرصے بعد یہ عمل دوبارہ کر سکتی ہے۔ اِدھر تاشون، زلفی کے دوست شہباز سونگی کے گھر آئے مہمان کے جسم سے چار ہزار سال عمر رسیدہ جن کو نکالتا ہے۔ زلفی بہت فخر محسوس کرتا ہے کہ اُس کا دوست اس کی مدد کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کے کام بھی آرہا ہے۔

**(اب آپ آگے پڑھیے۔)**

وہ دھیرے دھیرے لرز رہی تھی۔ اہرام کے ایک تاریک کمرے میں عظیم الشان چوبی تابوت کے کونے پر ٹکی راشانیہ بے بسی و یاس کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ اس کے اردگرد اندھیرا تھا، اتنا اندھیرا کہ وہ اپنے وجود کو بھی نہ ٹٹول سکی۔ بے بسی و یاس کی تصویر کی صورت اس کی غزالی آنکھوں سے آنسو تواتر کے ساتھ بہہ رہے تھے۔ وہ بے آواز رو رہی تھی۔ بہت بے چین، بہت اذیت ناک تھی اس کی روح جبکہ باہر چندوا اور فسانہ اہرام میں گھسنے کے لیے سر توڑ کوششیں کر رہے تھے۔ اپنے شکار کو یوں ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر فسانہ پاگل ہی ہوا اٹھی تھی مگر ہزارہا کوششوں کے باوجود وہ اہرام میں داخل ہونے سے قاصر تھی۔ پتہ نہیں، وہ کون سی نامعلوم طاقتیں تھیں جو اس وقت فسانہ، چندوا کے اور راشانیہ کے درمیان حائل تھیں۔ بہت دیر تک چندوا اور فسانہ یہی کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح اہرام میں داخل ہو سکیں لیکن وہ اپنی ان کوششوں میں ہر بار ناکام ہوئے تھے۔

''واپس چلو یہاں سے، کبھی تو یہ دوبارہ باہر آئے گی؟'' فسانہ نے چندوا سے کہا۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جواباً چندوا' فسانہ کو گھورتے ہوئے بولا تھا۔ ''تجھے کس نے کہا تھا کہ تو یوں اس کے پیچھے لگ جائے؟ بول میرے کام میں تو نے اپنی ٹانگ کیوں اڑائی؟'' چندوا غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ ''کر دیا ناں' بیڑہ غرق میرا؟'' چندوا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فسانہ کو کچا چبا جائے۔

فسانہ اُس وقت حیرت کی تصویر بنی چندوا کو گھورے جا رہی تھی پھر وہ جیسے سانپ کی طرح پھنکار کر بولی تھی۔ ''تم مادام کو تو کچھ نہیں کہہ سکتے' سارا غصہ مجھ پر مت اتارو۔'' ذرا دیر کی خاموشی کے بعد وہ پھر گویا ہوئی۔ ''میں تمہاری مدد کرنا چاہتی تھی تاکہ تم مادام کو لاجوردی آئینے کے ساتھ ساتھ فراعنہ مصر کے خزانے بھی پیش کر سکو اور یہ ہزاروں سال سے بھٹکتی روح اس سلسلے میں ہمارے لیے بہت کارآمد ثابت ہوگی۔'' فسانہ نے چندوا کا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہا تھا۔

''میں نے تجھ سے کب کہا تھا کہ تو میری مدد کر؟ تو اپنی حد میں رہا کر' میرا کام بگاڑ کر رکھ دیا' اب چل یہاں سے۔'' چندوا نے فسانہ کو بری طرح جھڑکا تھا۔ وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئی تھی اور پھر چشم زدن میں دو الگ الگ رنگ کے دھوئیں کے مرغولے زمین سے آسمان کی طرف بلند ہوئے اور فضا میں تحلیل ہو گئے۔

•.....•.....•.....•

سیل شیا ایک بار پھر پانچ کونوں والے ستارے کے پنجوں بیچ بیٹھی کوئی عمل کر رہی تھی' نامانوس سے الفاظ اس کی زبان سے ادا ہو رہے تھے' ستارے کے پانچوں کونوں پر کالی موم بتیوں نے عجیب پراسرار منظر کی تصویر کشی کی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور لب تیزی سے ہل رہے تھے۔

رانیہ والے واقعے کے بعد سیل شیا کی طاقت میں نمایاں کمی واقع ہوئی تھی اور اب وہ ایک مقررہ وقت تک کسی بڑے عمل کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ رانیہ کے سلسلے میں ناکامی کے بعد تو اس کا آقا ابلیس اس سے شدید ناراض ہو گیا تھا۔ اب سیل شیا نے اپنے آقا کو خاصی حد تک منا لیا تھا کیونکہ وہ اپنے مہانیل کو ہر قیمت پر دوبارہ جگانا چاہتی تھی اور اس حوالے سے رانیہ اس کی آخری امید تھی اور آخری شکار وہ اپنے شکار کو یوں اس طرح غیر متوقع طور پر ہاتھوں سے نکلتا دیکھ کر تو صدمے سے بالکل چُور ہی ہو گئی تھی لیکن اب ابلیس کو ایک بار پھر منانے کے بعد سیل شیا کے پاس بس چند مقررہ دن تھے جن میں وہ اپنا عمل دوبارہ شروع کر سکتی تھی لیکن اس سے پہلے سیل شیا کو ہر حال میں اپنی قوتوں کو مجتمع کرنا تھا اور اب کی بار تو وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینا چاہتی تھی۔ چنانچہ جب تک اسے اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس کے مطلوبہ اہداف حاصل نہیں ہو جاتے' اس نے فی الحال بحالتِ مجبوری رانیہ کی طرف سے ذرا سی توجہ ہٹا کر طلسمی آئینہ اور اہرام مصر میں مدفون فراعنہ مصر کے قدیم خزانوں کو کھوجنا شروع کر دیا تھا۔

•.....•.....•.....•

یہ رقبے کے لحاظ سے تقریباً چار سو گز پر بنا ایک پرانا مکان تھا' تقریباً آدھے پلاٹ پر مکان کی تعمیر ہوئی تھی اور آدھا پلاٹ ویسا ہی جنگلی پودوں اور جھاڑیوں سے اٹا ایک چھوٹے جنگل کا نظارہ پیش کرتا تھا۔ تعمیر شدہ مکان میں ایک بڑا ٹی وی لاؤنج' دو بیڈ روم' ڈرائنگ روم بنا ہوا تھا جبکہ چھت پر ایک مزید بیڈ روم تھا۔ یہ مکان ملیر کے علاقے میں واقع تھا اور تعمیر بہت پرانی تھی۔ ظفر اور مظہر دو بھائی تھے جنہیں یہ مکان ترکے میں ملا تھا۔ چار سو گز کے مکان کو انہوں نے راضی خوشی آدھا آدھا یعنی دو دو سو رقبے کے لحاظ سے آپس میں بانٹ لیا تھا۔



دونوں بھائی شادی شدہ تھے۔ بڑے بھائی ظفر کے دو بچے جبکہ چھوٹے مظہر کے تین بچے تھے۔ ظفر کی بڑی بیٹی سترہ سال کی تھی اور بیٹا پندرہ سال کا جبکہ مظہر کے بچے بالترتیب تیرہ سال سے آٹھ سال کی عمروں کے درمیان تھے۔ ظفر اور مظہر کی ایک چھوٹی بہن ماہ پارہ بھی تھی جو کالج میں پڑھاتی تھی۔ مظہر کی فیملی میں اس کے بچوں کے علاوہ اس کی بیوی کی ایک بہن سلمیٰ بھی شامل تھی جو کہ اس کی بیوی نجمہ کی اکلوتی بہن تھی اور والدین کے ایک حادثے میں دنیا چھوڑ جانے کے بعد ان کے ساتھ رہ رہی تھی اور کالج میں بڑے بھائی ظفر کی بیٹی کے ساتھ پڑھتی تھی۔

یہ پرانا مگر کشادہ مکان ان سب کو بہت پسند آیا تھا۔ دونوں بھائیوں کے پاس فی الحال اتنی رقم نہیں تھی کہ اس کو مزید تعمیر کرتے' چنانچہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ دھیرے دھیرے مکان کو تعمیر کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ظفر نے پہل کی اور اوپر کے بیڈ روم کے ساتھ ایک کمرہ اور کچن باتھ روم بنوا کر اوپر شفٹ ہو گئے۔ مظہر کی سالی سلمیٰ' ظفر کی بیٹی نمرہ اور مظہر کی گیارہ سالہ بیٹی نجویٰ اوپر چھت پر بنے نئے کمرے میں شفٹ ہو گئے اور نیچے ظفر کا بڑا بیٹا اور مظہر کے دونوں چھوٹے بیٹے ایک ساتھ کمرہ شیئر کرنے لگے' یوں دونوں بھائیوں کی فیملی مل جل کر اس پرانے مکان میں رہ رہی تھی۔ اب جب بھی کچھ پیسے جمع ہوتے' ظفر یا مظہر مکان میں کچھ نہ کچھ تعمیر و ترمیم کراتے رہتے۔ واش روم اور کچن اپنی مرضی سے بنوائے گئے' ان کے اندر ٹائلز لگوائے گئے' مکان کی بقیہ غیر تعمیر شدہ زمین پر ایک طرف پھول' پودوں' درختوں کی ابتدا کی گئی جبکہ کچھ حصے میں مظہر کی بیوی نجمہ نے کچھ سبزیاں وغیرہ اگانے کا پروگرام بنایا جس کے لیے انہوں نے باقاعدہ ایک مالی کی خدمات حاصل کیں۔ اس مکان میں موجود درختوں میں نیم کا درخت سب سے پرانا تھا۔ اس کے علاوہ شریفے اور امرود کے درخت جا بجا لگے ہوئے تھے لیکن اُن کی بری حالت تھی مگر اب مالی کے آنے کے بعد اس کی محنت رنگ لا رہی تھی۔ اُن لوگوں کو یہاں آئے تقریباً ڈیڑھ سال ہو رہا تھا۔ پودے' پھول اور درخت سب کی بہار اب جوبن پر تھی۔

اُن ہی دنوں مظہر نے سوچا کہ باغیچے کی زمین سے ہٹ کر سامنے کی طرف گھر بنانے کی داغ بیل ڈالنی چاہیے۔ آہستہ آہستہ بقیہ حصے پر خوبصورت کاٹیج نما گھر تیار ہو جائے گا۔ اس نے ظفر سے بات کی تو اس نے بخوشی اجازت دے دی' چنانچہ اسی ہفتے مظہر نے سامنے کے حصے سے جنگلی گھاس پھونس ہٹانے اور زمین ہموار کرنے کے لیے مزدور بلوا لیے۔ سامنے کے حصے میں سب سے الگ تھلگ چھوٹے چھوٹے نیلے رنگ کے پھولوں کا ایک درخت تھا۔ جب پھول جھڑ جاتے تو اس پر گولر جیسا پھل آتا تھا جس کو کوے اپنی چونچ میں دبا کر لے اڑتے۔ دوسرے دیگر پرندے بھی اس گولر نما پھل کو شوق سے کھاتے تھے لیکن کووں کی تو یہ مرغوب غذا تھی۔ جب پھل آتا' دن رات یہاں اُن کا شور ہوتا۔ یہ درخت اچھا خاصا گھنا تھا جس کا سایہ گھر کے اندر سے زیادہ باہر جاتا تھا۔ مظہر نے اس درخت کو بھی کٹوانے کا ارادہ کر لیا حالانکہ اس کے بڑے بھائی نے منع کیا تھا کہ گھنا سایہ دار درخت ہے' اس کو رہنے دیا جائے' وہ درخت بالکل کونے میں ہے اور وہ جگہ تو ویسے بھی چھوڑی جائے گی لیکن مظہر نہ مانا' اس نے مزدوروں کو حکم دیا کہ اس درخت کو کاٹ دیا جائے۔ اُس کے حکم پر مزدوروں نے درخت پر کلہاڑی چلا دی لیکن اس درخت پر کلہاڑی چلاتے ہی ظفر اور مظہر دونوں کی زندگیوں میں بھونچال آ گیا تھا۔

مزدوروں کے کام کا وقت ختم ہو رہا تھا اور شام بھی اتر آئی تھی' چنانچہ اُس دن وہ ادھورا کٹا درخت چھوڑ کر



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چلے گئے تھے۔ وہ رات کیا تھی' ایسا لگتا تھا' پورے گھر میں بھگدڑ سی مچی ہوئی ہو حالانکہ بظاہر سارے بچے سونے کے لیے لیٹ گئے تھے' ویسے سوائے مظہر اور اس کی بیوی کے اور کسی کو کچھ محسوس بھی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ باری باری پورے گھر میں گھومتے اور دیواروں سے کان لگاتے' سوچتے کہ کہیں یہ آوازیں برابر والے گھر سے تو نہیں آ رہی ہیں؟ لیکن یہ آوازیں تو اُن کے اپنے ہی گھر سے آ رہی تھیں' یوں لگ رہا تھا کہ عجلت کے انداز میں کوئی سامان کی اٹھا پٹخ کر رہا ہو۔ پوری رات میاں بیوی گھر میں اوپر نیچے پھرتے رہے لیکن گھر کے دیگر مکین سوتے رہے اور پھر صبح جب انہوں نے یہ بات اپنے گھر والوں کو بتائی تو اُن کے اپنے بچوں نے اُن کا مذاق اڑایا' وہ دونوں کھسیا کر چپ ہو گئے۔

صبح اپنے وقت پر مزدوروں کی آمد ہوئی تھی لیکن دو مزدور نہیں آئے تھے' یہ وہی دونوں تھے جنہوں نے اُس درخت کو کاٹنے کا ذمہ اپنے سر لیا تھا۔ ابھی مظہر اُن دونوں مزدوروں کے بارے میں معلوم کر ہی رہا تھا کہ گھر کے اندر سے آنے والی چیخوں نے اُسے حواس باختہ کر دیا' وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ گھر کے اندر لپکا اور گھر کے اندر کا منظر دیکھ کر وہ دہشت زدہ ہو گیا تھا۔

اُس وقت گھر میں موجود سارے لوگ ٹی وی لاؤنج میں جمع تھے۔ مظہر کی بیوی نجمہ کے بالوں کو کسی نادیدہ طاقت نے پیچھے سے پکڑ رکھا تھا اور وہ دیوانہ وار چیخ رہی تھی۔ نجمہ کے بال ویسے بھی گھنے اور لمبے تھے' اُس کو یوں فضا میں معلق دیکھ کر ہر کوئی دہشت کا شکار ہو گیا تھا اور پھر یکا یک نجمہ نے جھٹکا کھایا تھا اور دھڑام سے زمین پہ گر کے بے ہوش ہو گئی تھی' ایسا لگ رہا تھا' بال پکڑنے والے نے جھٹکا دے کر نجمہ کو زمین پر گرایا ہو' چیخوں کی آواز پر وہاں کام کرنے والے مزدور بھی گھر میں آ گئے تھے اور یہ تماشہ دیکھ کر اُن کے چہرے خوف سے سُتے ہوئے تھے۔

نجمہ کے گرتے ہی مظہر نے اس کو سنبھال لیا تھا۔ نجمہ کی جیٹھانی رقیہ دوڑ کر پانی کا گلاس لے آئی تھی۔ بے ہوش نجمہ کو ہوش میں لایا گیا تھا۔ وہ پہلے تو حیران حیران نظروں سے اپنے میاں اور جیٹھانی کو دیکھتی رہی تھی پھر زور زور سے رونے لگتی تھی۔ ابھی وہ لوگ نجمہ کی حالت کو سمجھ ہی رہے تھے کہ نجمہ کی بہن سلمٰی نے اچانک اپنے پیروں سے چپل اتار کر اپنے منہ میں دبالی تھی اور پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی تھی پھر اُس نے چپل منہ میں دبائے دبائے گھٹنوں کے بل چلنا شروع کر دیا تھا اور اپنی بہن نجمہ کے پاس آ کر تڑاتڑ اس پر چپل مارنا شروع کر دی تھی اور اُس کے منہ سے بے ربط جملے ادا ہو رہے تھے۔ ''اے..... چل ری اٹھ..... ناشتہ دے مجھ کو.....''

اس غیر متوقع بلکہ وحشت زدہ صورتِ حال سے گھبرا کر مزدوروں نے تو آؤ دیکھا نہ تاؤ' باہر کی جانب دوڑ لگا دی تھی اور پھر اچانک ہی مظہر کے سب سے چھوٹے بیٹے وکی پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے سارے کپڑے پھاڑ ڈالے تھے اور بری طرح سے کبھی رونے اور کبھی ہنسنے لگا تھا..... آٹھ سال کے بچے کی یہ حالت دیکھ کر تو سارے گھر کی ہمت ٹوٹ گئی تھی۔ بہر حال اُسے زبردستی جیسے تیسے کپڑے پہنائے گئے تھے تو ایک دم ہی اُس کی دورے جیسی کیفیت ختم ہو گئی تھی۔

''اِس گھر میں کچھ ہے؟'' رقیہ نے اپنے میاں کو ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا تھا۔

''پاگل مت بنو.....'' ظفر نے آہستہ سے کہا تھا۔ ''اگر یہاں کچھ ہوتا تو کیا اب تک سامنے نہیں آ چکا ہوتا؟ ہمیں یہاں آئے سال سے اوپر ہو چکا ہے' ایسی بات اس سے پہلے کبھی محسوس ہوئی؟''



''نہیں' آج سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا لیکن آج کیا ہوا؟'' رقیہ نے شوہر کے چہرے پر جیسے نظریں گاڑتے ہوئے کہا تھا۔ ''آج کے واقعات واقعی قابلِ توجہ ہیں۔ میں ابھی جا کر مسجد کے پیش امام صاحب سے بات کرتا ہوں۔''

•.....•.....•.....•

مسجد کے پیش امام عبدالقدوس بہت پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ انہیں تمام روداد سنائی جا چکی تھی۔ امام صاحب نے فوراً ہی پانی سے بھرا جگ منگا کر اُس پانی پر دَم کیا تھا اور پھر اٹھ کر اُس نیلے پھولوں والے درخت کے پاس گئے تھے جسے گزشتہ روز آدھے سے زیادہ کاٹ دیا گیا تھا۔ انہوں نے وہ دَم کیا ہوا پانی اُس درخت کی جڑ میں ڈالا تھا۔ اُس میں سے ایسی سَن سَن کرتی آوازیں نکلی تھیں جیسے کہ گرم توے پر کسی نے پانی ڈال دیا ہو' فوراً ہی دھواں اٹھنا شروع ہو گیا تھا اور جہاں پانی ڈالا گیا تھا' وہ جگہ جل کر اس طرح کالی ہو گئی تھی جیسے کسی طاقتور تیزاب سے جل جانے کے بعد ہو جاتی ہے۔ یہ عمل کرنے کے بعد امام صاحب نے ہدایات دی تھیں کہ اِس پیڑ کو جیسا ہے' ویسا ہی رہنے دیا جائے' مزید نہ کٹوایا جائے۔''

اس کے بعد وہ گھر کے اندر آ گئے تھے۔ امام صاحب کے آتے ہی ایک زوردار کھٹکے کی آواز کے ساتھ نجمہ کے بیڈروم کا دروازہ کھلا تھا اور اندر سے اچانک ہی سلمٰی نے نمودار ہو کر امام عبدالقدوس صاحب کو گردن سے پکڑ کر اتنا اونچا اٹھا لیا تھا کہ اُن کا سر چھت سے لگ گیا تھا اور پھر ایک جھٹکا دے کر بیڈروم میں کھڑے کھڑے ہی امام صاحب کو ٹی وی لاؤنج میں موجود صوفے پر لا پٹخا تھا۔

عبدالقدوس صاحب ایک منحنی' دھان پان سے شخص تھے جو 65 سال کی عمر کو بھی کراس کر رہے تھے۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر سب نے ہی سوچ لیا تھا کہ..... امام صاحب اپنی جان سے گئے..... لیکن حیرت انگیز طور پر وہ بالکل ٹھیک تھے' بس کچھ دیر کے لیے وہ ایک طرف کو ڈھے گئے تھے اور پھر جیسے ہی اُن کے اوسان بحال ہوئے تھے تو انہوں نے مظہر سے کہا کہ..... وہ اُن کو گھر چھوڑ آئے۔ یہ مسئلہ حل کرنا اُن کے بس کا روگ نہیں ہے۔ مظہر بہت شرمندہ تھا جبکہ ظفر نے امام صاحب کو سہارا دے کر کھڑا کیا تھا۔

''ہم اَب بہت بوڑھے ہو چکے ہیں ورنہ یہ کام اتنا بڑا نہیں تھا۔ ہاں' بس آپ کو اتنا ضرور بتا دیتے ہیں کہ یہ جو درخت ہے.....'' امام صاحب نے نیلے پھولوں والے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''اُس پر اُن لوگوں کا ٹھکانہ تھا اور یہ ایک دو نہیں' بارہ ہزار بھائی بہن ہیں۔''

''امام صاحب.....! اب آپ ہی ہماری کچھ مدد کریں مہربانی کر کے۔'' نجمہ نے اُن کے آگے ہاتھ جوڑ لیے تھے۔

''میری بہن.....! میں بہت مجبور ہوں۔'' امام صاحب تو یہ کہہ کر چلے گئے تھے اور پھر پوری رات اُس پرانے مکان میں وہ دھما چوکڑی مچی تھی کہ تمام گھر والوں نے پوری رات اللہ کا نام لیتے گزاری تھی۔

•.....•.....•.....•

اُس وقت شفق کی ہلکی سی سرخی غائب ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی' اَب اندھیرا پوری طرح چھا چکا تھا۔ سیل شیا کا گھر ایک خاموش جنگل کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس کے لان میں لگے لمبے لمبے درخت جیسے دم سادھے کھڑے تھے۔ جس اچانک بہت بڑھ گیا تھا۔ سیل شیا کے اس بھوت بنگلے کے گیٹ پر نامعلوم پراسرار سرسراہٹیں جاری



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھیں' وہاں ایک موٹر بائیک آ کر رکی تھی جس پر چھبیس' ستائیس سال کا ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا جبکہ اس کے پیچھے راحت چچا موجود تھے۔ وہ بائیک سے نیچے اترے تھے تو گیٹ پر موجود چوکیدار نے انہیں پہچان کر دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ لڑکا حیران حیران اُن کے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ دونوں لان کراس کر کے گھر کے اندر داخل ہو گئے تھے۔

راحت چچا اُس لڑکے کے ساتھ سیل شیا کے مخصوص ملاقاتی کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد سیل شیا کی ایک خاص خادمہ آئی تھی اور اُس نے راحت چچا کو سرگوشیانہ انداز میں کچھ کہتے ہوئے اوپر کی جانب اشارہ کیا تھا۔ راحت چچا فوراً کھڑے ہو گئے تھے اور نوجوان کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تھا۔ ذرا دیر میں ہی وہ دونوں سیل شیا کے کمرے کے باہر کھڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازے پر دستک دیتے' اچانک دروازہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا تھا..... اور خوشبو کا ایک جھونکا' تیز خوشبو کا جھونکا' بیک وقت اُس نوجوان اور راحت چچا کو چھو کر گزرا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی راحت چچا اُسی نوجوان کو لے کر سیل شیا کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ سیل شیا نے اشارے سے دونوں کو بیٹھنے کے لیے کہا تھا۔ اُس نوجوان کے بیٹھتے ہی کمرے میں موجود پراسرار سرسراہٹوں میں بے چینی نمایاں ہو گئی تھی۔

''مادام' یہ ہے وہ لڑکا جس کی بہن کے گھر.....'' راحت چچا اس سے پہلے آگے کچھ کہتے' سیل شیا نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا تھا۔

''تم رقیہ کے بھائی ہو؟'' سیل شیا نے سوال کیا تھا۔

لڑکا حیران ہوا تھا مگر دوسرے ہی لمحے سنبھل کے بولا تھا۔ ''جی..... جی ہاں..... آپ کو راحت چچا نے.....''

''بس مجھے معلوم ہے' تم باتوں میں اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کرو۔ اَب مسئلہ یہ ہے کہ تمہاری بہن کے دیور نے جو درخت کاٹا تھا' اس پر جو مکین بستے تھے' انہوں نے بھی میرے پاس تم لوگوں کے خلاف شکایت درج کرائی ہے۔'' سیل شیا خباثت سے ہنسی تھی۔ ''تمہیں معلوم ہے' تم لوگوں کے عیش و عشرت کی وجہ سے بارہ ہزار بچے بے گھر ہوئے ہیں؟'' سیل شیا قدرے غصے کا شکار ہونے لگی تھی۔

''مادام..... غلطی ہو گئی..... میری بہن اور اس کے گھر والے اُس گھر میں ایک سال سے رہتے آ رہے تھے' انہیں نہیں معلوم تھا کہ یہاں کسی اور کا بھی بسیرا ہے اور.....''

''پھر تو تم لوگ اور بھی قابل تعزیر ہو۔'' سیل شیا' لڑکے کی بات کاٹ کر بولی تھی۔ ''انہوں نے کبھی تمہاری بہن کو نہیں ستایا پھر ان کا ٹھکانہ کیوں اجاڑا گیا اور اب کہتے ہو' وہ احتجاج بھی نہ کریں؟'' سیل شیا جن کی حمایت کر رہی تھی' وہ فسانہ اور نیرت کے بہن بھائی تھے۔

رقیہ کے بھائی کامران کی راحت چچا سے ملاقات اُس کے ایک دوست نے یہ کہہ کر کرائی تھی کہ..... وہ ایسے معاملات میں بہت ماہر ہیں' سو اب وہ راحت چچا کے ساتھ سیل شیا کے سامنے تھا۔

''مادام..... آپ جو کہیں گی' ہم وہ کریں گے۔ آپ..... آپ..... پلیز' میری بہن اور اُن کے دیور کے بچوں پر رحم کیجیے۔ پلیز' ہمیں اس مشکل سے نکالیے۔''

''ٹھیک ہے تو پھر ایک شرط ہے جو پوری ہونے پر تمہیں اس مشکل سے نجات مل سکتی ہے۔''

''جی..... جی..... کہیے مادام..... ہم وہ شرط پوری کریں گے۔'' کامران نے نہایت عاجزی لہجے میں کہا تھا۔



''سن لو پہلے۔'' سیل شیا نے ہاتھ اٹھا کر کامران کو روکتے ہوئے کہا تھا۔ ''شرط یہ ہے کہ تمہاری بہن کے خاندان کو وہ گھر چھوڑنا ہو گا۔ وہ بچے اب کسی قیمت پر اُن کو وہاں نہیں دیکھنا چاہتے۔ بس اب تم جاؤ اور جا کر اپنی بہن اور اُس کے گھر والوں سے بات کر لو۔ تمہارے پاس کل تک کا ٹائم ہے اور ہاں' چونکہ تم میرے پاس مدد کے لیے آئے ہو اس لیے میں تمہیں خالی ہاتھ لوٹانا نہیں چاہتی۔ اگر مکان بیچنے میں کسی پریشانی کا احتمال ہے تو اس کا انتظام میں کیے دیتی ہوں۔ اس مشکل سے نکلنا چاہتے ہو تو بولو' میرے بتائے ہوئے وقت پر ایک آدمی تمہارے مطلوبہ پیسے لے کر آئے گا۔ تم وہ پیسے لے کر مکان اس کے حوالے کر دینا ورنہ دوسری صورت میں.....'' سیل شیا نے ایک معنی خیز ہنسی کے ساتھ یہ کہہ کر نشست برخاست کر دی تھی۔

•.....•.....•

اگلے تین دن بعد ایک سیاہ رات کی تمام تر سیاہی اپنے وجود میں سمیٹے سیاہ لبادے میں ملبوس سیل شیا اپنا دربار لگائے بیٹھی تھی اور اُس وقت سیل شیا کے دربار میں چندوا' فسانہ' نیرت کی پیشی تھی۔ وہ ان تینوں پر بری طرح برس رہی تھی۔

''بیڑہ غرق کر دیا تم لوگوں نے میرا..... صرف اپنی ایک چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے کن کاموں میں الجھنا پڑا ہے مجھے؟ ورنہ تم لوگ اس وقت یوں میرے سر پر نہیں منڈلا رہے ہوتے۔ کس نے کہا تھا اس ہزار سال سے بھٹکتی روح کا یوں پیچھا کرو کہ وہ خود کو مقید کر لے' کس نے کہا تھا؟''

سیل شیا دھاڑ رہی تھی' چندوا سر جھکائے بیٹھا تھا اور فسانہ تصویرِ غم بنی ہوئی تھی۔

''جو چڑیل تو نے مجھ پر مسلط کی ہے' یہ سب اس نے کیا ہے۔'' چندوا نے فسانہ کو گھورتے ہوئے کہا تھا۔

''مادام..... وہ طلسمی آئینہ اور اس اہرام کے اندر فراعنہ مصر کے خزانے ہیں۔'' فسانہ نے اپنی پوزیشن کلیئر کرنا چاہی تھی۔

''خاموش..... بس بہت ہوا' میں اس وقت اپنے اصل مقصد سے دور رہنے پر مجبور ہوں' منتظر ہوں صحیح وقت کی لیکن تم لوگ یوں میرا وقت برباد نہیں کر سکتے۔ اب جہاں ملے' جیسے بھی ملے' جب تک اس فراعنہ مصر کی شہزادی کی بھٹکتی روح قبضے میں نہیں ہو گی' نہ طلسمی آئینہ ملے گا اور نہ ہی مصر کے خزانے۔'' سیل شیا نے چندوا اور فسانہ کو نئے سرے سے ہدایات دینی شروع کر دی تھیں۔

''اب اس اہرام میں گھسنے کی کوشش بھی نہ کرنا' سنا تم لوگوں نے؟'' سیل شیا نے چندوا اور فسانہ کو سخت تنبیہہ کی تھی۔ ''تم لوگ اہرام اور اس روح کی حقیقت نہیں جانتے ورنہ یوں پاگلوں کی طرح میرا بیڑہ غرق کرنے پر نہیں تل جاتے' تم ہر وقت یہ یاد رکھنا کہ وہ آئینہ اور مصر کے خزانے تمہاری رہائی کے پروانے ہیں۔'' سیل شیا نے چندوا کے ہم زاد کو ایک بار پھر اس کے قید ہونے کا احساس دلایا تھا اور چندوا تلملا اٹھا تھا۔

''اب جاؤ' دونوں میری نظروں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ.....'' اور پھر اس سیاہ رات کی سیاہی میں سیل شیا کے گرد سے کثیف دھوئیں کے دو مرغولے نکلے تھے جس کا رخ اب اہرام مصر کی جانب تھا۔

•.....•.....•

مصر میں فراعنہ مصر کے زمانے میں بنے مخروطی اور چوکور مینار اہرام مصر کہلاتے ہیں۔ ان پر لگے کتبے ایسے حروف پر مشتمل ہیں جن کو موجودہ زمانے میں ہر شخص نہیں پڑھ سکتا۔ مصر کے قدیم باشندے اُن کو اسرار الٰہی سمجھ کر



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مقدس جانتے تھے۔ اگرچہ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ اہلِ عرب ان میناروں کو بہ لحاظ ان کے پیرانہ سالی اور پرانا ہونے کے ''اہرام'' کہتے ہیں جو ''ہرم'' سے مشتق ہے جس کے معنی (بڑھاپے) کے ہیں مگر ''محیط المحیط'' (جو عربی زبان کی ایک مستند کتاب ہے۔)' میں لکھا ہے کہ ''اہرام' ہرم کی جمع ہے جو اصطلاح اہلِ مساحت و ہندسہ میں کسی ایسی مخروطی شکل کی عمارت کو کہتے ہیں جس کا قاعدہ مربع یا مثلث یا کثیر الاضلاع ہو۔ اُن میں تین مینار بہت مشہور ہیں جن میں ایک چھوٹا اور دو بڑے ہیں۔ دونوں بڑے میناروں کو عرب برضیغۂ تشنیہ اور ''اکہرمان'' کہتے ہیں۔ Cheops (چی آپس) Chphernius (کیفرنیس) کے نام پر مشہور ہیں اور دنیا کے عظیم الشان عجائبات میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ ایک چوکھونٹے چبوترے پر بنے ہوئے ہیں جس کا ہر ایک ضلع سات سو تریسٹھ فٹ لمبا اور چار سو فٹ آٹھ انچ اونچا ہے۔ اس کے اوپر کچھ گھٹا کر ایک اور چھوٹا چبوترہ ہے۔ اسی طرح دو سو تین چبوترے اسی طرح بنے ہوئے ہیں۔ یہ مینار ساڑھے سولہ بیگھہ زمین پر بنے ہیں۔ مشہور ایرانی مؤرخ ہیروڈولیس جو سنہ عیسوی سے چار سو برس پیشتر مصر کی سیر کو آیا تھا' لکھتا ہے۔ ''یہ مینار چی آپس بادشاہ یعنی اس وقت کے فرعونِ مصر کے عہد میں تقریباً 20 سال تک تعمیر ہوا تھا' اس پر ایک لاکھ آدمیوں کی مدد ہمیشہ لگی رہتی تھی اور اسی مینار پر مصری حروف میں لکھا ہے کہ مزدوروں' کاری گروں پر صرف' لہسن' پیاز کی چٹنی میں اُس وقت کے لحاظ سے روزانہ ڈھائی لاکھ روپیہ خرچہ آتا تھا۔

یہ مینار اہرام دراصل مصری بادشاہوں کے مقبرے ہیں۔ قدیم مصریوں کا اعتقاد تھا کہ ان کے دنیاوی اچھے برے اعمال کے مطابق ان کی روحوں کو بھی جزا و سزا دی جائے گی۔ ان کا خیال تھا کہ ''ارواحِ لطیفہ'' Osiris (اوسیریس) کی ہمدم ہو جاتی ہیں اور ارواح خبیثہ حیوانی قلوب میں آوارہ گشت ہو جاتی ہیں۔ جتنی زیادہ گناہ گار روح ہوگی' اسی قدر ذلیل جانور جیسے سور' گدھ وغیرہ کے اجسام میں ان کو قیام ملے گا۔ (ہندوؤں میں اب تک یہی عقیدہ رائج ہے۔) ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ہزار سال کی پاداش کے بعد روح کو پھر ایک بار جسمِ انسانی عنایت ہوتا ہے اور روحیں پھر سے انسانی قالب میں ڈھل آتی ہیں۔ مصری اپنی لاشوں کو محض اسی اعتقاد کی بنیاد پر مصالحہ اور مختلف ادویات لگا کر پورے زیورات اور ہر فرعون کے اپنے خزانے' قیمتی ظروف اور اشیاء کے ساتھ ان مقبروں میں رکھ دیتے تھے اور ایسی ہی لاشوں کو جن پر قدیم مصریوں نے عملِ جراحی کیا ہوا اور وہ اپنی اصلی صورت پر قائم ہوں' ممی کہتے ہیں۔

ہزار ہا سال گزرنے کے باوجود فراعنہ مصر میں سے ریمز دوم اور شحائی اول اس وقت قاہرہ کے عجائب خانے میں ممی کیے موجود ہیں' باوجود کہ زمانے گزر گئے' ان لاشوں کے چہرے مسخ نہیں ہوئے اور بالکل اصلی حالت میں ہیں اور یہ ممی اب تک ان ہی خوشبوؤں میں بسی ہوئی ہیں جو تین ہزار سال پہلے ان پر لگائی گئی تھیں۔ مصریوں کا ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ جسم سے نکلی ہوئی روحیں کبھی کبھی اُس قبر میں بھی آتی ہیں جس میں ان کا مردہ جسم مدفون ہو۔ ان روحوں کو خوش کرنے کے لیے قدیم مصری بڑی جانفشانی سے مقبرے تعمیر کرتے تھے۔ دریائے نیل کے مغرب میں قدیم تصویر کے قریب بے شمار مقبرے اب بھی پائے جاتے ہیں جو پہاڑوں کی چٹانوں میں تہہ خانوں کی صورت کاٹ کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ ان مقبروں کی دیواروں پر عام طور پر یہ لوگ دلکش تصاویر اور نہایت عمدہ نقش و نگار بناتے تھے اور انتہائی درجے کی فنکارانہ صلاحیت کا استعمال کرتے ہوئے ان ہی نقش و نگار کے درمیان مدفون لاش کے پورے حالاتِ زندگی بیان کر ڈالے تھے۔ اہرامِ مصر کے ہر مینار میں فراعنہ مصر کے نیک



وبد بادشاہوں کی لاشیں ممی کی صورت موجود ہیں۔

خلیفہ مامون عباسی ۲۰۷ھ میں مصر آیا تو اس کو چی آپس مینار کو دیکھنے کا شوق چرایا۔ چنانچہ اس نے فولادی ٹانکیاں بنوا کر پتھر کو کھدواڈالا تو اس کو اندر ایک راستہ ملا۔ اس میں داخل ہونے کے بعد ایک چوکور بادولی ملی جس کے چاروں طرف کی دیواروں میں کمرے کے دروازے تھے اور ایک کمرے میں بہت سی لاشیں خوشبوؤں میں بسی ہوئی رکھی تھیں اور ہر لاش پر اس کے عہدے اور حیثیت کے لحاظ سے سونے اور جواہر کے زیورات اور اس کے خزانے رکھے ہوئے تھے۔

ہزار ہا سال گزر گئے' اہرامِ مصر کی پراسراریت پر سے پردے ہٹتے چلے گئے لیکن اب بھی کچھ اسرار باقی ہیں۔ اہرام میں لاشوں کا سلامت ہونا حتیٰ کہ ہزار ہا سالوں پہلے بسائی خوشبوؤں کا موجود رہنا' اہرام میں چیزوں کا نا تو گلنا سڑنا' ان کی ہیئت تبدیل ہونا اور اب جدید سائنسی تحقیق کی بنیاد پر بہت کچھ ثابت کیا جا رہا ہے لیکن اسرار اپنی جگہ' جب محققوں نے اُس بڑے مینار یا اہرام کی پیائش کی تو دریافت ہوا کہ اس مینار یا اہرام کے چاروں کونے بنانے والوں نے اس کو دنیا کی چاروں سمتوں کے بالکل ٹھیک مقابل بنایا ہے جس سے وہاں کا نصف النہار نہایت صحیح معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا اہرام یا مینار جو کیفرنیس کہلاتا ہے' اس کے نیچے کے چبوترے کا ہر ضلع 684 فٹ لمبا اور بلندی چوٹی تک 456 فٹ ہے۔ اس مینار پر چڑھ کر دیکھو تو جنوب کی طرف دریائے نیل' شمال کی طرف پہاڑ اور مغرب کی طرف جنگل' مشرق کی سمت مقام جزہ اور فسطاط کے بروج اور شہر قاہرہ کے مینار' سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کا قلعہ سب عجیب منظر پیش کرتے ہیں۔ چی آپس دو ہزار تین سو سال قبل مسیح مصر کے چوتھے خاندان کا بادشاہ ہوا تھا جو نہایت سفاک اور ظالم تھا۔ وہ مصر پر 50 برس تک حکمراں رہا۔ کیفرنیس' چی آپس کا بیٹا تھا اور ایسا ہی ظالم و جابر حکمراں تھا۔ اہرام مصر دنیا کے عجائب میں سے ایک عجوبہ ہے' حساب کتاب اور سائنسی تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے اور رُوحانیت بھی اس کی قائل ہو چکی ہے کہ اگر پورے ٹھیک ٹھیک حساب کتاب کے ساتھ آپ اپنے گھر میں لکڑی یا موٹے گتے کا ماڈل اہرام بھی بنائیں اور اس کو کسی نیبل یا زمین کے سینٹر میں رکھیں تو تجربہ کر کے ثابت کر سکتے ہیں کہ اس اہرام میں رکھی گئی چیزیں چاہے کھانے پینے کی اشیاء ہوں یا میڈیسنز' اُن کی افادیت حیرت انگیز طور پر بڑھ جاتی ہے۔ پھل یا کوئی پھول اہرام میں اور اہرام سے باہر بیک وقت کاٹ کر رکھیں' آپ دیکھیں گے کہ اہرام میں رکھا گیا کٹا ہوا پھل یا توڑا ہوا پھول باہر رکھے پھول یا پھل سے کئی گنا تازہ ہے۔ اہرام میں رکھی گئی ادویات جب مریضوں کو استعمال کرائی گئیں تو وہ ان ادویات سے زیادہ اثر پذیر نکلیں جو کہ اہرام سے باہر رکھی گئی تھیں۔ اسی طرح ایک کمرے جتنے اہرام میں لی گئی چار گھنٹے کی نیند اہرام سے باہر لی گئی آٹھ گھنٹوں کی نیند کے برابر ہوتی ہے۔ اہرام قدرت کے اسراروں میں سے ایک اسرار ہے' ایک حساب کتاب کے ماہر نہایت ذہین قوم کی تعمیر کا اعلیٰ ترین نمونہ۔ آج یورپ سمیت ہر ملک میں رُوحانیت کی بیداری اور سکون مراقبہ اور صحت برقرار رکھنے کے لیے ہر جدید سائنسی اور رُوحانی سلسلے میں اہرام میں بٹھا کر مشقیں کرائی جاتی ہیں۔

حیرت' اسرار' تجسس اور علم و آگہی
سے آباد اس سلسلے کی دلچسپ کڑی
آئندہ ماہ ملاحظہ کریں۔



Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# خواب

آپ نے کبھی سوچا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا خواب کیوں دیکھا تھا جو بعد ازاں سارے اسلامیانِ ہند کا مطالبہ بن گیا؟

آپ نے کبھی سوچا ہے کہ اسلامیانِ ہند نے قیام پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا؟ شاید ہماری نوجوان نسل کی اکثریت یہ نہ جانتی ہو سو یہ چند وجوہ انہی کے لیے تحریر کی جارہی ہیں۔

غیر منقسم ہندوستان میں مسلمان زبان' لباس' تہذیب اور عقائد کے اعتبار سے بھارت کی اکثریت والی آبادی ہندوؤں سے قطعاً مختلف تھے۔ ہندو ہر لحاظ سے اُن پر غالب آنا چاہتے تھے۔ اِس صورت حال میں مسلمان دنیا کے رہتے' نہ دین کے۔ یہ صرف اور صرف دین کا تعلق تھا جس کی بنیاد پر انہوں نے الگ قوم ہونے کا دعویٰ کیا اور انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کو بھی یہ دعویٰ تسلیم کرنا پڑا کیونکہ اِس دعوے کی بنیاد سچائی پر ہے۔ بالآخر اِس دعوے کی بنیاد پر کیا جانے والا مطالبہ جائز ٹھہرا اور برصغیر کے مسلمانوں کو اپنا الگ وطن مل گیا جس میں وہ اپنے دین کے مطابق اپنا اجتماعی نظام چلا سکیں۔

قیام پاکستان عمل میں آیا تو ہر فرد کا یہ خیال تھا کہ اِس سرزمین میں اسلامی قوانین رائج کیے جائیں گے۔ یہاں عدل وانصاف کا دور دورہ ہوگا۔ کوئی کسی کے حقوق غصب نہیں کر سکے گا۔ یہاں صحیح معنوں میں بھائی چارہ اور اخوت ہوگی۔ سب کو برابر تصور کیا جائے گا اور کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جائے گی۔ یہاں ایک ایسا معاشرہ قائم ہوگا جس میں کوئی لوٹ کھسوٹ ہوگی' نہ استحصال۔ سب کی جان ومال اور عزت وآبرو محفوظ رہے گی۔ اَرباب اختیار دیانت دار ہوں گے اور پولیس تحفظ کی ضامن۔ ظلم وستم تو دور کی بات ہے' کوئی کسی کی طرف میلی آنکھ سے بھی نہیں دیکھے گا۔ ظلم کرنے والوں کے ہاتھ قلم کر دیئے جائیں گے اور مظلوموں کی دادرسی کی جائے گی۔ مختصر یہ کہ ہر طرف امن وسکون ہوگا اور یہاں رہنے والے اپنے دین ومذہب کے مطابق زندگی بسر کریں گے۔ یہ محض ایک خواب تھا جو چکنا چور ہوگیا۔ سڑکوں' گلیوں' مسجدوں اور امام بارگاہوں میں نامعلوم' بے رحم قاتلوں کی گولیوں سے دم توڑتے ہوئے ہزاروں لوگوں سے جو آواز آرہی ہے' وہ آپ بھی سن رہے ہیں نا.....؟

پاکستان کا مطلب کیا؟

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

کیا یہی ہمارے خواب کی تعبیر ہے؟

**سہام مرزا (مرحوم) نے نومبر 1996ء میں "دوشیزہ" اور "سچی کہانیاں" میں مذکورہ بالا سوال اٹھایا تھا۔ ذرا غور کریں' کیا یہ سوال ہنوز تشنہ نہیں؟**



Courtesy www.pdfbooksfree.pk